منٹو کتھا



ایک زندہ کتاب

سعادت حسن منٹو ــــ حیات اور کارنامے

ڈاکٹر برج پریمی کا معرکتہ الآرا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ

چند تاثرات

- "ڈاکٹر برج پریمی نے اردو زبان و ادب کی تدریس اور تنقید کے سلسلے میں جو نمایاں کام انجام دیئے ہیں۔ اُن کی اہمیت مسلم ہے۔ منٹو پر ان کی کتاب ایک بڑے فنکار کو سمجھنے اور پرکھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔"

پروفیسر آل احمد سرور

- "آپ کی کتاب مبارکباد کی مستحق ہے۔ اتنی محنت کم لوگ کرتے ہیں ..... آپ نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے ..... یہ کتاب قند مکرر ہے۔ تعصب سے بلند و بالا جس میں فن کار کی تکریم اور فن کے کمال دونوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے"۔

ابو سعید قریشی (کراچی)

- منٹو کے بارے میں درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر مفصل اور مبسوط کتاب کوئی نہیں ہے۔ اس لئے ہم ڈاکٹر برج پریمی کے مشکور ہیں کہ انھوں نے اپنی تحقیقی مقالے میں منٹو پر ایک مکمل اور مبسوط کتاب لکھ دی ہے۔ خواجہ احمد عباس (مرحوم) بمبئی

- آپ کی کتاب "سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے" بہت خوب ہے ..... آپ کی متانت میں درد مندی اس طرح آمیز ہے کہ منٹو کی شخصیت خوب اُبھر کر سامنے آئی ہے ــــ انداز بیان ایسا سلجھا ہوا ہے کہ یہ تحقیق منٹو کے افسانہ سے کم دلچسپ نہیں۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی (دہلی)

- اس مقالے میں موضوع کو احتیاط اور ہنرمندی سے برتا گیا ہے اور منٹو کی کہانیوں اور ڈراموں کا مطالعہ انتہائی لگن، گہری بصیرت اور معروضی اندازِ نظر سے کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی (مرحوم)

منٹو کتھا

ڈاکٹر برج پریمی

مصنف کی چند تصانیف

- حرفِ جستجو
- جلوۂ صد رنگ
- سعادت حسن منٹو — حیات اور کارنامے
- ذوقِ نظر
- چند تحریریں
- کشمیر کے مضامین
- حبہ خاتون — بسلسلہ ہندوستانی ادب کے معمار
- جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما
- منٹو کتھا
- سپنوں کی شام (افسانے)
- پریم ناتھ پردیسی، عہد شخص اور فن کار
- ریاست جموں و کشمیر میں اردو فکشن

منٹو کتھا

ڈاکٹر برج پریمی



دیپ پبلی کیشنز
پریس موڑ، باغِ باہو، جموں (توی)

1994

دیپا پریمی نے
فوٹو لیتھو ورکس دہلی سے چھپواکر
دیپ پبلیکیشنز جموں (توی)
سے شائع کی۔

تعداد ـــــــــ 600

قیمت ـــــــــ دوسو روپے
Rs 200/-

ترتیب ـــــــــ پریمی رومانی

تقسیم کار

- سیمانت پرکاشن ـ 922 کوچہ روہیلا خان II فلور
دریا گنج ۔ نئی دہلی ـ 110002
- پاک بک چینل ـــ پکہ ڈنگہ، جموں (توی)
- دیپ پبلیکیشنز ـ پریس موڑ، باغ باہو، جموں (توی)

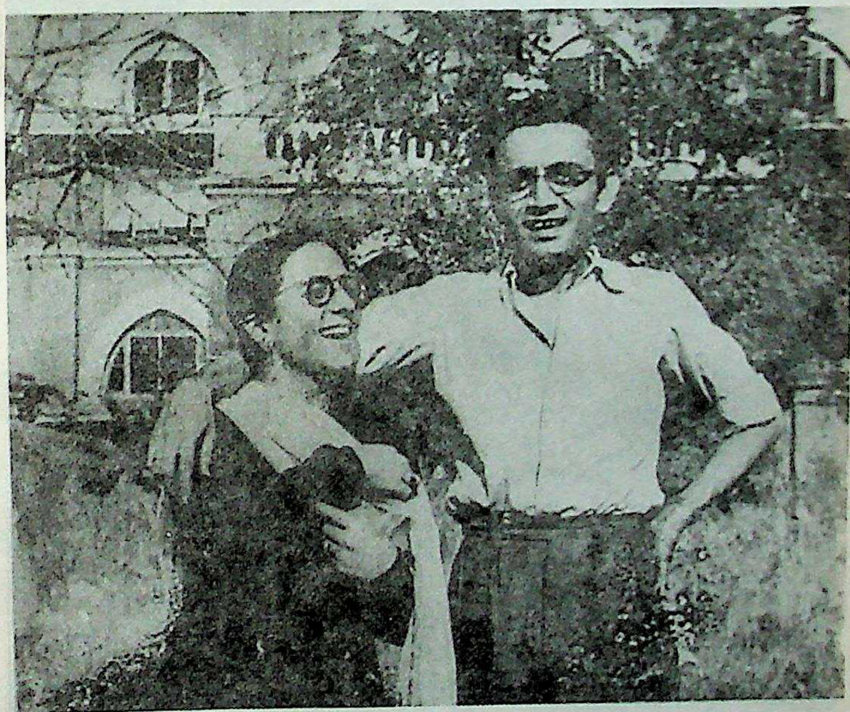
ترتیب

صفحہ نمبر

صفحہ نمبر

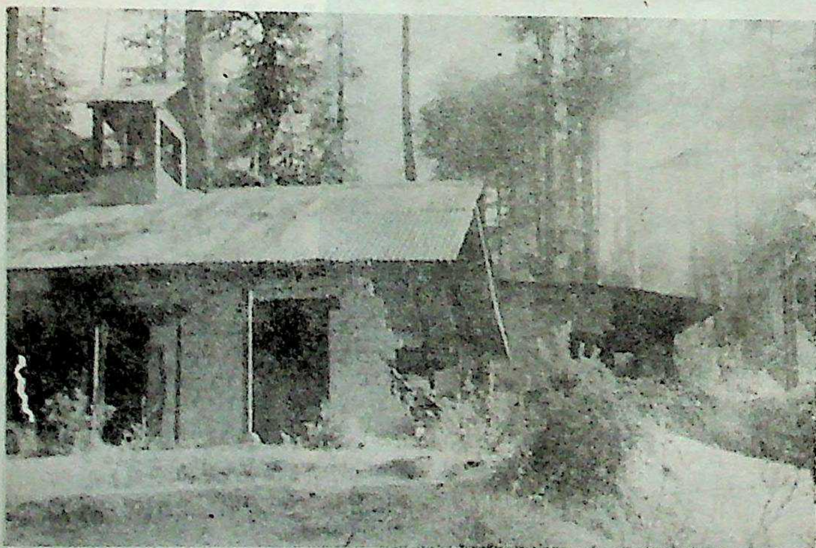


منٹو ــــ اُبلتا شباب



شُگفتہ ہم سفر — صفیہ کے ساتھ

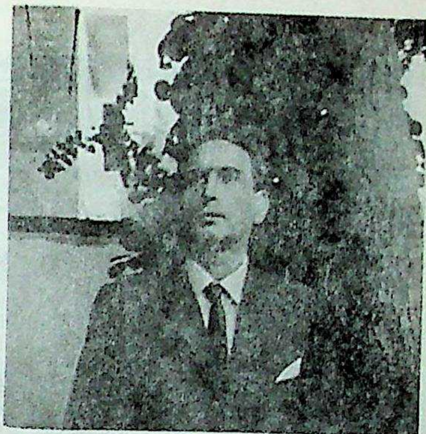




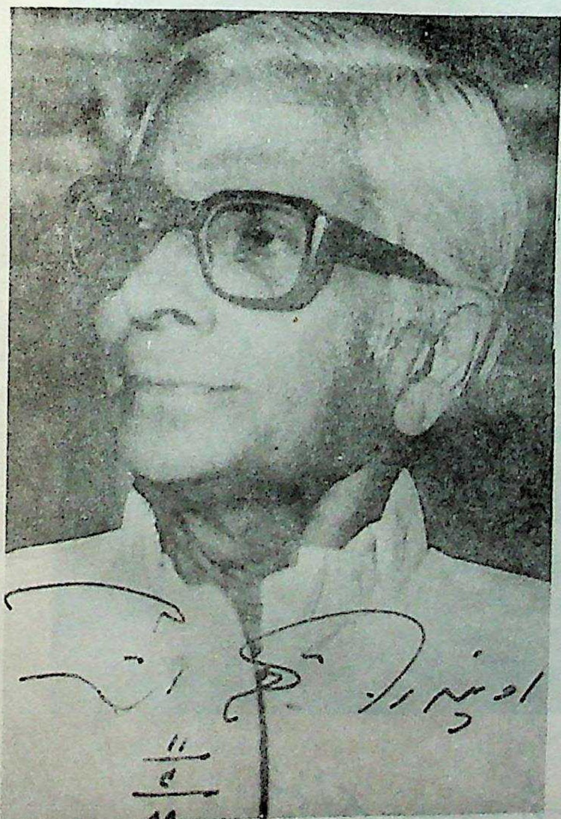
سینی ٹوریم ـــــــ بٹوت



رومان پرست اشتراکی —— کرشن چندر



ہم سفر و ہم جلیس —— ابو سعید قریشی





سُریلے گیتوں کا مغنی —— مہجور کاشمیری

اُپیندر ناتھ اشک —— دوستی کر کے دوستی نبھانے والا ۔

پیش لفظ

ڈاکٹر برج پریمی سے میری پہلی ملاقات کم وبیش چوتھائی صدی قبل ہوئی تھی۔ اس وقت وہ صحت مند، سرخ وسپید اور جوان تھے۔ کام کرنے کی اُمنگ تھی۔ ذہنی طور پر وہ ترقی پسند تحریک سے قریب تھے۔ اُس زمانہ میں وہ بڑی وقتِ نظر سے کشمیر کے کلاسیکی اور لوک روایت سے شعروادب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کئی بار مجھے اپنے گھر لے گئے اور شعروادب کے مسائل پر دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ اُنھوں نے پہلی بار مجھے کشمیر کی عوامی شاعرہ للہ عارفہ کے خوبصورت اشعار کے اُردو ترجمے سنائے۔ وہ دوسرے ترقی پسند دانشوروں کی طرح کشمیر کے رنگا رنگ کلچر اور اس کی توانا تہذیب کے توانا اور عوام دوست عناصر پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اس کا اظہار ان کے متعدّد مضامین میں بعد میں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ عبدالاحد آزاد مرحوم کے بعد کشمیری زبان اور ادبیات پر سب سے وقیع کام برج پریمی کا ہی ہے۔

اس زمانہ میں وہ اپنے پی۔ایچ ڈی کے مقالہ کے لیے سعادت حسن منٹو پر بھی کام کر رہے تھے۔ اور شاید منٹو پر یہ پہلا تحقیقی کام تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ فارسی، کشمیری اور اردو کی متصوفانہ شاعری کا تقابلی مطالعہ کریں۔ موضوع اُنھیں پسند آیا لیکن وہ منٹو کا انتخاب کر چکے تھے اور اس موضوع سے اُن کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ منٹو کا انتخاب شاید اُنھوں نے اسلیے کیا کہ منٹو کو اپنے کشمیری نژاد ہونے پر اور کشمیری تہذیب سے وابستگی پر بڑا ناز تھا۔ منٹو پر مقالہ اُنہوں نے خاصی تحقیق، دیدہ ریزی اور جانفشانی سے مرتب کیا تھا۔ لیکن اربابِ اختیار کی بے نیازی کی وجہ سے اُنھیں ڈگری تفویض ہونے میں بہت وقت لگا۔ اس سے وہ بددِل ہوئے لیکن منٹو کی شخصیت اور فن پر اُن کی کتاب شائع ہوئی تو ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں اس کا استقبال محبت سے کیا گیا اور بعد میں منٹو پر شائع ہونیوالی کئی کتابوں میں برج پریمی کی اس کتاب سے فیض اُٹھایا گیا۔ اکثر بغیر کسی اعتراف کے جو ادبی غیر دیانتداری تھی۔

برج پریمی مرحوم بہت سادہ طبیعت، مرنجان مرنج اور منکسر المزاج اِنسان تھے۔ جوڑ توڑ، سیاست اور نمائش پسندی سے کوسوں دُور۔ نہایت خاموشی لیکن پورے انہماک اور سنجیدگی سے اپنے کام میں مشغول رہتے تھے۔ اس دوران اُنھوں نے بہت سے ترجمے کیے۔ کشمیری ادب اور تہذیب کے بارے میں علمی مضامین لکھے اور جموں وکشمیر میں اردو زبان و ادب کے فروغ پر بھی کئی اہم مضامین شائع کرائے۔ جن کا مجموعہ اُن کے صاحبزادے پریمی رومانی نے بہت سلیقہ سے مرتب کر کے شائع کیا۔

اس علمی سفر میں منٹو ہمیشہ اُن کے ساتھ رہے۔ منٹو پر اُن کے تحقیقی کام

کا سلسلہ جاری رہا۔ زیرِ نظر کتاب " منٹو کھتا " منٹو شناسی کے میدان میں اُن کے دوسرے اہم کارنامہ کا درجہ رکھتی ہے۔

مختلف موضوعات کے تحت " منٹو کھتا " میں شامل مضامین کے مواد کی فراہمی میں اُنھوں نے بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے اسلیے ہے کہ بعض مضامین مثلاً باری علیگ پر مضمون لکھتے ہوئے اُنھوں نے مجھے متعدد خط لکھے جن میں کئی طرح کے سوالات کیے گئے اور واضح جواب مانگے گئے تھے۔

ڈاکٹریٹ کا مقالہ ایک بندھے ٹکے فریم میں لکھا جاتا ہے لیکن اس مقالہ کی تسوید کے دوران انھیں احساس ہوا کہ منٹو کے ذہنی اور فنی ارتقا کی تشکیل میں بعض ایسے عوامل اداروں اور شخصیتوں کا حصّہ بھی رہا ہے۔ جن کا ذکر دوسروں نے نہیں کیا۔ لیکن منٹو کو سمجھنے کے لیے اُن ماخذوں کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح منٹو کی تخلیقی فکر کے اظہار کے جو دوسرے میدان رہے ہیں مثلاً ترجمہ ناول، فلم خطوط وغیرہ ان پر بھی کما حقہ کام نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر برج پریمی ان موضوعات پر آہستہ آہستہ معنی خیز مواد جمع کرتے رہے۔ ان تمام مضامین کو بھی اُن کے ہونہار فرزند اور ادیب پریمی رومانی نے بڑی جانکاہی سے مرتب کیا ہے۔

اس کے پہلے مضمون " منٹو کا خاندان " میں اُن کے آباواجداد کے بارے میں برج پریمی نے وقیع اور نادر معلومات یکجا کردی ہیں اور نئے شواہد سے بعض حقائق کی صحت اور درستی کی ہے۔ اُنھوں نے انیس ناگی اور لزلی فلمنگ کے بعض بیانات کو تنقیدی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا بھی ہے۔

اپنے مضمون " منٹو اور کشمیر " میں بھی منٹو کی اضطراب آسا اور ناآسودہ شخصیت کے بعض ماخذوں کی طرف وقیع اشارے کیے ہیں۔

باری علیگ جو منٹو کے اوّلین سرپرست اور رہنما تھے عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے لیکن ان کے بارے میں اس سے قبل کسی نے لکھنے کی زحمت نہیں کی۔ ڈاکٹر برج پریمی نے ان کی زندگی کے بارے میں بہت قیمتی معلومات جمع کی ہیں اور خود منٹو کی تحریروں سے ان کی سیرت کا نقش اُبھارا ہے اور یہ بجائے خود بڑا دِلآویز خاکہ بن گیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر برج پریمی نے فلم انڈسٹری اور منٹو کی فلمی تحریروں کے بارے میں بھی وقیع معلومات فراہم کی ہیں۔ روسی ادب سے منٹو کی وابستگی کے بارے میں بھی جو معلومات بکھری ہوئی تھیں۔ ان کو ڈاکٹر برج پریمی نے بڑے سلیقہ کے ساتھ ایک مضمون میں مرتب کر دیا ہے۔ اس کی روشنی میں اب روسی افسانوی ادب سے منٹو کی اثر پذیری کے بارے میں زیادہ وثوق سے بات کی جاسکتی ہے۔

کتاب میں منٹو کی چند نایاب تحریریں اور اُن کے نام مشاہیر کے چند اہم خطوط بھی شامل ہیں۔ ان سے کتاب کی علمی وقعت میں اضافہ ہو گیا ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے معاصرین سے منٹو کے رابطوں کی کیا نوعیت تھی اور وہ منٹو کی بعض کمزوریوں کے باوجود ان کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کو کتنا عزیز رکھتے تھے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر برج پریمی کا نثری اسلوب بھی اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ صاف شفاف اور روشن نظر آتا ہے۔ سادگی، وضاحت، تجزیہ اور استدلال ان کے اسلوب کی امتیازی صفات ہیں۔ ان کا ذہن صاف تھا۔ اسلیے عبارت کہیں گنجلک نہیں ہوتی۔ وہ تنقید کی وزنی اصطلاحیں بھی استعمال نہیں کرتے۔ ترقی پسند نظریات سے متاثر ہونے کے باوجود برج پریمی ایسے تنقیدی رویئے میں تنقید کے دوسرے مؤثر اوزاروں سے بھی کام لیتے ہیں کہ

ان کا اصل مقصد سچائیوں کی دریافت ہے ۔ افسوس ہے کہ نا وقت اور المناک حالات میں ان کی موت نے اردو سے ایک روشن ضمیر نقاد اور محقق کو چھین لیا ۔ لیکن یہ بات باعثِ تسکین ہے کہ ان کے ہونہار صاحبزادے پریمی رومانی اپنے خونِ جگر سے اس چراغ کو جلائے ہوئے ہیں اور وطن سے ہجرت کے تلخ حالات میں بھی علمی و ادبی کام کر رہے ہیں ۔

اُمید ہے اہلِ نظر سے "منٹو کتھا" کو وہی داد ملے گی جس کی یہ مستحق ہے ۔

پروفیسر قمر رئیس
شعبہ اردو
دہلی یونیورسٹی، دہلی

منٹو کا خاندان

اس بات میں کوئی دو رائیں نہیں کہ سعادت حسن منٹو کشمیری الاصل تھے۔ اُن کے والد مولوی غلام حسن وضع قطع سے بالکل کشمیری لگتے تھے۔ بند کالر کا کوٹ، سر پر کشمیری وضع کی پگڑی اور خشخشی داڑھی۔ وہ پنجاب میں مزدوری کرنے والے کشمیری مزدوروں کو پیار سے کھینچ کر اپنی بیٹھک میں بٹھاتے اور کھلا پلا کر فخریہ انداز میں کہتے ——

"میں بھی کاشر (کشمیری) ہوں"

منٹو نے اپنی متعدد تحریروں میں خود بھی اپنے کشمیری ہونے پر فخر کیا ہے۔ حتیٰ کہ اس چیز کو بھی گلے لگایا ہے۔ جو جاگیردارانہ ذہن کے عاقبت نا اندیش لوگ تضحیک سے کشمیریوں کے لئے استعمال کرتے تھے —— "ہاتو" —— منٹو اس لفظ سے بھی احساسِ کمتری کے شکار نہ ہوئے۔ خود لکھتے ہیں:

"میں کشمیری ہوں —— ایک ہاتو!"

منٹو زندگی بھر کشمیر کشمیر کرتے رہے!

"ہائے میرے کشمیر کی زندگی!"

—— (ایک خط)

منٹو کے اس ایک فقرے میں دراصل ان کے لاشعور میں دفن وہی تڑپا دینے والا جذبہ تھا۔ جو بار بار سانپ کی طرح ان کے وجود کو ڈستا رہتا تھا۔ اور اس کا اظہار مختلف انداز میں ان کی تحریروں میں ملتا ہے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں کشمیر سے ترکِ وطن کرنے والا یہ خاندان پنجاب چلا جاتا ہے۔ بیشتر کشمیریوں کی طرح شالبافی کو اپنا ذریعہ معاش بناتا ہے۔ اس خاندان کے جدِ اعلیٰ خواجہ رحمت اللہ لاہور میں مقیم ہوتے ہیں اور پھر اپنے کاروبار کی توسیع کے پیشِ نظر امرتسر کو اپنا مستقل مستقر بناتے ہیں اور پشت ہا پشت تک یہ خاندان یہاں پر آباد ہوتا ہے۔ جب سعادت حسن منٹو ہوش سنبھالتے ہیں تو یہاں منٹوؤں کا ایک پورا محلہ آباد تھا اور کوچۂ وکیلاں کہلاتا تھا۔ اس کا سبب یہی تھا کہ اس خاندان کے لوگ تجارت کے پیشے کو ترک کر کے قانون کے پیشے کو اپنا چکے تھے۔

منٹو خاندان کے جدِ اعلیٰ نے جب امرتسر کو اپنا مستقل مستقر بنالیا تو سکھوں کی عملداری کا زمانہ تھا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ والئی پنجاب تھے۔ دربار صاحب کی اہمیت اور تقدس کے پیشِ نظر امرتسر کی اہمیت لاہور سے بھی بڑھ گئی تھی۔ امرتسر تجارت کی بڑی منڈی تھی۔ اس لئے بھی اس کی اہمیت تھی۔ خواجہ رحمت اللہ نے صرف شالبافی تک ہی اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ وہ پشمینے کی تجارت کرنے لگے تھے۔ ولیم مورکرافٹ نے اپنے سفرنامے میں امرتسر کے کشمیریوں کی پشمینہ سازی کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ مورکرافٹ لکھتا ہے:۔

"امرتسر میں شال کافی تعداد میں تیار کئے جاتے ہیں۔۔۔۔۔
یہ صنعت کشمیری خاندانوں کی شروع کی ہوئی معلوم ہوتی ہے
جو سکھوں کے اس صوبہ (کشمیر) کو فتح کرنے سے قبل افغان حکمرانوں

کے مظالم سے تنگ آکر میدانی علاقوں میں بھاگ گئے

تھے۔.......'' (سفرنامہ)

خواجہ رحمت اللہ کے زمانے میں پشمینہ سازی بڑا منافع بخش کاروبار تھا۔ ان کے بعد ان کے اہلِ خاندان نے بڑی محنت سے اس کاروبار کی توسیع کی۔ حتیٰ کہ خواجہ رحمت اللہ کے پوتے خواجہ جمال الدین نے اپنے زمانے میں اس تجارت کو اس قدر پھیلا دیا کہ ان کا کاروبار امرتسر سے نکل کر لاہور اور بمبئی تک پہنچ گیا۔ لیکن اس زمانہ میں انگریزی حکومت کا قیام عمل میں آچکا تھا اور ان کے عمل دخل سے ہندوستانی دستکاریوں کو کافی دھچکہ پہنچا۔ پشمینہ سازی بھی اس زد میں آگئی۔ منٹو خاندان بھی اس بحران کا شکار ہوا اور آہستہ آہستہ ان لوگوں نے تجارت کو سمیٹ لیا اور قانون کو اپنا پیشہ بنا لیا۔

چنانچہ خواجہ جمال الدین کے بڑے صاحبزادے خواجہ عبدالغنی نے سب سے پہلے اس نئی طرزِ زندگی کو اپنا لیا اور وہ اپیل نویس ہو گئے۔ دوسرے صاحبزادے خواجہ میاں اسداللہ نے قانون پڑھ کر وکالت کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ اور اس میں نام پیدا کیا۔ وہ امرتسر میں اپنے وقت کے سب سے بڑے وکیل تھے۔ لیکن اس سے زیادہ وہ اپنی ملی خدمات کے لئے مشہور تھے۔ ان کے دل میں مسلمانوں کے تئیں گہری ہمدردی کا جذبہ تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان بچے دینی تعلیم سے آراستہ ہوں۔ یہ جذبہ انہوں نے شہر کے عمائدین کے دل میں بھی اجاگر کیا۔ چنانچہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے انجمن اسلامیہ قائم کی اور بچوں کے لئے ایم اد ہائی سکول نام کے ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی۔ یہی وہ سکول ہے جہاں سعادت حسن منٹو نے بعد میں تعلیم حاصل کی۔ میاں اسداللہ زندگی بھر انجمن اسلامیہ کے جنرل سیکرٹری رہے اور اپنی قابلیت اور ملی درد کے پیش نظر اپنے معاصرین میں استاد جی کہلاتے رہے۔ روایت ہے کہ امرتسر کے کٹڑہ جے مل سنگھ میں کوچہ میاں اسداللہ وکیل اور ہال بازار میں میاں اسداللہ روڈ ان ہی کے نام سے مشہور تھی۔ خواجہ جمال الدین کے تیسرے صاحبزادے میاں حبیب اللہ

تھے۔ جو مختار تھے۔ چوتھے بیٹے۔ مولوی غلام نبی باوجود کوشش کے وکالت کا پیشہ اختیار نہ کر سکے۔ وہ بڑے دیندار اور متوکل تھے اور تبلیغ کو اپنا دینی منصب سمجھتے تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ انتہائی بے باک، مخلص اور درد مند آدمی تھے اور غالباً پنجاب کے ابتدائی مسلمانوں میں سے تھے جنہوں نے اس زمانہ میں مسیحی مبلغوں اور پادریوں نے عیسائیت کی تبلیغ کا زبردست بیڑا اٹھا رکھا تھا، مناظرے کیے اور اسلام کی فضیلت پر باقاعدہ لیکچر دیئے۔ ان مناظروں اور مذاکروں کے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ مولوی صاحب نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دینی رسایل تحریر کیے۔ ان میں خاص طور پر "حقیقت اہلیت جہاد" اور "تحقیق اسلام" قابل ذکر ہیں۔ مولانا نے انجیلِ مقدس کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اس پر عبور حاصل کیا تھا اسی وسعتِ مطالعہ نے انہیں اپنے دینی منصب کو جسے وہ مقدم سمجھتے تھے، بخوبی انجام دینے میں مدد کی۔

خواجہ جمال الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے مولوی غلام حسن تھے۔ وہ سعادت حسن منٹو کے والد بزرگوار تھے۔ پیشے سے منصف تھے بعد میں سب جج ہو گئے، مولوی صاحب بھی اپنے بزرگوں کی طرح بڑے دیندار تھے اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ ان کا انتقال ۲، فروری ۱۹۳۲ء[1] کو ہوا جب وہ قریباً ستر برس کے تھے۔ ان کے انتقال کے وقت سعادت حسن

---

[1] انیس ناگی، مولوی غلام حسن کی تاریخ وفات ۱۹۳۰ء قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق مولوی صاحب کی عمر اس وقت ۷۶ برس تھی ــــ لزلی فلیمنگ اپنی تھیسس میں یہ تاریخ ۲۵، فروری ۱۹۳۲ء قرار دیتی ہیں جب ان کے مطابق سعادت حسن منٹو ۱۹ برس کے تھے۔

یہ دونوں بیانات محل نظر ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولوی صاحب کا انتقال ۲، فروری ۱۹۳۲ء کو ہوا تھا جب وہ لگ بھگ ستر (۷۰) برس کے تھے۔ اس کی تصدیق مولوی صاحب کے صاحبزادے اور سعادت حسن منٹو کے بھائی میاں سلیم حسن منٹو کے بیان سے ہوتی ہے۔ جو ان کے مرتب کیے ہوئے شجرۂ نسب میں درج ہے اور اس مادۂ تاریخ وفات سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔ جو سعادت حسن منٹو کے مربی اور دوست آغا خلش کاشمیری نے کہی تھی [illegible] غلام حسن منٹو بگفتہ "مقیم جنت فردوس باغ"

۱۳۵۰ھ

کی عمر صرف بیس برس کی تھی۔

مولوی غلام حسن نے دو شادیاں کر لی تھیں۔ پہلی بیوی جان بی بی (بڑی بیگم) سے ان کی تو اولاد ہوئی۔ جن میں سے تین اولاد نرینہ تھیں۔ خواجہ الحاج محمد حسین، خواجہ سعید حسن اور خواجہ سلیم حسن۔ محمد حسن اور سعید حسن دونوں نے قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور دونوں ہی بیرسٹر ایٹ لا تھے۔ جس زمانہ میں لاہور میں مارشل لا کا دبدبہ تھا یہ دونوں بھائی امرتسر سے لاہور آئے۔ اس زمانہ میں غیر منقسم ہندوستان کے مشہور سیاسی رہنما اور مجاہد آزادی ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو امرتسر سازش کیس میں ملوث کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر کچلو بھی کشمیری تھے اور منٹوؤں کے قریبی رشتہ دار تھے۔ خواجہ محمد حسن اور سعید حسن دونوں بھائیوں نے ان کے مقدمے کی پیروی کی۔ خواجہ محمد حسن لا جرنل کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اور سعید حسن لاہور لا کالج کے وائس پرنسپل رہے۔ دونوں بھائیوں نے بڑی لگن اور دیانت داری کے ساتھ اپنے منصبی فرائض کو برسوں نبھایا اور بعد میں مشرقی افریقہ چلے گئے۔ جہاں انہوں نے ایک خود مختار قانونی ادارہ "حسن اینڈ حسن" چلایا۔ یہ ادارہ قانونی مشورہ فراہم کرنے میں سرگرم عمل رہا اور کافی شہرت حاصل کی۔ اسی دوران سعید حسن کو پریوی کونسل کی ایک اپیل کی قانونی پیروی کرنے کے سلسلے میں لندن جانا پڑا۔ جہاں فجی مسلم لیگ کے ساتھ تعلقات پیدا ہوئے۔ اسی لیگ کی دعوت پر منٹو برادران نے فجی میں اپنا قانونی کاروبار چلانے کا فیصلہ لیا۔ چنانچہ وہ فجی میں مقیم ہوئے اور وکالت کرنے لگے۔ فجی میں مستقل قیام کرنے سے پیشتر وہ بمبئی میں کچھ عرصہ رہ کر وکالت کرتے تھے۔ اس کا ذکر منٹو بلا واسطہ کئی جگہ کرتے ہیں۔ منٹو کا کردار رام کھلاون سعید حسن کو ساعید شالم بالسٹر کہتا ہے۔

فجی آئی لینڈ میں منٹو برادران کی وکالت خوب چلی۔ آہستہ آہستہ یہاں کی عوامی زندگی میں انہوں نے عمل دخل حاصل کر لیا۔ سعید حسن لیجسلیٹو کونسل کے سینئر ہندوستانی ممبر مقرر ہوئے اور عرصہ دراز تک فجی کی سیاست اور انتظامیہ میں ان کا اثر رہا۔ جس سے فجی میں رہنے والے ہندوستانی مستفید ہوتے رہے۔ الحاج محمد حسن بڑے پارسا اور دین دار آدمی تھے انہوں نے یہ دیکھ کر فجی

کے مسلمان مذہب سے یکسر بیگانہ ہیں۔ مقامی زبان میں قرآنِ مجید کا ترجمہ کروایا اور جب تک فجی جزائر میں رہے تبلیغِ اسلام کرتے رہے۔

سعادت حسن منٹو اپنے ان دونوں بھائیوں سے مختلف مزاج رکھتے تھے۔ وہ ایک باغی طبیعت لے کر آئے تھے۔ وہ نہ متقی تھے نہ ان معنوں میں پارسا۔ وہ زندگی، مذہب اور اخلاق کے بارے میں اپنا ایک مخصوص زاویہ نظر رکھتے تھے ——— کرشن چندر نے منٹو کا ان کے بھائیوں کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "بڑے بھائی کو میں نے دیکھا ہے۔ شرعی داڑھی اور بے حد متقی پارسا اور نمازی مسلمان۔ منٹو وہ سب کچھ ہے جو اس کے دونوں بڑے بھائی نہیں ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں کی عزت کرتا ہے محبت نہیں آداب میں، اخلاق میں، زاویۂ نگاہ میں اس قدر شدید اختلاف تھا کہ منٹو نے بچپن سے ہی اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔"

(نئے ادب کے معمار)

منٹو نے اپنی زندگی تلخیوں میں گزاری تھی۔ انہوں نے اپنے بچپن سے ہی کڑھ کڑھ کر ایک محبوس زندگی کا سامنا کیا تھا۔ والد کی سخت گیر طبیعت کو جھیلا تھا۔ بھائیوں کی بے مروتی کو چکھ لیا تھا۔ ان کا علم و فضل صرف دین اور قانون تک محدود تھا اس کے برعکس منٹو نے زندگی کو اپنی تمام برہنگی کے ساتھ دیکھا تھا اور اس کا مقابلہ کیا تھا۔ اس لئے وہ بھائیوں کی صرف عزت کرتے تھے ان سے ان کا کوئی جذباتی رشتہ نہیں تھا۔ یہی سبب ہے کہ ایک بار جب سعید حسن بمبئی میں ان کے پاس مقیم ہوئے تو ایک ہی رات میں سعادت کے طور طریقے دیکھ کر ان سے نالاں ہوئے اور انہیں نامعقول قرار دیا۔ حتیٰ کہ ان کے یہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ منٹو نے اس کا ذکر اپنے اسی بے باک انداز میں کیا ہے جس سے ان کے معترضین اور

نکتہ چین ہمیشہ خایف رہے ہیں:۔

"انہوں نے اصل میں اپنی ساری زندگی قانون کی کتابوں میں گزاری تھی۔ ساری عمر مقدمے لڑتے تھے، لاہور میں، بمبئی میں مشرقی افریقہ میں، جزایر فجی میں۔ ان کو کیا معلوم کہ فلمی دنیا کیا ہوتی ہے اور اس کے عاشق اور معشوق کس قسم کے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاؤں سر پر رکھ کر بھاگے اور خلافت ہاؤس میں جا کر پناہ لی۔"

(نور جہاں)

مولوی غلام حسن کی دوسری بیوی (چھوٹی بیگم) سعادت حسن منٹو کی والدہ تھیں۔ ان کا اصلی نام سردار بیگم تھا اور کابل کی رہنے والی تھیں۔ جہاں سے ان کا خاندان لاہور آ گیا تھا۔ سردار بیگم بچپن میں یتیم ہو چکی تھیں اور ان کا عقد ہدایت اللہ نام کے ایک شخص سے ہو چکا تھا۔ یہ شادی کامیاب نہ رہی اور لاہور میں ہی مولوی غلام حسن کے ساتھ ان کا دوبارہ عقد ہوا۔ ان سے تین بچے ہوئے۔ سعادت حسن منٹو ان کی اکلوتی اولادِ نرینہ تھی۔ انیس ناگی کے مطابق یہ شادی خاندان میں ناپسند تھی اور یہ بات قرین قیاس بھی ہے۔ کیوں کہ مولوی صاحب ایک متمول خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور خود بھی ایک باعزت عہدے پر فائز تھے۔

ذکر ہو چکا ہے کہ منٹو کے والد مولوی غلام حسن کثیر الاولاد تھے۔ جس زمانہ میں سعادت کی پرورش ہونا چاہیے تھی وہ پنشن لے چکے تھے۔ اسلئے ان کی آمدن محدود تھی۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ چھوٹی بیگم کے دونوں بچے سعادت اور ان کی بہن ناصرہ اقبال گھاٹے میں رہے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر کوئی معقول توجہ نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ سعادت میٹریکولیشن کے امتحان میں کئی بار فیل ہو کر محض تھرڈ ڈویژن میں کامیاب ہو سکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو کے مضمون میں وہ ناکام رہے۔

منٹو کی والدہ بڑی نیک اور نرم مزاج خاتون تھیں۔ مولوی صاحب کے ساتھ ان کا عقد اس زمانہ میں ہوا تھا۔ جب مولوی صاحب کی ڈھلتی عمر تھی اور ٹھاٹ بھاٹ کم ہو چکی تھی ان کے انتقال کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح گھر گرہستی چلاتی رہیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ وہ سوزن کاری میں بڑی ماہر تھیں۔ منٹو کے بمبئی چلے جانے کے بعد وہ بھی بمبئی آ گئی تھیں۔ جہاں ان کی بیٹی اور داماد بھی مقیم تھے۔ منٹو کی شادی کے بعد وہ ان کے یہاں رہنے لگی تھیں۔ احمد ندیم قاسمی کے نام منٹو کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی میں ان کا انتقال جون ۱۹۴۰ء میں ہوا تھا۔

منٹو کی شادی ان کے والدہ کے ایما پر ایک کشمیری خاندان میں ہوئی تھی جو برسوں افریقہ میں مقیم تھا۔ بیگم صفیہ منٹو کے والد افریقہ میں پولیس انسپکٹر رہ چکے تھے۔ ان کے کشمیری الاصل ہونے کا ذکر خود منٹو نے بھی کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میری بیوی لاہور کے ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔"

یہ شادی ۲۶ر اپریل ۱۹۳۹ء کو ہوئی تھی۔

منٹو اور صفیہ کی ازدواجی زندگی صرف سولہ سال پر محیط ہے۔ ان کے چار بچے ہوئے ایک بیٹا اور تین بیٹیاں۔ اس قلیل عرصے میں صفیہ بیگم نے زندگی کے بڑے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ لیکن آخری تین برس منٹو نے جس بے بسی اور کسمپرسی میں گزارے۔ اس کا اثر صفیہ بیگم اور ان کی بچیوں پر بھی پڑا۔ لیکن وہ کبھی حرفِ شکایت ہونٹوں پر نہ لائیں۔ جب ان کی ازدواجی زندگی کی طرف راقم السطور نے ان کی توجہ دلائی تو انہوں نے لکھا:

"میں اس لئے خوش قسمت ہوں کہ ایک بڑے ادیب کے ساتھ زندگی گزاری اور اللہ کے فضل سے بہت اچھی زندگی گزاری۔ ان کی میرے ساتھ، میری بچیوں کے ساتھ اور بلکہ دوسرے اہلِ خاندان کے ساتھ بہت محبت تھی۔

اور ہمارے دن بڑے اچھے گزرے ہیں۔"

چند سال پہلے صفیہ بیگم بھی ۶۲ برس کی عمر میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ منٹو کی اکلوتی اولاد نرینہ عارف کا انتقال صرف ایک سال کی عمر میں ہوا تھا۔ تین بیٹیاں نکہت (اب نکہت پٹیل) نزہت (اب نزہت ارشد فاروق) اور نصرت (اب نصرت شاہد جلال) اللہ کے فضل سے حیات ہیں۔

سعادت حسن منٹو کی طوفانی زندگی کا چراغ ۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء کو ۴۲ سال ۸ ماہ اور ۴ دن جل کر ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔

وہ ۱۱ر مئی ۱۹۱۲ء کو سمبرالہ (لدھیانہ) میں پیدا ہوئے تھے۔

منٹو ــــــ شخصیت کے چند پہلو

منٹو نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو ایسے ماحول میں پایا جہاں نظم وضبط کی تعلیم پر خاصا زور دیا جاتا تھا۔ والد سخت گیر تھے لہذا انہیں کوئی پیار نہ مل سکا محبت، شفقت اور ہمدردی کے اسی فقدان نے سعادت حسن کو منٹو بنا دیا۔ ان کی زندگی میں جو لاأبالی پن، غیر معمولی انانیت اپنے آپ کو دوسروں پر حاوی کرنے کی قوت ملتی ہے وہ اسی کمی کی تلافی کرتی ہوئی نظر آتی ہے جو اُن میں باپ کے بوسے کو نہ پا سکنے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ بعد کی زندگی میں بھی ان کو ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ اُن کے دُکھتے ہوئے زخموں پر کسی نے مرہم نہیں کیا حتیٰ کہ دوستوں نے بھی اُن کو سمجھنے میں غلطیاں کیں۔ انہی آزمائشوں نے انہیں کندن بنایا تھا۔ وہ جہاں اپنی بات منوانے کے لئے کچھ بھی کر سکتے تھے وہاں اُن کے دل میں حساس گوشے بھی تھے جو اوروں کی محبت اور ہمدردی سے بھرے رہتے تھے۔ اس خلوص کی تابناکی ان کی زندگی کے ہر دور میں ملتی ہے۔ اس زمانے میں بھی جب وہ محض ایک معمولی ایڈیٹر تھے اُس وقت بھی جب فلم اور ادب کی دنیا میں اُن کی دھوم تھی اور اُس زمانے میں بھی جب وہ پاکستان میں مفلس اور قلاش ہو کر بیس روپے میں شراب کی بوتل کے لئے اپنی تخلیقات بیچتے تھے وہ دریا دلی اور خلوص کے پیکر بنے رہے۔ اس خلوص کی ایک تصویر حامد جلال

نے اپنے مضمون 'منٹو ماموں' میں یوں کھینچی ہے۔

" بمبئی میں ان کے پاس جو فلیٹ تھا وہ نہ تو بہت بڑا تھا نہ بہت چھوٹا لیکن اُس میں مہمانوں کا ہمیشہ ہجوم ہوتا۔ کیوں کہ وہ ان کی دل کھول کر مدارت کرتے تھے مہمانوں کی تعداد سے اگر مہمان زیادہ ہو جاتے تو منٹو ماموں فرش پر اپنا بستر سب سے پہلے بچھا دیتے کبھی کبھی تو مہمانوں کی اتنی کثرت ہوتی کہ فرش پر بھی جگہ باقی نہ رہتی اور منٹو ماموں رات لکڑی کے تختوں پر گزار دیتے جو بیت الخلا کے راستے میں چھت کے نیچے لگے ہوئے تھے منٹو ماموں اپنے اس ایثار کا کسی سے ذکر تک نہ کرتے۔"

منٹو نہ صرف یہ کہ بڑھیا سی بڑھیا چیز خود خریدتے تھے بلکہ اکثر چیزیں خرید کر اپنے احباب میں تحفے کے طور پر دیتے تھے۔ خود اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ لہذا بڑے بڑے ڈاکٹروں سے معائینہ کروانے کے عادی تھے۔ اور لوگوں کو بھی اچھے اچھے ڈاکٹروں سے طبی مشورہ کرنے کے لئے اصرار کرتے تھے۔ خود اپنی جیب سے ان کی فیس ادا کرتے تھے۔ حتی کہ ایک بار اپنے نوکر کو بھی اپنے ڈاکٹر کے پاس لے گئے جس کی فیس ۶۴ روپے تھی۔ ڈاکٹر پر ان کی ہمدردی کا اس قدر اثر ہوا کہ انہوں نے نصف فیس پر ہی اکتفا کیا۔

منٹو کی طبیعت میں SENSATIONLISIM کا مادہ بدرجہ اتم تھا۔ وہ کبھی کبھی ایسی حرکتیں کرتے کہ لوگ حیرت زدہ رہ جاتے۔ ان کی زندگی ان بے شمار واقعات سے عبارت ہے جن سے وہ اپنے ارد گرد عجیب فضا پیدا کر لیتے تھے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں وہ اپنی شوخیوں کی وجہ سے اپنے ساتھیوں اور اپنے ہمعصروں میں مرکز توجہ بن چکے تھے اور 'ٹامی' کے نام سے مشہور ہو چکے تھے۔ ان کا محبوب مشغلہ افواہیں پھیلانا تھا۔ ان کی ہر افواہ نرالی ہوا کرتی تھی جس سے ان کی ذہن کے خلاقی کا قائل ہونا پڑتا ہے مثلاً

امریکہ والوں نے تاج محل خرید لیا ہے اور وہ بڑی مشینوں کے ذریعے سے اسے امریکہ لے جا رہے ہیں۔

لاہور میں ٹریفک کے سپاہیوں کو برف کے کوٹ مہیا کئے گئے ہیں۔

میرا فونٹین پین گدھے کے سینگ کا بنا ہوا ہے۔

منٹو نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک انجمن منظم کی تھی۔ نام تھا ' انجمن احمقان ' اس انجمن سے وابستہ لوگوں کا کام عجیب و غریب باتیں منوانا ہوا کرتا تھا۔ اکثر اوقات ان کی باتیں بہت ہی عجیب و غریب ہوا کرتی بحثیں۔ مثلاً

اس قلم کے متعلق آپ کی نب کیا ہے؟

اس قمیض کے متعلق آپ کا بٹن کیا ہے؟

منٹو بقول کرشن چندر ٹوپی سے خرگوش نکالنے کے قائل تھے اور اس کام کو وہ بڑی صلاحیت سے انجام دے سکتے تھے۔ جن دنوں ان کی فلم 'آٹھ دن' فلمائی جا رہی تھی ان کے مشہور افسانے 'بو' پر فحاشی کا الزام دے کر ان کے نام وارنٹ جاری کئے گئے۔ اس زمانے کے مشہور کامیڈین وی ایچ ڈیسائی ان کی فلم میں کام کرتے تھے۔ منٹو کو سوجھی کہ وہ اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے ڈیسائی کو لے آئیں۔ اس سے منٹو کا مقصد محض ایک عجیب و غریب سنسنی پیدا کرنا تھا جو اپنے طرز کا نرالا واقعہ ہوتا لیکن شوٹنگ کی مشکلات نے اس خواب کو شرمندہ تعبیر ہونے نہ دیا۔

منٹو نے جب اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تو ابتدا سے ہی ہنگامہ آرائی پر اتر آئے۔ اپنے افسانوں کے پہلے مجموعے 'منٹو کے افسانے' کی اشاعت کے وقت ناشر کو ہدایت دی کہ گرد پوش ایسا بنایا جائے کہ لوگ اسے دیکھتے ہی انہیں گالیاں دینے لگ جائیں۔ کہانیاں ایسی لکھیں کہ چاروں طرف واہ واہ اور ہاہا کار مچ گئی۔ ترقی پسندوں نے رجعت پسندی کا لیبل چسپاں کر دیا اور رجعت پسندوں نے ترقی پسند اور دہریہ کہا۔ ان کے افسانوں پر مقدمے چلے۔ ان کو فحش نگار اور گندہ ذہن کہا گیا۔ شراب نوشی سے چھٹکارا دلوانے کے لئے پاگل خانے بھیج دیئے گئے لیکن جب پاگل خانے سے نکلے تو ان کے منہ سے یہ معنی خیز جملہ نکلا۔

"چھوٹے پاگل خانے سے نکل کر بڑے پاگل خانے میں آ گیا ہوں۔"

منٹو کی ایک بڑی کمزوری ان کی صاف گوئی تھی۔ سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید کہنا ان کا شعار تھا۔ نجی گفتگو میں، ادبی مجلسوں میں، اپنی تحریروں اور تقریروں میں انہوں نے ہمیشہ وہی کہا

جس کو ان کا ضمیر اور ان کا ایمان تسلیم کرتا تھا۔ ان کے خاکوں پر زبردست اعتراضات کئے گئے۔ ان کے عزیز دوست اور مشہور ادیب ابراہیم جلیس نے ایک بار ان سے کہا۔

'منٹو! تم شاہراہِ ادب کی طرف پلٹ کر دیکھو تم نے اس پر کیسے کیسے مجسمے نصب کئے ہیں۔ بابو گوپی ناتھ' ٹوبہ ٹیک سنگھ اور موذیل اور آج تم اپنے دوستوں کی زندگی سرِ بازار نیلام کر کے اس سے اپنی روٹی کما رہے ہو۔'

لیکن منٹو ان رسمی باتوں کے قائل نہ تھے۔ وہ اس بات کے بھی قائل نہ تھے کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار لانڈری میں بھیج دیا جائے۔ جہاں سے دُھل کر آئے اور رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔ وہ مصور نہیں ایک فوٹو گرافر تھے جو ہو بہو تصویر کھینچنے کا قائل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ڈنکے کی چوٹ کہا۔ ان کے فن کے بارے میں ان کی حیات میں ہی کانی لے دے ہوتی رہی لیکن انہوں نے نقاد حضرات کی نکتہ چینیوں کی کوئی پرواہ نہیں کی بلکہ جو کچھ محسوس کیا اسے پوری دیانت داری کے ساتھ پیش کیا۔ اپنے مزاج کی اس افتاد کے بارے میں ان کے خیالات کم دلچسپ نہیں۔ ان کے مطالعے سے ان کا نقطہ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ اپنے خاکوں کے مجموعے 'گنجے فرشتے' میں رقمطراز ہیں۔

" میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں کوئی شیمپو نہیں۔ کوئی گھونگر پیدا کرنے والی مشین نہیں۔ میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی میراجی کی ضلالت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا ہوں کہ وہ برخود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے۔ اس کتاب 'گنجے فرشتے' میں جو فرشتہ بھی آیا۔ اس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔"

منٹو خط مستقیم کے عادی نہ تھے۔ وہ زندگی بھر خط مستقیم سے متنفر تھے۔ ان کے بچپن سے لے کر ان کی موت تک ان کے ترجموں سے لے کر ان کے طبعزاد افسانوں اور مضامین تک ہر جگہ ٹیڑھے میڑھے خطوط نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کبھی اس راستے کو تسلیم نہیں کیا ہے جس پر لوگ پہلے

ہی چل پڑے تھے۔ ہر بات میں انہوں نے نیا راستہ دریافت کیا۔ اپنے معاصرین اور پیشروؤں کے برخلاف وہ روایت پرستی سے بیزار تھے۔ بُت شکنی اُن کا شعار تھا نفسیاتی اور جنس کی نفسیات کے افسانے لکھنے کی ایک بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ لوگوں نے ایسے افسانوں کو فحش اور بیکار قرار دیا جن میں اُنہوں نے مروجہ اصولوں سے بغاوت کی تھی اور انہوں نے ضد میں آکر ایسے افسانوں کو اپنا موضوع خاص بنالیا۔ وہ اس راہ پر چلنا کفر سمجھتے تھے جن پر اوروں نے اپنے جھنڈے گاڑ دیئے ہوتے۔ اس لئے اُن کے موضوع منفرد اور اچھوتے ہوا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں اُن کے خط کا اقتباس ملاحظہ ہو جو انہوں نے اپنے دوست احمد ندیم قاسمی کو لکھا تھا۔ اس کے مطالعے سے اُن کے نظریئے پر روشنی پڑتی ہے۔

"پتی ورتا استریوں اور نیک دل بیویوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب ایسی داستانیں فضول ہیں۔ کیوں نہ ایسی عورت کا حال کھول کھول کر بتایا جائے جو اپنے پتی کی آغوش سے نکل کر کسی دوسرے مرد کی بغل گرما رہی ہو اور اُس کا پتی کمرے میں بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا ہو۔ گویا کچھ ہو ہی نہیں رہا ہو۔ زندگی کو ایسے رنگ میں پیش کرنا چاہیئے جیسی کہ وہ ہے نہ کہ وہ جیسی تھی یا جیسے ہوگی اور جیسی ہونی چاہیئے۔"

اُن کے لکھنے کا طریقہ تمام دُنیا سے نرالا تھا۔ بقول اُن کے وہ افسانہ نہیں لکھتے تھے بلکہ افسانہ ہو جاتا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران جب اُن سے کسی موضوع پر فیچر لکھنے کو کہا جاتا تھا تو وہ فوراً اپنا ٹائپ رائیٹر نکالتے اور مسودہ تیار کئے بغیر ٹائپ کرنا شروع کر دیتے تھے۔ افسانہ لکھتے وقت وہ کسی خاص ماحول کی تلاش میں نہیں ہوتے تھے بلکہ گھر کے دوسرے کام کاج کے ساتھ ساتھ افسانہ تخلیق کرنے کا کام بھی ہو جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ شدید تخلیقی کرب میں مبتلا ہو جاتے۔ لکھتے ہیں۔

"افسانہ میرے دماغ میں نہیں۔ جیب میں ہوتا ہے جس کی مجھے کوئی خبر نہیں ہوتی۔ میں اپنے دماغ پر زور دیتا رہتا ہوں کہ افسانہ نکل آئے۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہتا ہوں مگر افسانہ دماغ سے باہر نہیں نکلتا۔ آخر تھک ہار کر بانجھ عورت کی طرح

لیٹ جاتا ہوں۔"

منٹو اپنے تخلیقی کارناموں سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ کبھی بھی اپنی زندگی کی منزل متعین نہ کر سکے اور یہ نا آسودگی زندگی بھر ان کو تڑپاتی رہی۔ وہ کچھ کر کے دکھانا چاہتے تھے لیکن جب کچھ ہو ہی نہیں پاتا تھا تو ہنگاموں پر اتر آتے تھے۔ وہ اکثر گھاٹے میں رہتے۔ اس سے ان کی جھلاہٹ میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ وہ اپنی زندگی کو ایک دیوار کہتے جس کا پلستر خود اپنے ناخنوں سے کھرچتے۔ کبھی کبھی اُن کے جی میں آتا کہ وہ اس ملبے پر ایک نئی عمارت کھڑی کر دیں۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ ان کی شخصیت اُس ظاہری منٹو سے مختلف ہے جو گوشت پوست کی شکل میں لوگوں کو نظر آتا ہے لیکن لوگوں کو اس حقیقت کا احساس نہ تھا۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن جب راستے مسدود پاتے تو ان کے دلولے بھی دب کر رہ جاتے۔ وہ جذباتی گھٹن کا شکار ہو جاتے اور یہ گھٹن ان کو ذہنی انتشار میں گرفتار کر دیتی تھی۔ ان کے اس دماغی ہیجان کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے ایک بار اپنے عزیز دوست احمد ندیم قاسمی کو لکھا تھا۔

"طبیعت پر ایک عجیب بوجھ محسوس کر رہا ہوں۔ ایک عجیب و غریب تکان سی طاری ہے میں اس اضمحلال کا سبب جانتا ہوں مگر اس سبب کے پیچھے اتنی چیزیں کارفرما ہیں۔ کچھ بھی ہو مجھے اطمینان نصیب نہیں۔ میں کسی چیز سے مطمئن نہیں۔ ہر شے میں ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ مجھے اپنے آپ سے بھی تسکین نہیں ہوتی ..... ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں جو کچھ ہوں جو کچھ میرے اندر ہے وہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کے بجائے کچھ اور ہی ہونا چاہیئے"

منٹو کی سب سے بڑی کمزوری ان کا بے پناہ خلوص تھا۔ اس خلوص کی پرچھائیاں اُن کے فن میں بھی جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ اُن کے نظریات اگرچہ ان کے دوستوں سے بالکل مختلف تھے لیکن وہ دوست بنا کر دوستی کو نبھانے کا فن جانتے تھے۔ ان کی مختصر زندگی کی داستان ایسے بے شمار واقعات سے عبارت ہے جہاں شدید اختلافات کے باوجود ان کا بیکراں خلوص ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔

منٹو کی ہر تحریر ۷۸۶ کے عدد سے شروع ہوتی ہے۔ اگر غلطی سے کہیں یہ عدد لکھنا بھول جاتے اور

اس کے بغیر ہی اُن کا کوئی مضمون افسانہ یا ڈرامہ مکمل ہوجاتا تو وہ ضائع کر دیتے اور اکثر اوقات وہ چیز دوبارہ کبھی تخلیق ہی نہ ہوتی۔ اس بات سے بعض اوقات لوگ انہیں ضعیف الاعتقاد سمجھنے لگتے تھے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ منٹو کوئی مافوق البشر نہ تھے ان کی عظمت اس بات میں بھی پوشیدہ ہے کہ وہ انسانی خامیوں سے پاک نہیں تھے۔ ہر انسان اپنے ماحول معتقدات اور گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوتا ہے منٹو کو جو ابتدائی ماحول ملا۔ وہ ظاہر ہے۔ مذہبی رسومات اور اعتقادات سے الگ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے ابتدائی عمر کے تصورات فکر و نظر کی وسعت یابی کے باوجود ان کی طبیعت کا جزو رہا منٹو بادہ نوش تھے لیکن شراب کے نشے میں دُھت رہ کر بھی اپنے مذہبی عقائد سے بیگانہ نہیں ہے ایک بار فلم ایکٹریس پارو دیوی کے ہاں محفلِ رقص و سرور لگی ہوئی تھی۔ اشوک کمار، ایس داچا، این دتہ پائی منٹو اور دوسرے لوگ شریک محفل تھے۔ سب لوگ ہوش و حواس کھوئے ہوئے پی رہے تھے۔ پارو نے ٹھمریاں، غزلیں اور گیت پیش کئے اور آخر میں ایک نعت شروع کی لیکن منٹو نے اس حالت میں بھی کہ جب وہ مدہوش تھے کہا:۔

"پارو دیوی! یہ محفل نشاط ہے شراب کے دَور چل رہے ہیں۔ یہاں کالی کملی والے کا ذکر نہ کیا جائے تو اچھا ہے۔"

منٹو نے مذہب پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا اور نہ ہی مذہبی قواعد کی پابندی پر کبھی سوچ لیا تھا لیکن اسلام کے ساتھ انہیں والہانہ عشق تھا مشہور افسانہ نگار اور اُن کے ہمعصر دوست جناب کرشن چندر کی توجہ جب میں نے اس بات کی طرف مبذول کرائی تو انہوں نے کہا:۔

"منٹو نماز وغیرہ کے پابند نہ تھے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں کچھ سن نہیں سکتے تھے۔"

لیکن ان کی تحریروں میں کہیں پر بھی مذہب کی چھاپ نہیں ملتی۔ انھوں نے ہمیشہ مذہب کے نام پر کئے گئے مظالم کے خلاف بغاوت کا عَلم بلند کیا۔ فسادات پر ان کا جتنا بھی ادب شائع ہوا ہے شاید ہی کسی اور ہندوستانی یا پاکستانی ادیب نے اتنا ادب تخلیق کیا ہو لیکن ان کی ہر تحریر منافرت تنگ

نظری، تعصب اور قتل و غارت کے خلاف ہے۔ اُن کی ایک کہانی 'سہائے' کا یہ منظر ملاحظہ ہو:۔

"یہ مت کہو کہ ایک لاکھ مسلمان اور ایک لاکھ ہندو مرے۔ یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ہندو مذہب مر گیا ہے لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے تغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہو گیا مگر اسلام پہ ایک ہلکی سی خراش بھی نہ آئی۔ وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب شکار کیا جا سکتا ہے۔ مذہب، دین، ایمان، دھرم، یقین، عقیدت جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں رُوح میں ہوتا ہے چھرے، چاقو یا گولی سے فنا نہیں ہو سکتا۔"

منٹو باضابطہ طور پر کسی سیاسی جماعت کے ساتھ کبھی وابستہ نہ رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی ڈسپلین کے پابند نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کی زندگی کی کہانی واضح طور پر ثابت کرتی ہے کہ حالات اور واقعات نے انہیں زبردست برتری کا احساس دلایا تھا۔ یہ برتری سیدھی راہ سے انہیں حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اپنی کمزوریوں اور زندگی کی بے شمار خالی جگہوں کو انہوں نے خود ساختہ احساس برتری سے پُر کر رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زبردست قسم کی انانیت کے شکار تھے۔ اُن کی کہانیوں میں جو تخلیقی اُپج ملتی ہے اس کے پس پردہ ان کی 'انا' کا زبردست ہاتھ نظر آتا ہے یہی 'انا' انہیں بعد کی زندگی میں سیاست سے دُور رکھنے میں کامیاب رہی۔ حالاں کہ ابتدائی زندگی میں اُن پر انقلابی تصورات کی چھاپ نظر آتی ہے سیاست سے انہیں بعد میں اس لئے بھی دلچسپی نہ رہی کیوں کہ سیاست دان، سیاست سے زیادہ بیترہ بازی کو اپنا شعار بنانے لگے تھے۔

منٹو سیاست دان کو ایک پیشہ ور آدمی سمجھتے تھے جو لوگوں کی خدمت کے بجائے اپنے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:۔

"سیاسیات سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیڈروں اور دوا فروشوں کو میں ایک ہی زمرے میں شامل کرتا ہوں۔ لیڈری اور دوا فروشی یہ دونوں پیشے ہیں۔ دوا فروش

اور لیڈر دونوں دوسروں کے نسخے استعمال کرتے ہیں"۔

لیکن منٹو کی ابتدائی زندگی پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ وہ شدت سے اشتراکیت کی طرف مائل تھے۔ ان کے گھر میں ان کا کمرہ "دارالاحمر" کہلاتا تھا جہاں انقلاب کے نہ جانے کتنے خواب بنے جاتے تھے۔ ان کے کمرے میں ہمیشہ سردار بھگت سنگھ کی تصویر آویزاں نظر آتی تھی۔ وہ بھی دہشت پسند بننا چاہتے تھے۔ آسکر وائلڈ اور وکٹر ہیوگو کے انقلابی ڈراموں کے ترجمے، گورکی کے افسانوں کے ترجمے، آتش پارے کی کہانیاں، روسی شاعری اور سرخ انقلاب پر ان کے مضامین، بنجارہ اور (MUD) مڈ جیسی فلمی کہانیاں منفکر اور کامریڈ سعادت حسن منٹو جیسے فلمی نام اور درجنوں واقعات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ اشتراکیت سے کس قدر قریب تھے لیکن ان کی انانیت نے ان کے دشمن پیدا کر دیئے اور وہی لوگ جو ان کے فن کے مداح ہونے کے باوجود ان کی مخالفت کرنے پر مجبور تھے لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ لوگ بھی ان کے بارے میں کوئی مجموعی رائے قائم نہ کر سکے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میکسم گورکی اور اشتراکی شاعری کا یہ عاشق انتہا پسندوں کی زیادتیوں سے تنگ آ کر اُن کے خلاف لکھنے لگا۔

اپنی انانیت کے باوجود منٹو ایک بڑے انسان دوست تھے۔ وہ حقائق کے سب سے بڑے ترجمان تھے۔ انہوں نے اپنے بعض دوسرے ہمعصروں کی طرح تلخ حقائق کو حریری پردوں میں لپیٹ کر پیش نہیں کیا۔ وہ سفید کو سفید اور سیاہ کو سیاہ کہنے کے قائل تھے۔ اس ضمن میں اُن کا یہ بیان خاص طور سے قابلِ توجہ ہے:-

"زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیئے۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔"

منٹو تقسیم ملک کے وقت بمبئی میں تھے۔ تقسیم نے جو حالات پیدا کر دیئے تھے۔ اس سے ان کا ذہن شل ہو چکا تھا۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کی مصنوعی تقسیم کو دل سے قبول نہیں کر چکے تھے۔

وہ اپنے آپ کو اس عظیم ہندوستان کا وارث سمجھتے تھے جہاں اُنہوں نے اُن کے بزرگوں نے اور ہندوؤں اور مسلمانوں نے آنکھ کھولی تھی۔ دکھ اور سکھ بانٹ لئے تھے۔ ایک کلچر اور ایک تہذیب کو گلے لگایا تھا منٹو اُن لاکھوں کروڑوں لوگوں کی نمائندگی کرتے تھے جو سارے ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے تھے۔ منٹو نے اپنی تحریروں میں اس مصنوعی پن کے خلاف احتجاج کیا جو اب پیدا کیا گیا تھا۔ انہیں اس سرزمین سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی جو اب بنا تھا۔ اور حقیقت بن چکا تھا۔ اپنے مضمون مُرلی کی دھن میں لکھتے ہیں :-

" اب اس خطۂ زمین کو نئے نام نے کیا بنا دیا تھا۔ اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ اپنی حکومت کیا ہوتی ہے۔ اس کی تصویر کوشش کے باوجود میرے ذہن میں نہیں آتی تھی "۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ افراط و تفریط کا عالم تھا۔ لوگوں پر جنون سوار تھا۔ ایک تہذیب اور ایک کلچر کا تصور پاش پاش ہو چکا تھا۔ اسلام اور ہندو دھرم کے تقدس کے نام پر لاشوں کے ڈھیر لگ رہے تھے۔ عصمتوں کا بیوپار ہو رہا تھا بچوں کے قہقہے لُٹ رہے تھے۔ برصغیر کے دونوں حصوں میں انسان جس جنون اور حیوانیت کا شکار تھا اس کی ایک جھلک منٹو کے الفاظ میں ملاحظہ ہو :-

" ہندوستان آزاد ہو گیا۔ پاکستان عالم وجود میں آتے ہی آزاد ہو گیا تھا لیکن انسان ان دونوں مملکتوں میں غلام تھا۔ تعصب کا غلام، مذہبی جنون کا غلام، حیوانیت اور بربریت کا غلام "۔

ایسی سہمی فضا میں سنبھل سنبھل کر رہنا بڑے دل اور بڑے دماغ کا کام تھا۔ سعادت حسن منٹو کی عظمت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ نہ آگ اور خون کے اس سمندر میں انسانیت کی قندیل جلائے ایک چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔ مضبوط اور غیر متزلزل۔

منٹو کے مُرشد ۔ باریؔ

منٹو کی آرٹ گیلری میں ان لوگوں کی تصویریں نمایاں مقامات پر ملتی ہیں۔ جن سے وہ ملے تھے۔ ان کی فن کار آنکھوں نے بڑی گہرائی سے ایسے لوگوں کا اندر باہر پڑھ لیا تھا اور بڑی خلوص نیتی اور دیانتداری کے ساتھ ان کی تصویریں کاغذ پر اتاری تھیں۔ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے اپنی نفسیاتی بصیرت کو بھی بروئے کار لایا ان کے باطن کی بے پناہ پیچیدہ پرتوں کو کھرچ کر ان کے اندر جھانکا تھا اور ان کی سرشت کی اصل کو کھوج نکالا تھا۔ منٹو کا یہی کمال ہے کہ انہوں نے داخل اور خارج دونوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ لوگوں کے اس بے پناہ ہجوم میں سے جس میں وہ گھسے ہوئے تھے اور جس کو وہ ٹکر ٹکر دیکھتے رہے تھے' بہت سے ایسے تھے جن کو انہوں نے پسند نہیں کیا۔ سپاٹ' یک رخے' بے رنگ' زندگی کی تب و تاب سے خالی لوگ۔ انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کا بھی کھل کر اظہار کیا ہے۔ محض جذباتی فیصلے صادر نہیں کیے ہیں بلکہ اسباب بھی بتائے ہیں ــــ اور پھر ایسے بھی لوگ ہیں۔ جن سے وہ بے حد متاثر تھے اور منٹو جیسا سر پھرا' بڑے خلوص اور

انکسار کے ساتھ اس کا اظہار کرتا ہے اور ایسے لوگوں کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے۔ ایسی ہی ایک شخصیت غلام باری ہیں۔ جو اردو دنیا میں باری (علیگ) کے نام سے مشہور تھے۔ انہیں منٹو باری صاحب کہتے تھے۔ یہ انانیت پسند اور خود سر منٹو کے خلوص کی صداقت اور بصیرت کا کھرا پن ہے کہ وہ ان کو اپنا گورو، اپنا مرشد، اپنا رہنما اور اپنا محسن کہنے سے عار نہیں کرتے۔ یہ منٹو کا کوئی پینترا نہیں اور نہ ٹوپی سے خرگوش نکالنے والی بات ہے۔ جس کا انہیں الزام دیا گیا ہے۔

باری (علیگ) اشتراکی ادیب تھے۔ اشتراکیت ان کا جزو ایمان تھا۔ اس کا ثبوت ان کے بے شمار مضامین ہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں بھی اسی نظریے کے زیر اثر لکھیں۔ ان میں انقلاب فرانس، کمپنی کی حکومت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ باری زندگی بھر انگریزی سامراج کی دھجیاں اپنی تحریروں میں اڑاتے رہے۔ لیکن عمر کے آخری حصے میں برطانوی حکومت کے محکمہ اطلاعات میں ملازمت قبول کرلی۔ جس کا لوگوں نے بھر بھر کر مذاق اڑایا۔ باری بڑے جذباتی تھے۔ ساری عمر سرخ انقلاب کے خواب دیکھتے رہے اور بند کمروں میں اشتراکیت پر لمبی چوڑی تقریریں کرتے رہے۔ وہ کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں تھے۔ راقم السطور نے ان کے کئی معاصرین سے ان کے بارے میں استفسار کیا لیکن کوئی خاطر خواہ جواب نہ مل سکا۔[1]

غلام باری کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ خود ان کے ایک مضمون "چند مہینے امرتسر میں" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لائل پور کے رہنے والے تھے اور ایک بزرگ حکیم نورالدین کی شفقت کا سایہ ان پر ہمیشہ رہتا تھا۔ جو اکثر ان کو پاس بلاکر انہیں علم و فضل سے روشناس کراتے۔ حکیم صاحب سیاست سے بھی ذہنی مناسبت رکھتے تھے۔ اکثر نوجوانوں کو سیاسیات حاضرہ پر لیکچر دیا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک

[1] منٹو کے لنگوٹیے، باری مرحوم کے شاگرد اور اردو کے نامور ادیب ابوسعید قریشی نے راقم السطور کے استفسار پر بتایا کہ باری ایک تخیل پرست رومانٹک مزاج کے شخص تھے۔ جو کسی پارٹی یا تیقن (CONVICTION) کے تابع نہیں تھے۔ وہ حد درجہ ٹوٹے ہوئے مایوس صحافی لیکن ایک ابھرتے ہوئے مورخ ضرور تھے اور گبن (GIBBON) کی تحریروں سے بے حد متاثر تھے۔

گفتگو میں مارچ ۱۹۳۳ء کے آس پاس حکیم صاحب نے باری کو مساوات نام کے اخبار کے حوالے سے کہا کہ امرتسر کے ایک صاحب غازی عبدالرحمٰن اخبار جاری کرنے والے ہیں اور ان کی یعنی باری صاحب کی خدمات کے طالب ہیں۔ باری صاحب اس وقت تک صحافت کا معمولی تجربہ رکھتے تھے اور آئے دن ان کے مضامین اخباروں میں شایع ہوتے تھے۔ لیکن اس معمولی سی کائنات پر امرتسر کی مقابلتہً وسیع دنیا میں داخل ہونا ایک بڑے حوصلے کا کام تھا۔ حکیم نورالدین کی یہ گفتگو باری صاحب کے لئے ایک تازیانہ ثابت ہوئی اور وہ لائل پور سے امرتسر پہنچے۔ باری صاحب کو امرتسر سے جذباتی لگاؤ تھا۔ چند سال پہلے یہاں جلیاں والا باغ کا خونین سانحہ پیش آیا تھا جہاں صدہا لوگوں کا قتل عام ہوا تھا۔ جس نے سارے ہندوستان کو ہلا ڈالا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی باری صاحب ایک کربناک بے چینی محسوس کرتے۔ امرتسر میں باری نے حاجی لق لق کی معاونت کے ساتھ "مساوات" کی ادارت سنبھالی۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات بڑے ڈرامائی انداز میں نوجوان سعادت حسن منٹو سے ہوئی۔ یہ زمانہ منٹو کی حد سے بڑھی ہوئی آوارہ گردی کا زمانہ تھا۔ ان کی چلبلی طبیعت میں پہاڑوں سے ٹکرانے کی کیفیت تھی۔ ابھی منٹو کے تخلیقی سفر کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ باری نے ایک سینما کا پاس منٹو کو اس شرط پر دیدیا کہ دوسرے دن فلم کے بارے میں اپنے تاثرات لکھ دیں۔ منٹو نے اپنا وعدہ نبھایا اور اس طرح سے "مساوات" کے فلمی کالم نے منٹو کے روپ میں جنم لیا۔ باری صاحب نے اس حادثے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

> "اگلے دن مساوات میں ہمارے فلمی نامہ نگار کے قلم سے جو چند سطریں شایع ہوئیں ان سے میرا دست خوش دکھائی دیتا تھا۔ اس واقعہ کو ۱۶ سال گزر چکے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان سطروں کی اشاعت ہی نے سعادت کے اندر چھپے ہوئے افسانہ نگار منٹو کو بیدار کیا تھا"
>
> (اردو ادب لاہور نمبر ۲ ص ۲۴)

منٹو نے خود اس واقعہ کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ البتہ اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کو ادب کے راستے پر ڈالنے والے باری ہی تھے۔ ان کے مضمون "اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں" کا یہ اقتباس دیکھئے:۔

"آج کل میں جو کچھ بھی ہوں۔ اس کو بنانے میں سب سے پہلا ہاتھ باری صاحب کا ہے۔ اگر امرتسر میں ان سے ملاقات نہ ہوتی اور متواتر تین مہینے میں نے ان کی صحبت میں نہ گزارے ہوتے تو یقیناً میں کسی اور ہی راستے پر گامزن ہوتا"

(گنجے فرشتے ص ۶۲)

ایک سچے فن کار کی طرح منٹو اپنی تنقید اور محاسبہ خود کرتے ہیں اور اپنی آوارہ گردی اور منفی رجحانات کا ذکر تفصیل سے خود کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا اظہار کرنے میں نہیں جھجکتے کہ اس آوارہ جنوں کی تہذیب کرنے میں باری کا ہی ہاتھ تھا۔ منٹو نے انہیں ہمیشہ اپنا رہنما، اپنا ہمدرد اور اپنا مرشد تسلیم کیا ہے۔

- "اشتراکی ادیب باری ہمارے گرو تھے"۔

(گنجے فرشتے ص ۱۰۳)

- "باری صاحب نے جب میرے اور حسن عباس دونوں کے گرو تھے"۔

(گنجے فرشتے ص ۱۰۲)

منٹو کے دوست ابو سعید قریشی بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

- "اس بزرگ کا نام باری علیگ ہے۔ اس کے مریدوں کے نام ہیں سعادت حسن منٹو، حسن عباس اور ابو سعید قریشی"۔

(منٹو ص ۳۰)

انانیت کا مارا ہوا منٹو، جس کی گردن کہیں پر بھی خم نہیں ہوئی ہے، باری کے احسان سے جھک

جاتی ہے۔ وہ صرف گرد کہنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اور بھی کئی باتیں کہتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"یہ حقیقت ہے کہ مجھے تحریر و تصنیف کے راستے پر ڈالنے والے
وہی تھے۔ اگر امرتسر میں ان سے میری ملاقات نہ ہوتی تو ہو سکتا
ہے کہ میں ایک غیر معروف آدمی کی حیثیت میں مر کھپ گیا
ہوتا یا چوری، ڈکیتی کے جرم میں لمبی قید کاٹ رہا ہوتا"

(گنجے فرشتے ص ۲۴)

یہ اعتراف اپنی جگہ ـــــ لیکن منٹو کی اپنی صلاحیت اور اپنے ذوق و شوق کی کارفرمائی کو صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ جب منٹو باری صاحب کے دفتر میں حاضر ہوتے تو وہ ان سے ایک آدھ خبر کا ترجمہ کرواتے۔ منٹو اس بات کے باوصف کہ انہیں زبان و بیان کے رموز معلوم نہیں تھے اور نہ اس کے جادو سے واقف تھے ایسا کرنے سے کتراتے بھی نہیں تھے اور اپنی بساط کے مطابق ترجمہ کر ہی دیتے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے خبروں کا ایک کالم سنبھال لیا۔ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ منٹو کے ساتھیوں نے ان کے ترجموں کی یہ کوششیں یہ کہہ کر رد کردیں کہ یہ محض خرافات ہے۔ لیکن باری نے ان کے دوستوں کے یہ تبصرے جھٹلا دیئے اور منٹو کی صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے کہا ـــــ "بکواس کرتے ہیں تم اب طبع زاد مضمون لکھنے شروع کردو"

غلام باری کی جہاں دیدہ نگاہوں نے شروع میں ہی اس آوارہ گرد اور خود سر نوجوان کی آنکھوں میں اس کی ذہانت پڑھ لی تھی۔ اس لئے مساوات کی کالم نویسی سے قطع نظر باری نے منٹو کو جواب تیرتھ رام فیروز پوری کے جاسوسی ناولوں کے ترجموں سے دلچسپی لینے لگے تھے ڈکٹر ہیوگو کی طرف متوجہ کیا۔ ہیوگو فرانس کا نامور شاعر، ڈرامہ نگار اور فکشن رائٹر ہوا ہے۔ اور نہ صرف اس کے موضوعات بلکہ اس کا انداز تحریر باغیانہ ہے۔ باری کے کہنے پر منٹو نے ہیوگو کی بقول باری "گرم" کتاب "LAST DAYS OF A CONDMNED" کا ترجمہ "پھانسی ـــــ ایک اسیر کی سرگذشت

کے عنوان سے کیا۔ اس ترجمے کی تصحیح باری نے خود کی، ادب کی دنیا میں یہ منٹو کا پہلا پڑاؤ تھا۔ باری کے کہنے پر ابو سعید قریشی، حسن عباس، اور منٹو تینوں نے وکٹر ہیوگو کی تخلیقات کو درسی کتابوں کی طرح پڑھنا شروع کیا۔ باری صاحب ہیوگو کو دنیا کا سب سے بڑا ناول نگار سمجھتے تھے۔ وہ اس کی مشہور تصنیف "لی میزریبل" (LEE MISERABLE) کا ترجمہ بھی کروانا چاہتے تھے۔ لیکن اس کی ضخامت کے پیش نظر منٹو نے اس کا ارادہ ترک کیا۔

باری ایک خاص مقصد کے پیش نظر منٹو سے ترجمہ کروانا چاہتے تھے۔ باری کا بنیادی مقصد اشتراکی اور انقلابی ادب کو اردو میں منتقل کروا کر اسے فروغ دینا تھا۔ اس لئے اب جس کتاب پر قرعہ فال پڑا وہ آسکر وائلڈ کا اشتراکی خیالات پر استوار ایک ڈراما "ویرا" تھا۔ منٹو نے بڑی محنت سے اسے اردو میں منتقل کیا۔ اس کی تصحیح باری صاحب نے کی۔ لیکن اب گزشتہ تجربوں سے منٹو کا ذہن کچھ منجھ گیا تھا۔ اس لئے وہ باری صاحب کی روا روی میں کی ہوئی اس تصحیح سے قطعاً مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے اختر شیرانی کی طرف رجوع کیا۔

باری اشتراکی تھے۔ وہ لائل پور کے رہنے والے تھے۔ شہید اعظم بھگت سنگھ کا تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا یہیں باری ان سے ملے تھے۔ اس لئے ان سے متاثر ہونا قابل فہم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ باری کے انقلابی اور باغیانہ خیالات اور رویے ان کی ہی صحبت کا اثر ہوں اور باری کے ایسے خیالات کی چھاپ ان کے چیلوں اور خصوصاً سعادت حسن منٹو کے ذہن پر تھی۔ دارالاحمر میں بھگت سنگھ کا لگا ہوا بت، ویرا کی اشاعت کے بعد بقول ابو سعید قریشی بھگت سنگھ اور دت کے چیلوں (یعنی منٹو اور ان کے دوستوں) کے بارے میں پولیس کی پوچھ گچھ اور برسوں بعد منٹو کا سردار جعفری کو علی گڑھ میں بھگت سنگھ پر مضامین فراہم کرنا باری علیگ کے راست اثر کا نتیجہ ہے۔ باری کمیونسٹ تھے لیکن پارٹی کے کارڈ ہولڈر نہیں تھے۔ وہ انگریزی سامراج کے زبردست مخالف تھے۔ اسی نفرت کا رد عمل ان کی کتاب "کمپنی کی حکومت" جیسی باغیانہ کتاب تھی۔ جس میں ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اور اس کے اثرات

کا مطالعہ ایک انقلابی زاویہ نگاہ سے کیا گیا ہے۔

باری تاریخ اور معاشیات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لئے ان کی تحریریں ان ہی موضوعات پر مبنی ہوتی تھیں۔ انقلاب فرانس اور کمپنی کی حکومت ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ جن کا موضوع بنیادی طور پر تاریخ ہے۔ لیکن ان میں فرانس کے انقلاب اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو ایک معاشی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ باری صاحب زاہد خشک نہیں تھے۔ فکشن سے دلچسپی نہ ہونے کے باوصف وہ اپنے شاگردوں کی چیزیں پڑھا بھی کرتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ ابوسعید قریشی کا بیان ہے:۔

"باری صاحب تاریخ و معاشیات کے طالب علم تھے۔ انہیں افسانوی ادب سے کچھ ایسا شغف نہیں تھا۔ مگر ایسا بھی نہیں کہ وہ اپنے مریدوں کو اچھے برے کی پہچان نہ بتا سکتے ۔۔۔۔"

(منٹو ص ۴۰)

اتنا ہی نہیں۔ باری صاحب نے منٹو کی حوصلہ شکنی کے خوف سے کبھی ان کی اغلاط بھی نہیں بتائیں۔ منٹو جب، باضابطہ طور پر لکھنے لگے اور ان کی چیزیں چھپنے لگیں۔ ان کے ترجمے شایع ہونے لگے تب ان کے احباب محض حسد سے ان کا مذاق اڑانے لگے۔ لیکن باری نے کبھی منٹو کو ان کی کوتاہیاں نہ بتایں۔ جس سے ان کا نقصان ہوا۔ "ویرا" کے ترجمے کی اصلاح اختر شیرانی سے کرانے کا باعث باری کی یہی مصلحت آمیز کم توجہی تھی۔ منٹو نے اس کا ذکر خود کیا ہے:۔

"ان دنوں میرے جاننے والے ازراہ تمسخر میری سُقیم تحریروں پر خوب ہنسا کرتے تھے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ باری صاحب نے جن کو میری محدود علمیت کا پتہ تھا میری ہمیشہ حوصلہ افزائی کی یہاں تک کہ مجھے میری اغلاط سے بھی کبھی روشناس نہ کیا۔ وہ کہا کرتے تھے۔ سب ٹھیک ہے۔"

(گنجے فرشتے ص ۱۰۷)

سب کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ لیکن منٹو کا اعتماد نہیں ڈگمگایا۔

اب باری نے منٹو اور ان کے احباب کو اپنے حلقے میں باندھ لیا تھا۔ یہ ۱۹۳۳ء کا زمانہ تھا۔ جب منٹو صرف ۲۱ سال کے نوجوان تھے۔ باری اب مستقل طور پر منٹو کے گھر آنے جانے لگے۔ جہاں سب سے نمایاں جگہ منٹو کا کمرہ تھا۔ جس کی دیواروں پر اب فلمی اداکاروں اور اداکاراؤں کی تصویروں کے بجائے روسو، مارکس، لینن، ٹراٹسکی، اسٹالین، گورکی، والٹیر وغیرہ کی تصویریں لٹکی رہتی تھیں۔ اپنی افتاد طبع کے مطابق باری نے ہی اس کمرے کا نام "دارالاحمر" تجویز کیا تھا اور اسی کمرے میں انقلاب کے خواب دیکھے جانے لگے۔ یہاں اس کمرے میں باری اور ان کے تینوں شاگرد منٹو، عباس، اور ابوسعید قریشی، نے مہینوں اپنا مستقل مستقر بنالیا۔ خود منٹو کی تحریروں میں اس کمرے نے ایک کردار کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ باری کا تجویز کیا ہوا یہ نام "سرخ گھر" نہ صرف خود ان کے ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ بلکہ اس سمت کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ جس پر یہ لوگ جارہے تھے۔ یہیں بیٹھے بیٹھے باری نے اپنی پہلی کتاب "انقلاب فرانس" کے صفحوں کے صفحے تحریر کیے۔ یہیں باری اپنی بھاری بھر کم آواز میں دوسرے مباحث پر کارلائل اور گبن کے انداز استدلال میں گفتگو کرتے تھے۔ اس کمرے میں تینوں دوست اپنے رہنما کے ساتھ بیٹھ کر افسانے اور مضامین لکھتے تھے۔ جو چیزیں تیار ہوتیں وہ کسی کے نام سے بھی چھپ سکتی تھیں۔ یہیں سرگزشت اسیر اور ویرا کے ترجمے باہمی اشتراک سے ہوئے۔ اور جب یہ چیزیں چھپ کر آئیں تو سب سے زیادہ خوشی باری صاحب کے حصے میں آئی۔

دارالاحمر میں کسی کے آنے جانے کی پابندی نہیں تھی۔ باری نے اپنے مضمون میں واضح طور پر لکھا ہے کہ "کمرے کے دروازے چوبیس گھنٹے کھلے رہتے تھے۔ اس کمرے میں آنے جانے والوں پر اس کے سوائے اور کوئی پابندی نہیں تھی کہ وہ اندر داخل ہوتے یا باہر نکلتے وقت دوسرے کے کام میں مخل نہ ہوں۔"

باری مستقل مزاج نہ تھے۔ اس بات کے لیے ان کے تینوں شاگرد ان سے شاکی تھے۔ سوچنے کی حد تک ان کا سکیم باز دماغ بڑی بڑی سکیمیں سوچا کرتا تھا۔ لیکن جب ان پر عمل آوری

کا موقعہ آتا اور ان میں خطرے کا کوئی پہلو نکل آتا تو وہ غایب ہو جاتے تھے۔ جبھی منٹو ان کو "رن چھوڑ" کہتے تھے۔ جب "ویرا" شایع ہوئی تو باری نے خود اس کا ایک ہنگامہ خیز قدِ آدم اشتہار تیار کیا۔ اشتہار جلی حروف میں اس طرح لکھا ہوا تھا۔

مستبد اور جابر حکمرانوں کا عبرت ناک انجام

روس کے گلی کوچوں میں صدائے انتقام

زاریت کے تابوت میں آخری کیل

جب یہ اشتہار لاہور کی دیواروں پر چسپاں ہوا تو چاروں طرف چہ میگوئیاں ہونے لگیں خطرہ پیدا ہوا کہ کتاب ضبط کی جائیگی اور مترجمین کو گرفتار کیا جائے گا۔ منٹو اور حسن عباس کے لئے یہ دلچسپ تجربہ تھا۔ لیکن ان کے مرشد ایسی باتوں سے گھبراتے تھے۔ اس لئے اس افواہ کے اڑتے ہی وہ غایب ہو گئے۔

باری صاحب کی سکیم بازی کا ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک اور دلچسپ بات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ باری صاحب کبھی اپنی کسی سکیم کو عملانے کی منزل تک پہنچانے سے پہلے ہی بھاگ جاتے تھے وہ انگریزوں کو ملک بدر کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا اخلاق ذہن عجیب و غریب منصوبے تیار کرتا۔ ابو سعید قریشی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"مستبد حکمرانوں کا تختہ الٹنے والوں کی آئینوں میں ہمیں اپنا عکس نظر آرہا تھا۔ ہم نے اپنی چشمِ تصور میں امرتسر کے گلی کوچوں کی باہا مورچہ بندی کی اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے انگریزوں پر ٹوٹ پڑے۔ انہیں رود بار انگلستان تک دھکیلتے ہوئے لے گئے یا جوج ماجوج کی طرح قید کر دیا تاکہ پھر دنیا کو تاخت و تاراج نہ کر سکیں اور عظمت افرنگ کے لازوال آفتاب کو تانبے کے پرانے پیسے کی طرح گردش سے

نکال پھینکا۔۔۔"

(منٹو۔ ص ۳۱)

لیکن یہ سب کاغذی گھوڑے تھے۔ وہ ذہنی اور نظریاتی اعتبار سے لاکھ انقلابی اور باغی سہی عملی زندگی میں بے عمل تھے۔ بے عمل ہی نہیں بزدل تھے۔ اس بزدلی کی تصویر منٹو کے لفظوں میں یاد دیکھیے۔

"باری صاحب بزدل تھے۔ خدا کی قسم بہت بزدل تھے زیادہ کھالیتے تو ڈرتے رہتے تھے کہ انکی توند نہ نکل آئے گی حالانکہ فاقوں کے زمانے میں بھی ان کے جسم کا یہ حصہ بڑھتا رہا۔ زیادہ تیز بھاگتے نہیں تھے کہ ان کے دل پر اس کا اثر پڑے...... بڑی بڑی سرخ بغاوتوں کے نیلے نقشے تیار کرتے تھے۔ اور پٹاخے کی آواز سن کر زرد ہو جاتے تھے......"

(گنجے فرشتے ص ۱۱۰)

باری صاحب کا بیشتر وقت اپنے شاگردوں اور چیلوں کے ساتھ دارالاحمر میں گزرتا تھا۔ انہوں نے اس مکتبہ فکر کو جس کے ساتھ ان کے تین چیلوں کی تثلیث وابستہ تھی۔ دارالاحمر سکول آف تھاٹ (DAR-UL-AHMAR SCHOOL OF THOUGHT) کا نام دیا تھا۔ اس گروپ کو وہ فری تھنکرس (FREE THINKERS) بھی کہا کرتے تھے۔ اس کے قواعد ضوابط اس گروپ سے تعلق رکھنے والے ان چار نوجوانوں پر منطبق تھے۔ یہ قواعد و ضوابط حماقتوں کا مجموعہ تھا۔ چند موٹے موٹے اصول یوں تھے۔

(۱) "کم سے کم دو ممبر مل کر دوپہر کے وقت ہال بازار کا چکر کاٹیں

(۲) راستے میں ایک دوسرے سے بات نہ کریں۔ غیر ممبروں سے بات چیت کرنے کی اجازت ہوگی۔

(۳) ہر ممبر کے لئے ضروری ہے کہ وہ گرمیوں میں فلالین کا پتلون اور خاکی قمیص پہنے۔

(الف) دن میں ایک مرتبہ بازار میں کھانا کھائے

(ب) سال میں صرف چار مرتبہ بازار میں کھانا کھائے

رج) لسی نہ پیئے۔

(د) مہینے میں ایک مرتبہ کسی غیر ممبر کو بے وقوف بنائے"

(اردو ادب لاہور ص ۲۶)

فری تھنکرس کے اس حلقے کا مقصد احمقانہ سرگرمیاں کر کے لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرانا تھا۔ منٹو کے ساتھ عام طور پر افواہیں پھیلانا منسوب ہے۔ دراصل یہ سرگرمی بھی اسی حلقے کی تفویض کی ہوئی تھی۔ چنانچہ ان کے ساتھ ٹریفک کے سپاہیوں کے برف کے کوٹ کا جو مذاق منسوب ہے۔ اس کی تصدیق خود باری صاحب اس مضمون میں کرتے ہیں۔

شیراز ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے ایک بار منٹو کو ایک عجیب مذاق سوجھا۔ چنانچہ اپنے ایک دوست عاشق فوٹو گرافر کو یہ باور کرایا کہ لاہور میں ٹریفک پولیس والوں کو برف کے کوٹ پہنائے گئے ہیں۔ ان کا دوست یہ منظر دیکھنے کے لئے واقعی امرتسر سے لاہور چلا گیا اور وہاں برف کے کوٹ پہنے سپاہی نہ پاکر مایوس ہوا اور واپس آکر سعادت سے گتھم گتھا ہوا۔

یہ دراصل باری کے دماغ کی اختراع تھی۔ اور جیسا کہ ذکر ہوا مہینے میں ایک مرتبہ کسی غیر ممبر کو بے وقوف بنایا جائے۔ اس لئے منٹو نے احمق سازی کا یہ ڈرامہ رچایا تھا۔ اسی زمانے میں منٹو کا مشہور مذاق زبان زد عام ہوا تھا۔

"میرا قلم گدھے کے سینگ کا بنا ہوا ہے۔"

باری صحافی تھے ایک ناکام صحافی۔ کئی اخبارات کے ساتھ وابستہ رہ چکے تھے۔ "خلق" کے نام سے اپنا ایک رسالہ جاری کیا تھا۔ جس میں منٹو کا اولین افسانہ "تماشا" آدم کے فرضی نام سے شایع ہوا تھا۔ لیکن اس پرچے کے صرف دو شمارے شایع ہوئے۔ باری اس پیشے سے بے حد متنفر تھے۔ اس لئے کہ وہ زندگی بھر نا آسودہ رہے۔ یہاں پیٹ بھرنا بھی محال تھا۔ ان کے ذہن میں کتنے

ہی منصوبے تھے۔ ان کے تخیل کی آنکھ بڑے بڑے کارناموں کی شبیہہ دیکھ لیتی تھی لیکن ان کا کوئی خواب پورا نہ ہوا۔ اس لئے وہ اخبار نویسی کو ترک کر کے چارہ کاٹنے کی مشین لگانا چاہتے تھے۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنے شاگردوں سے بھی کیا تھا۔ برسوں تک منٹو کو باری صاحب کا یہ خیال تڑپاتا رہا۔ آخر آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران اسی خیال کو انہوں نے ڈرامائی روپ دیا۔ جو دہلی سے نشر ہوا یہ ڈراما "جرنلسٹ" تھا۔ اس پر اردو کے صحافتی حلقوں میں ہنگامہ ہوا۔ لیکن اس میں نہ صرف باری کا بلکہ باری کے توسط سے صحافت سے وابستہ تمام ایسے لوگوں کے المیے کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک مکالمہ:-

> "آپ قوم کی خدمت کرتے ہیں۔ میں قوم کی اور اخبار کی خدمت کرتا ہوں۔ لیکن اس خدمت کا معاوضہ مجھے وقت پر کبھی نہیں ملتا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ملتا ہی نہیں۔ چار مہینے میں آپ نے مجھے صرف سولہ روپے دیئے۔ خدا کا خوف کیجئے، میں انسان ہوں پتھر نہیں ہوں۔ مجھے بھوک بھی لگتی ہے۔ کبھی کبھی مٹھائی کھانے کو بھی جی چاہتا ہے۔ مجھے آپ نے اس اخبار کا ایڈیٹر بنایا تھا۔ سنیاسی یا سادھو نہیں بنایا تھا۔ جو میں نے دنیا تیاگ دی ہو"

{ جرنلسٹ / منٹو کے ڈرامے }

یہ صورت حال اس وقت صرف ایک باری کی نہیں تھی۔ اردو اخباروں میں کام کرنے والے کتنے ہی قلم کار اسی طرح بدحال تھے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس ڈرامے کا مرکزی کردار عبدالباری ہے۔ جو ظاہر ہے باری علیگ ہی ہیں۔

بغاوت کے آداب سکھانے والا یہ اشتراکی ادیب زندگی کے آخری ایام میں شکست کھا گیا۔ منٹو کو اس بات کا بے حد قلق تھا۔ منٹو نے خود بدترین حالات میں بھی اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ زندگی بھر انگریزی راج کے خلاف احتجاج کرنے والا اشتراکی ادیب آخری دنوں

میں انگریزوں ہی کے ہائی کمشنر کے شعبۂ اطلاعات میں ملازمت اختیار کرتا ہے۔ منٹو کیلئے ایک ناقابل یقین بات تھی لیکن یہ حقیقت ان کے سامنے کھڑی ہو کر ان کا منہ چڑا رہی تھی۔ سعادت حسن منٹو نے آخر کار اسے قبول کر ہی لیا اور دل مسوس کر کے بیٹھ گئے۔ لیکن باری صاحب کے لئے جو والہانہ محبت اور گہری عقیدت انہیں تھی اسے زندگی بھر اپنے سینے سے لگائے رہے۔ یہ منٹو کی متنازعہ فیہ شخصیت کا ایک پر وقار پہلو ہے +

منٹو گھر میں

حیدر آباد میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس میں عصمت چغتائی سے سعادت حسن منٹو کے بارے میں عجیب و غریب سوالات پوچھے گئے تھے۔ منٹو نے اس واقعے کا ذکر اپنے مضمون "عصمت چغتائی" میں کیا ہے۔ اس کے بعد بات میں سے بات پیدا کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"اگر منٹو اور عصمت کی شادی ہو جاتی تو اس حادثے کا اثر عہدِ حاضر کے افسانوی ادب کی تاریخ پر ایٹمی حیثیت رکھتا۔ افسانے افسانے بن جاتے۔ کہانیاں مُڑ تُڑ کر پہیلیاں ہو جاتیں۔ انشاء کی چھاتیوں میں سارا دودھ خشک ہو کر یا تو ایک سفوف کی شکل اختیار کر لیتا یا بھسم ہو کر راکھ بن جاتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ نکاح نامے پر ان کے دستخط ان کے قلم کی آخری

تحریر ہوتے لیکن سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ
نکاح نامہ ہوتا۔ زیادہ قرین قیاس تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح
نامے پر دونوں افسانے لکھتے اور قاضی صاحب کی پیشانی پر دستخط
کر دیتے تاکہ سند رہے"

(گنجے فرشتے ص ۲۴۴۔۲۴۵)

لیکن یہ سب ہو نہیں پایا تھا اور منٹو، عصمت آپا کو اپنی بہن سمجھتے رہے۔ منٹو اور عصمت پہلی بار اس زمانے میں ملے جب دونوں کی شادی ہو چکی تھی اور اس طرح سے لبقول منٹو یہ "حادثہ" ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

منٹو کے لنگوٹیے ابو سعید قریشی کا بیان ہے کہ ۱۹۳۸ء کے دوران امرتسر میں یہ افواہ زوروں پر تھی کہ منٹو بمبئی میں کسی فلم ایکٹریس کے چکر میں پھنس کر اس سے شادی کر رہا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ کچھ عرصہ پہلے تلاشِ معاش میں بمبئی آ گئے تھے اور یہاں ہفت روزہ "مصور" کے مدیر ہو گئے تھے۔ ان کا تعلق بمبئی کی فلمی دنیا کے ساتھ بھی قایم ہو گیا تھا اور ایک آدھ جگہ ایسا کام ملا تھا جسے فلمی دنیا کی اصطلاح میں منشی گری' کہا جاتا تھا۔ اس لئے جب ان کے عشق اور شادی کی افواہ اڑی تو یار لوگوں نے اس پر یقین کر لیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ محض ایک گپ تھی جسے کسی من چلے نے اڑایا تھا اور "ٹامی" (منٹو کے دوست اسی نام سے منٹو کو پکارتے تھے) کے احباب میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ فلم کی گلیمر زدہ دنیا میں جوانی کے دس بارہ سال گزارنے کے باوجود منٹو کا دامن کبھی داغدار نہ ہوا۔ بہت ساری اداکاراؤں کے ساتھ مراسم ہونے کے باوصف کبھی کسی نے منٹو کو مشکوک نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ ان کے پورے کردار کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ایک عام اور پرامن شہری کی زندگی پسند تھی۔ انہوں نے بے تحاشا شراب پی لیکن کسی غیر عورت کے ساتھ ان کے تعلقات رہے ہوں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ وہ کوٹھوں پر بسا اوقات جاتے تھے طوائفوں کے ساتھ مراسم تھے جن کے درد کو انہوں نے انتہائی ایمان داری، خلوص اور جذبے کی صداقت کے

ساتھ اپنے افسانوں اور دوسری تحریروں میں جستہ جستہ آتار لیا۔

۱۹۳۸ء ہی کے دوران ان کی والدہ بھی امرتسر سے بمبئی چلی گئی تھیں اور اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ رہنے لگی تھیں۔ منٹو اس قابل نہیں تھے کہ ماں کو اپنے ساتھ رکھ لیتے۔ اپنے بہنوئی کے ساتھ بھی ان کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اس لئے وہ الگ سے نو روپے ماہوار کی ایک کھولی میں رہتے تھے۔ منٹو کی والدہ جب بیٹے سے ملنے آئیں تو بیٹے کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر تڑپ اٹھیں اور تبھی انہوں نے سعادت کی زندگی سنوارنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ شادی ہی ان کے بیٹے کو اس مصیبت سے چھٹکارہ دلوا سکتی ہے۔ سعادت سے شادی کی رضامندی پا کر انہوں نے ایک کشمیری گھرانے میں ان کی شادی پکی کرلی۔ ان کے دوست ابوسعید قریشی نے جب متذکرہ بالا افواہ اور شادی کے تعلق سے استفسار کیا تو منٹو نے ان کو لکھا:۔

"تم نے صحیح سنا ہے کہ میری شادی ہو رہی ہے اور غلط سنا ہے کہ فلم ایکٹریس سے۔ میری ہونے والی بیوی ایک سیدھی سادی گھریلو لڑکی ہے۔ میری طرح وہ بھی عینک لگاتی ہے اور اس کی ماں بھی عینک لگاتی ہیں"

(منٹو ص ۹۲)

منٹو کی ہونے والی بیوی کا نام صفیہ تھا۔ ان کا تعلق ایک کشمیری الاصل خاندان سے تھا۔ یہ خاندان عرصہ دراز تک جنوبی افریقہ میں رہ چکا تھا۔ صفیہ کے والد افریقہ میں پولیس انسپکٹر تھے جہاں کسی حبشی نے ان کو ایک بلوے میں قتل کیا تھا۔ ان کے ایک تایا خواجہ شمس الدین افریقہ کی پارلیمنٹ کے ممبر تھے اور لڑکے کو دیکھنے کے لئے افریقہ سے بمبئی آگئے۔ منٹو کے دو بڑے بھائی بھی افریقہ میں رہ چکے تھے اور برسوں تک بیرسٹری کرتے رہے تھے۔ صفیہ کے اہل خاندان ان دو بھائیوں کو جانتے تھے۔ اس لئے جب سعادت کی والدہ نے شادی کی بات چھیڑی تو انہوں نے فوراً رشتے کو پسند کیا اور کئی اچھے رشتے ٹھکرا دیئے۔ صفیہ کے خاندان والے یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ اپنی بیٹی

کی شادی کشمیری گھرانے میں طے کرلیں۔ یہ بھی ایک سبب تھا کہ انہوں نے منٹو خاندان میں رشتہ پکا کرلیا۔ عزبت کے ستائے ہوئے منٹو کو اپنی والدہ کی بات پر یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ کوئی شریف آدمی اس جیسے قلاش اور مفلس کے ساتھ اپنی بیٹی کی زندگی وابستہ کرنے کے لئے تیار ہوسکتا ہے۔ اس لئے جب والدہ کے کہنے پر وہ صفیہ کے گھر والوں سے ملے تو انہوں نے اپنی زندگی، مشاغل اور پسند ناپسند کے بارے میں سب کچھ ان کے سامنے رکھ دیا۔ اپنے مضمون "میری شادی" میں خود لکھتے ہیں:۔

"مجھے قطعاً یقین نہیں تھا کہ مجھے کوئی ہوش مند انسان اپنی لڑکی دے گا۔ میرے پاس تھا ہی کیا۔ انٹرنس پاس وہ بھی تھرڈ ڈویژن میں۔ ملازمت اپنی جگہ۔ جہاں تنخواہ کے بجائے اڈوانس ملتا تھا اور پیشہ فلم اور اخبار نویسی ـــ ایسے لوگوں کو شریف آدمی کب منہ لگاتے ہیں۔"

(اوپر، نیچے، اور درمیان ص ۵۱)

رخصتی سے قبل تک منٹو اپنی بیوی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے صفیہ کو ایک نظر دیکھا بھی نہیں تھا۔ ماں سے صرف اتنا معلوم ہوچکا تھا کہ وہ بڑی شریف، ہوشیار اور سلیقہ مند لڑکی ہے۔ واجبی طور پر پڑھی لکھی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ کشمیری ہے۔ ان کے دوست احمد ندیم قاسمی نے اسی زمانہ میں انکی بیوی کے بارے میں استفسار کیا تو منٹو نے مزے لے لے کر ان کو لکھا:۔

"میری شادی؟ ـــ میری شادی ابھی مکمل طور پر نہیں ہوئی۔ میں صرف "لنکا حیا" گیا ہوں۔ میری بیوی لاہور کے ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا باپ مرچکا ہے۔ میرا باپ بھی زندہ نہیں۔ وہ چشمہ لگاتی ہے۔ میں بھی چشمہ لگاتا ہوں۔ وہ گیارہ مئی کو پیدا ہوئی۔ میں بھی گیارہ مئی کو پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں چشمہ لگاتی ہے۔

میری ماں بھی چشمہ لگاتی ہے۔ اس کے نام کا پہلا حرف "S" ہے میرے نام کا پہلا حرف بھی "S" ہے۔ ہم میں اتنی چیزیں COMMON ہیں۔ بقایا حالات کے متعلق میں خود کچھ نہیں جانتا۔ پہلے وہ پردہ نہیں کرتی تھی مگر جب سے اس پر میرا حق ہوا ہے اس نے پردہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ (صرف مجھ سے)

(منٹو کے خطوط ص ۴۰، ۴۱)

یہ عقد مئی ۱۹۳۸ء میں ہوا تھا لیکن رخصتی کا معاملہ کافی دیر تک کھٹائی میں پڑا۔ کیونکہ سعادت ابھی اس لائق نہیں تھے کہ شادی شدہ زندگی کا بوجھ اٹھا پاتے۔ نومبر ۱۹۳۸ء کو احمد ندیم قاسمی کے نام ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

"میری اصلی شادی میں ابھی کچھ دیر ہے اس دیر کا باعث میری مالی کمزوری کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے"۔

نکاح کی رسم کے بعد بھی منٹو سمجھتے تھے کہ ان کی اصلی شادی نہیں ہوئی ہے اور یہ بات صحیح بھی ہے۔ اس رسم کے بعد بھی وہ اپنی بیوی سے مل نہ سکے۔ حتیٰ کہ اس کو دیکھا تک بھی نہیں۔ وہ ہر اتوار کو ماہم میں اپنے سسرال جایا کرتے تھے۔ دن بھر وہاں رہتے رات گئے کھانا کھا کر اپنی نو روپے والی کھولی میں چلے آتے اور پھر دل اور کھٹملوں سے لدی پھندی چارپائی پر پڑے رہتے۔ ستم ظریفی یہ کہ فلمی دنیا کا یہ کہانی کار منشی جو شب و روز خوب صورت چہرے دیکھنے کا عادی تھا ایک روایتی شوہر کی طرح اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔ غنیمت یہ تھا کہ کبھی کبھار دروازوں کی درزوں سے انہیں ایک آنچل لہراتا ہوا نظر آتا، کوئی سرگوشیاں کرتے ہوئے گزر جاتا، کبھی دبی دبی ہنسی کہیں سے رنگتی ہوئی چلی آتی۔ سعادت ان تمام حرکات و سکنات کو معنی پہناتا اور خیال ہی خیال میں نادیدہ دنیاؤں کی سیر کرتا۔ منٹو کو کبھی کبھی افسوس ہوتا تھا کہ ان سے شادی کا ڈراما کھیلا گیا ہے ـــــــ اور جب طویل اور اکتا دینے والے وقت کے تیور بدل گئے۔ منٹو کی مالی حالت کچھ بہتر ہوگئی۔ فلیٹ بدل دیا گیا۔ تب بیوی کی رخصتی کی رسم انجام پائی۔ یہ رسم ۲۶ اپریل ۱۹۳۹ء

کو ہوئی۔ ان دنوں وہ "ہندوستان سنے ٹون" نام کی فلم کمپنی میں آچکے تھے اور "اپنی نگریا" نام سے ایک فلم کی کہانی لکھ چکے تھے لیکن مالی حالت پھر بھی کچھ بہت اچھی نہیں تھی۔ برات میں بڑی بڑی فلمی شخصیتیں شامل ہوئیں لیکن منٹو کے دل میں ایک طوفان بپا تھا۔ اپنی بہن کو ٹیلی فون پر مطلع کیا:۔

"عجیب مخمصے میں گرفتار ہوں۔ برات کی تیاریاں کر رہا ہوں لیکن
جیب میں صرف ساڑھے چار آنے ہیں۔ چار آنے میں سگریٹ کی
ڈبیا آجائیگی۔ دو پیسے کی ماچس، چلو قصہ پاک ___"

(اوپر، نیچے اور درمیان ص ۶۳)

لیکن اس کے بعد بھی منٹو مالی اعتبار سے کافی دنوں تک سنبھل نہ سکے۔ وہ ایک کے بعد ایک فلم کمپنی سے علیحدہ ہوگئے اور بہتر زندگی کے خواب دیکھنے لگے لیکن اکثر کمپنیوں کے دیوالے پِٹ گئے۔ انتہائی بددل ہو کر کہنے لگے کہ نکاح ان کے لئے منحوس ثابت ہوا ہے۔

ذکر ہو چکا ہے کہ نگار خانوں کے ساتھ وابستگی کے باوجود منٹو نے ایک نارمل، پرامن اور خوبصورت ازدواجی زندگی اختیار کر لی۔ صفیہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ سہی مگر واجبی طور پر پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ وہ انتہائی شریف النفس، صابر اور قانع روایتی عورت تھیں اور منٹو کے اچھے اور برے دنوں میں ایک غمگسار اور دردمند ساتھی کی طرح ان کے ساتھ رہیں۔ دونوں کے مزاج متضاد تھے۔ لیکن شادی کے بعد ہی اس سیدھی سادی لڑکی نے منٹو کے من کو موہ لیا۔ اور وہ ایک دوسرے کا نہ ٹوٹنے والا انگ بن گئے۔ صفیہ بیگم زندگی بھر منٹو پر چھائی رہیں، یہی وجہ ہے کہ منٹو کی تحریروں میں بار بار صفیہ کا ذکر آتا ہے۔ عصمت چغتائی جب پہلی بار منٹو سے ملیں تو صفیہ موجود نہیں تھیں لیکن منٹو کی زبان صفیہ کی تعریف میں رطب اللسان تھی عصمت آپا لکھتی ہیں:۔

"چلتے وقت اس نے پھر صفیہ کا ذکر کیا۔ اتنی دیر ہم بیٹھے رہے اور
منٹو کو صفیہ کی یاد نے کئی بار ستایا۔
صفیہ بہت اچھی لڑکی ہے۔

صفیہ بہت عمدہ سالن پکاتی ہے۔

آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گے"

{ میرا دوست' میرا دشمن
نقوش منٹو نمبر ۱۹۶۸ ص نمبر ۲۹۸ }

صفیہ بیگم ایک سیدھی سادی گھریلو خاتون تھیں اور منٹو ایک کامیاب کہانی کار اور فلموں کے ساتھ وابستہ تخلیق کار جہاں نت نئے لوگوں کے ساتھ ان کا پالا پڑتا تھا۔ ایسے میں حیرت ہوتی ہے کہ وہ اس سوسائیٹی میں رہ کر کس طرح اپنی قسمت پر قانع تھے۔ دراصل ان کی سرشت میں بھی شرافت تھی یہی سبب ہے کہ وہ عشق و محبت کے معاملے میں ایک خاص نقطہ نظر رکھتے تھے۔ عورت لاکھ پڑھی لکھی ہو' کماؤ ہو' مغرب زدہ ہو' عورت عورت ہے' اس کا اپنا حسن ہے' اپنا منصب ہے اور اپنا ایک کردار ہے اور اگر وہ اپنے منصب سے گر جاتی ہے تو وہ عورت نہیں۔ خاص طور پر جب وہ ہندوستانی عورت کی بات کرتے تھے تب ان کی تحریریں مشرق کی خوشبو اور ہندوستان (غیر منقسم ہندوستان) کے عظیم کلچر کی مہک آجاتی تھی' لکھتے ہیں:-

"عورت جنگ کے میدان میں مردوں کے دوش بدوش لڑے۔ پہاڑ کاٹے' افسانہ نگاری کرتے کرتے عصمت چغتائی بن جائے لیکن اس کے ہاتھوں میں کبھی کبھی مہندی رچنی ہی چاہیئے۔ اس کی باہنوں سے چوڑی کی کھنک آنی ہی چاہیئے"

(گنجے فرشتے ص ۱۵۲)

یہی سبب ہے کہ وہ صفیہ سے عشق کرتے تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی قابلِ رشک تھی۔ اس کا اعتراف ان کے احباب بھی کرتے ہیں۔ منٹو کے عزیز ترین دوست ابو سعید قریشی رقم طراز ہیں:-

"(ان) کی گھریلو زندگی قابلِ رشک تھی۔ امن و آشتی اور باہمی سمجھوتے کی ایسی فضا کم ہی گھروں میں ہوگی۔ یہ نہیں کہ میاں بیوی میں کبھی چیخ

نہیں ہوتی ۔ ہوتی تھی اور اکثر ہوتی تھی لیکن وہ ایک دوسرے کا
احترام کرتے تھے ۔ وہ صفیہ تھی اور وہ سعادت صاحب ۔ ان کی
چخ ان کی چاہت کے لئے چاٹ کا کام دیتی تھی ۔"

(منٹو ص ۱۱۶)

منٹو کے نوکر غلام رسول کو سعادت صاحب کے ساتھ بڑی عقیدت تھی ۔ وہ شب و روز منٹو کے ساتھ برسوں برس رہے اور منٹو کی گھریلو زندگی اور منٹو کی شخصیت کا قریب سے مشاہدہ کیا ۔ غلام رسول اپنے مضمون "میرا آقا" میں منٹو کی گھریلو زندگی کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں اور یوں لکھتے ہیں :-

"منٹو کو اپنی بیگم اور اپنی تینوں بچیوں سے بہت پیار تھا ۔ مگر میں نے ان کی زندگی کے آخیری تین چار سال میں بغور منٹو کا مطالعہ کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اپنی تین بھولی بھالی لڑکیوں کو پیار نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ وہ بیوی بچیوں کو بالکل فراموش کر دینا چاہتے تھے ۔"

(نقوش افسانہ نمبر ۱۹۶۸ ص ۲۲۰-۲۲۱)

اس بیان سے اس شخص کا اندرون بے نقاب ہوتا ہے جو گھر کے اندر تھا اور جس کی شخصیت پر کوئی ملمع چڑھا ہوا نہیں تھا ۔ اسے بیوی بچوں سے بے انتہا محبت تھی البتہ زندگی کے آخیری ایام میں جب وہ مفلس و قلاش ہو چکے تھے ۔ جب ان کا ذہن مکمل طور سے شل ہو چکا تھا اور جب ان کا سہارا صرف شراب رہ گیا تھا اور انہیں معلوم تھا کہ وہ بڑی تیزی کے ساتھ موت کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں تو انہوں نے اپنے بیوی بچیوں کو فراموش کرنا شروع کیا ۔ چنانچہ ایک بار جب وہ اپنی چھوٹی بچی کے لئے جو انہیں بہت عزیز تھی اور ٹائیفائیڈ کے بخار میں تپ رہی تھی ، دوا لینے کے لئے چلے گئے ۔ لیکن دوا کے بدلے شراب لے آئے ۔ یہ افلاس اور ناداری کے اسی دور کا واقعہ ہے جب صفیہ بیگم بچی کی دوا کے لئے پیسہ ادھار لے آئی تھیں ۔ خود فراموشی کا یہ عبرتناک عالم منٹو پہ گزر رہا تھا ۔ یہ ان کی سب سے بڑی شکست تھی ، ہمیشہ کی صابر اور شاکر صفیہ بیگم اس "سانحے" پر بھی کچھ نہ بولیں ۔

راقم السطور نے صفیہ بیگم کی توجہ جب اس طرف دلائی تو انہوں نے یہ جواب دیا:-

"میں اس لئے خوش قسمت ہوں کہ ایک ایسے ادیب کے ساتھ زندگی گزاری ہے اور اللہ کے فضل سے بہت اچھی زندگی گزاری ہے۔ ان کا میرے ساتھ، میری بچیوں کے ساتھ اور بلکہ دوسرے اہل خاندان کے ساتھ بہت محبت تھی اور ہمارے دن بڑے اچھے گزرے ہیں۔"

(راقم السطور کے نام ایک خط سے)

شادی کے بعد منٹو کی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہوا تھا۔ اس اصلاح اور تبدیلی کے پیچھے صفیہ بیگم کا مضبوط ہاتھ تھا۔ منٹو کے دوست مظفر حسین شمیم کے مطابق منٹو جتنے زیادہ گرم مزاج تھے اتنی ہی ٹھنڈے مزاج کی صفیہ تھیں۔ منٹو میں جتنا زیادہ اضطراب تھا، صفیہ اتنی ہی پرسکون تھیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ منٹو شاید "منٹو" نہ ہوتے اگر صفیہ بیگم ان کی زندگی میں آ کر نہ چھا جاتیں۔ اچھے دنوں میں جب منٹو مالی اعتبار سے آسودہ حال تھے۔ صفیہ اور بچوں کی آسایش و آرام کا ہر ہر خیال رکھتے تھے۔ وہ کبھی صفیہ کی خانگی زندگی میں دخل نہیں دیتے تھے۔ بمبئی کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے صفیہ کہتی ہیں:-

"جب ہم بمبئی میں تھے اور کبھی گھر بدلنا ہوتا تھا تو گھر میں سارا سامان باندھتی جاتی تھی اور وہ دوسرے گھر میں سامان پہنچاتے جاتے اور نہ صرف سامان پہنچاتے بلکہ ہر چیز قرینہ سے صحیح جگہ پر جاتے جاتے۔ گھر کو سجانا منٹو صاحب پر ختم ہے۔"

(منٹو۔ میرا دوست ص ۳۷)

یہ منٹو کی پر خلوص اور بے ریا زندگی کا اعجاز تھا جس کے باعث ان کی رفیقۂ حیات نے ان کے ساتھ برابر دکھ اور سکھ اٹھائے اور جھیلے اور ہر حال میں قانع رہیں۔ لیکن جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے زندگی کے آخری ایام میں منٹو ٹوٹ سے گئے تھے۔ مستقبل کی غیر یقینی حالت سے وہ کانپ

رہے تھے۔ اپنی زندگی کے ایسے ہی تاریک دنوں میں انہوں نے اپنا مشہور مضمون "جیب کفن" لکھا۔ اس کے مطالعے سے ان کی ذہنی پریشانی اور گہرے غم کا احساس ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنی گھریلو زندگی، اپنی بیوی اور اپنی بچیوں کا غم کیسے اندر ہی اندر گھلاتا جا رہا تھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"میری موجودہ زندگی مصائب سے پُر ہے۔ دن رات مشقت کرنے کے بعد بصد مشکل اتنا کماتا ہوں جو میری روزمرہ ضروریات کو پورا کر سکے۔ یہ تکلیف دہ احساس ہر وقت مجھے دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ہے کہ اگر آج میں نے آنکھیں میچ لیں تو میری بیوی بچیوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ میں فحش نویس دہشت پسند، سنکی، لطیفہ باز اور رجعت پسند سہی لیکن ایک بیوی کا خاوند اور تین لڑکیوں کا باپ بھی ہوں"

(یزید ص ۲۰۵)

یہ تھا سعادت حسن منٹو اور اس کا اصلی روپ!

ایک حساس فن کار اور ایک ذمہ دار شوہر اور ایک شفیق باپ!

تین سو کہانیوں اور دو سو ڈراموں اور اس سے زیادہ دوسری تحریروں کا خالق!

جو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے رہا تھا۔

منٹو کے افسانوں، ان کے خاکوں اور خطوط میں صفیہ بیگم کا بار بار ذکر ملتا ہے۔ وہ اُن کے تصورات پر چھائی ہوئی محبوب شخصیت ہے، جس نے منٹو کے کردار کی تشکیل میں ایک اہم اور کلیدی رول ادا کیا۔ خود منٹو کی تحریروں میں صفیہ کے خلاف کہیں پر بھی غصے اور جھلاہٹ یا تلخی کا ذکر بھی نہیں ملتا۔ منٹو جب بھی فکر معاش سے تھوڑی سی فراغت پاتے تو اپنے گھر کو قہقہوں سے زعفران زار بناتے۔ لطیفے سناتے اور من گھڑت داستانیں بیان کرتے۔ گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں گھر والوں کا ہاتھ بٹاتے۔ یہ ان کا ہی اثر تھا جو صفیہ نے ادب کے ساتھ دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ حتےٰ کہ شیورانی پریم چند کی طرح کہانیاں

لکھنا شروع کر دی تھیں۔ پیار سے لبریز اس قابل رشک زندگی میں بھی منٹو کا ادب صفیہ بیگم کے لئے ایک مختلف ردعمل کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس عظیم فن کار کے ساتھ زندگی گزارنے سے صفیہ بیگم میں بھی ادب کا ایک سلجھا ہوا مذاق پیدا ہوا تھا۔ اور وہ اچھے اور برے ادب میں فرق کرنے کے قابل ہوئی تھیں۔ صفیہ بیگم عام طور سے منٹو ہی کی کہانیاں پڑھتی تھیں لیکن ان کو وہی افسانے پسند تھے جو پسندِ عام تھے اور جن کو کافی سراہا گیا تھا۔ محمد اسد اللہ کی تصنیف کے حوالے سے صفیہ بیگم کا یہ بیان قابل غور ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"میں صرف منٹو صاحب ہی کو پڑھتی ہوں ——— 'نیا قانون'
دس روپیہ' آم' ٹوبہ ٹیک سنگھ' مجھے ان کے یہ افسانے بہت
پسند ہیں۔ میں مقدمے والے افسانوں سے بہت ڈرتی ہوں۔"

{ منٹو، میرا دوست ص ۲۷
محمد اسد اللہ }

پاکستان چلے جانے کے بعد ان کا قلم معاشی مسئلے کو سلجھا نہ سکا اور ادب سے وہ پیٹ نہ پال سکے۔ صفیہ بیگم ان کی ادبی زندگی سے عاجز آ گئیں۔ اس موڑ پر آ کر تلخیوں نے جنم لینا شروع کیا۔ اگرچہ صفیہ بہت صبر کر کے رہ جاتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ منٹو صاحب ادب کو ترک کر کے کوئی اور کام سنبھالیں۔ لیکن یہ منٹو کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ آخیری دم تک لکھتے رہے لیکن اس سے جو آمدنی ہوتی اس سے وہ فقط شراب پینے لگے تھے۔ صفیہ بیگم نے اس کے خلاف احتجاج کیا لیکن بے سود کہنے لگیں:۔

"اب ان کا لکھنا پڑھنا صرف شراب ہی کے لئے رہ گیا ہے۔ اس لئے
میں ان سے کہتی ہوں کہ لکھنا چھوڑ دیں۔ کوئی دکان کھول لیں۔ اس
سے ان کا پینا تو ختم ہو جائے گا۔"

(منٹو، میرا دوست ص ۳۵

لیکن یہ نہ ہو سکا۔ صفیہ بیگم نے اب سعادت صاحب کی شراب نوشی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور خود ان کی شراب کا ایک پیمانہ مقرر کیا اور جو آمدنی ہوتی تھی۔ وہ خود ہی ناشروں اور رسائل کے ایڈیٹروں سے حاصل کرتی تھیں۔ مگر یہ تماشا کتنے دن چل سکتا تھا منٹو موت کی دہلیز پر پہنچ چکے تھے اور صفیہ اب کے انہیں بچا نہ سکیں۔ زندگی کے آخیری لمحوں میں انہوں نے صرف شراب کا تقاضا کیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب ان کا آخری وقت آگیا ہے وہ موت سے شکست تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے صفیہ کے سعادت صاحب دنیا سے منہ موڑ کر چلے گئے۔

انتقال کے بعد صفیہ بیگم کو کچھ بھی نہ ملا۔ ہزاروں کمانے والا اب خاموش ہو چکا تھا۔ ان کی کتابیں دھڑا دھڑ چھپنے لگیں لیکن ان سے صفیہ بیگم کو ایک کوڑی بھی نہ ملی۔ اس کو یاد کر کے انہیں بے حد قلق تھا۔ راقم السطور کے نام ایک خط میں لکھتی ہیں:۔

"سعادت صاحب کی کتابوں سے مجھے بالکل کچھ نہیں ملتا۔ جس کا مجھے بڑا دکھ ہے۔ میرے خاوند ادب کے لئے اتنا کر گئے ہیں۔ جس سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ سوائے ہمارے، یہ کتنا ظلم ہے۔"

(بیگم صفیہ منٹو)

ایک اور خط میں شکایت کرتی ہیں:۔

"مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی لکھی ہوئی چیزوں سے مجھے آج تک کوئی فایدہ نہیں پہنچا۔ کتابیں پاکستان میں بھی سب چھپتی ہیں اور اسی طرح ہندوستان میں بھی چھپتی ہیں اور ہمیں ایک چھوٹی کوڑی بھی نہیں ملتی اس لئے میں اس لکھنے کو کیا کہوں۔ باقی صرف ہمارے لئے ایک چیز ضرور چھوڑ گئے ہیں۔ وہ ہے نام اور عزت اور بس۔"[1]

(راقم السطور کے نام صفیہ بیگم مرحومہ کا خط)

---

[1] ۔ حکومت پاکستان نے بعد میں بیگم صفیہ منٹو کے لئے 350/- کا ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا۔

میں اس مختصر مضمون کو عصمت آپا کے مضمون "میرا دوست، میرا دشمن" کے ایک اقتباس پر ختم کروں گا۔ جو آپا نے منٹو کے انتقال کے بعد لکھا تھا۔ اس مضمون میں صفیہ اور منٹو کا ذکر کرتے ہوئے آپا نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے اس کے ایک ایک لفظ کی جڑوں میں آنسوؤں کی نمی ہے اور قاری اسے پڑھتے پڑھتے اچانک رک جاتا ہے اپنے آنسو پونچھنے کے لئے۔ صفیہ کے دل کی گہرائیوں میں اترتے ہوئے عصمت چغتائی سرگوشی کے انداز میں صفیہ بیگم سے مخاطب ہو کر لکھتی ہیں:

"کس دل سے پوچھوں کہ جب ساری دنیا نے منٹو کو فراموش کر دیا۔ تب بھی تمہاری محبت اس طوفانی ہستی کا سہارا چٹان بن کر دیتی رہی یا تمہارا پیار تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ کیا یہ بارہ تیرہ برس کا بھونچال تمہیں جھنجھوڑ کر لپیٹ کر گیا یا تم اب بھی منٹو صاحب کی صفیہ رہیں.......

پاس پڑوس کے مہذب لوگ اور رشتہ دار جب اس کی بدردی پر ناک بھوں چڑھاتے تھے تو تم کیا کرتی تھیں......

ان خاموش گیسوؤں کا تمہارے پاس کیا جواب تھا جو بے مروتی اور لاپرواہی سے تمہارے اردگرد منڈلایا کرتی تھیں۔ دم تو گھٹ جاتا تھا کیا اس نے تمہاری پیار بھری گود میں دم توڑا یا وہ تنہا اور بھرے خاندان میں اکیلا ہی سدھارا؟"

{ میرا دوست، میرا دشمن / نقوش منٹو نمبر ص ۳۱۰ }

منٹو اور کشمیر

تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف سیاسی حالات کے پیش نظر کشمیر کی آبادی کا ایک حصہ کشمیر سے بھاگ کر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہوا اور اپنی خداداد قابلیت کے باعث اپنے لئے بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ان ہجرت کرنے والے خاندانوں میں کئی ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ ان میں سے بعض ایسے مشاہیر کے نام ملتے ہیں جن کی تخلیقات نے اردو شعر و ادب کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ ان میں سے اقبال، چکبست، سرشار، دیا شنکر نسیم، مومن، آزردہ، ترھبون ناتھ ہجر، علامہ کیفی، آغا حشر، راما نند ساگر، قدرت اللہ شہاب اور دوسرے لوگ قابل ذکر ہیں۔ اسی فہرست میں سعادت حسن منٹو کا نام ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ انہوں نے اردو کے مختصر افسانے کو موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔

منٹو کشمیری الاصل تھے۔ ان کے بزرگ علامہ اقبال کی طرح کشمیری پنڈت تھے۔ وہ برہمنوں کی سارسوات شاخ سے تعلق رکھتے تھے اور کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب میں آباد ہو گئے تھے۔

اس کی تصدیق خود منٹو اور ان کے دوستوں نے کی ہے۔ منٹو اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں:۔

"میں کشمیری ہوں۔ بہت عرصہ ہوا ہمارے آباو اجداد کشمیر سے ہجرت
کر کے پنجاب آئے اور مسلمان ہو گئے۔"

کرشن چندر نے منٹو کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اپنے کتابچہ "سعادت حسن منٹو" میں انہوں نے منٹو کو کشمیری ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وقت گزرنے کے باوجود منٹو کا مزاج کشمیری ہی رہا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی ہے، لکھتے ہیں:۔

"مزاج جسم اور روح کے اعتبار سے منٹو آج بھی کشمیری
پنڈت ہے۔"

منٹو کو اپنے کشمیری الاصل ہونے پر بڑا ناز تھا۔ وہ کشمیر اور کشمیریوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کی اکثر تحریروں میں اس جذبے کا پرتو ملتا ہے۔ وہ کشمیر کا ذکر کرنے سے کبھی کتراتے نہیں تھے۔ حتےٰ کہ اپنے آپ کو "ہاتو" کہلانا بھی پسند کرتے تھے خود کہتے ہیں:۔

"میں کشمیری ہوں ـــــ ایک ہاتو"

اپنی ایک تصنیف لاوڈ اسپیکر میں اعتراف کرتے ہیں:۔

"میں بھی کشمیری ہوں۔ مجھے کشمیریوں سے بہت محبت ہے لیکن میں ایسے
کشمیریوں سے نفرت کرتا ہوں جو اپنی بیویوں سے بُرا سلوک کریں۔"

ان کے ایک دوست محمد اسد اللہ نے اپنی کتاب "منٹو ـــــ میرا دوست" میں تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ کشمیر سے والہانہ عشق کرتے تھے اور اس کا بار بار ذکر کرتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"اگر کبھی کوئی امرتسری یا کشمیری آدمی ان کی طرف آنکلتا تو اس سے
بڑے بے تکلف ہو جاتے۔ بار بار اس کو بتلاتے تھے کہ میں بھی کشمیری
ہوں، ویسے امرتسری ہوں۔ عالم یہ ہوتا تھا کہ بار بار ناک صاف کر رہے
ہیں سگریٹ پر سگریٹ جلا رہے ہیں اور اٹھ اٹھ کر اندر جا کر ایک پیگ

چڑھا رہے ہیں اور امرتسر اور کشمیر کی باتیں کر رہے ہیں"۔

ان کے لنگوٹیے ابو سعید قریشی نے بھی اپنی کتاب "منٹو" میں منٹو کی کشمیر سے محبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"اسے اپنے کشمیری ہونے پر بڑا ناز تھا"

منٹو کی کئی پشتیں امرتسر میں رہتی آئی تھیں۔ لہٰذا امرتسر کی گلی گلی سے وہ واقف تھے اور امرتسر کے ذکر سے ان پر والہانہ کیفیت طاری ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود کشمیر ان کی دوسری کمزوری تھی۔ منٹو نے کشمیر سے یہ محبت وراثت میں پائی تھی۔ ان کے والد مولوی غلام حسن بھی کشمیریوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ کشمیری وضع کی پگڑی پہنتے تھے اور ان کا مزاج کشمیریوں سے ملتا جلتا تھا۔ وہ کشمیریوں سے اس طرح ملتے تھے جیسے وہ ان کے جسم کا ایک انگ ہوں۔ اپنے والد بزرگوار کے کشمیریوں سے عشق کا ذکر منٹو نے اپنے ایک مضمون "شاعر کشمیر مہجور" میں یوں کیا ہے :۔

"میرے والد صاحب کو کشمیریوں سے عشق تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے
کہ وہ کبھی کبھی اس عشق کے زیر اثر کسی ہاتو یعنی مزدور کو پکڑ کر اپنے
ساتھ لے آیا کرتے تھے اور اسے بیٹھک میں بٹھا کر بڑے فخر سے
کہا کرتے تھے ـــــــ میں بھی کاشر ہوں"

منٹو کو بعض لوگ منٹو کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن ایسا کہنا صحیح نہیں ہے۔ منٹو کا لفظ اُن کے خاندانی نام "منٹ" سے ماخوذ ہے جو کشمیر میں ½ سیر کے بٹّے کے طور پر استعمال ہوتا آیا ہے۔ یہ نام اب بگڑتے بگڑتے منٹو ہو گیا ہے۔ منٹو نے اپنی ذات کے بارے میں خود لکھا ہے :۔

"کشمیر کی وادیوں میں بہت سی ذاتیں ہوتی ہیں۔ جن کو "آل" کہتے ہیں
جیسے نہرو، سپرو، کچلو وغیرہ وغیرہ منٹ کشمیری زبان میں تولنے والے بٹّے
کو کہتے ہیں ہمارے آباؤاجداد اتنے امیر تھے کہ اپنا سونا چاندی بٹّوں میں
تول تول کر رکھتے تھے"

یہاں اس بات سے بحث نہیں کہ منٹو نے اپنی ذات کے بارے میں جو کلیہ پیش کیا ہے۔ وہ صحیح ہے یا نہیں۔ البتہ یہ بات واضح کرنا لازمی ہے کہ منٹو ذات کے لوگ اس وقت بھی کشمیر میں ملتے ہیں اور ان کا ذریعہ معاش اکثر تجارت ہے' ان کی ذات "منٹ" یعنی پاسیر کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وابستہ ہے" منٹو اور من وٹی" دراصل قسط باشی پنڈتوں کی ذاتیں ہیں[1]۔ فوق کا خیال ہے کہ جن لوگوں نے آگے چل کر اسلام قبول کر لیا وہ منٹو کہلائے اور جو اپنی اصل پر قائم رہے' وہ "من وٹی" کے نام سے مشہور ہوئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج بھی شہر سرینگر اور وادی کے کئی مقامات پر دونوں ذاتوں کے لوگ موجود ہیں اور کئی ہندو گھرانوں کی ذات بھی منٹو ہے۔

منٹو خاندان کے ایک بزرگ خواجہ رحمت اللہ تھے۔ جن کا پیشہ سوداگری تھا۔ وہ اس خاندان کے پہلے بزرگ تھے۔ جو پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں آکر مقیم ہوگئے ان کے پوتے خواجہ جمال الدین سکھوں کے عہد حکومت میں امرتسر چلے گئے اور پشمینہ سازی کے کام کو فروغ دیا۔ اور اسے صرف لاہور تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ امرتسر اور بمبئی تک پھیلا دیا۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے مولوی غلام حسن تھے جو بعد میں سب جج ہوئے۔ مولوی غلام حسن کے بارہ بچوں میں ایک سعادت حسن منٹو تھے۔ لاہور اور امرتسر میں رہائش کے باوصف منٹو خاندان کے طرز حیات میں کافی عرصے تک کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہو سکی حتیٰ کہ اس خاندان کے افراد کے نام بھی خالص کشمیری رہے۔ مثلاً "حمزہ جو' رسول جو" احمد جو' تاج مالی' زون مالی وغیرہ یہ نام آج بھی کشمیر میں ملتے ہیں۔

منٹو کی شادی ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس میں ان کی ذاتی دلچسپی کے ساتھ ساتھ ان کی والدہ کی مرضی کا زبردست ہاتھ تھا۔ ان کی بیوی افریقہ کے مشہور قومی کارکن خواجہ شمس الدین کی بھتیجی تھیں۔ ان کے تایا افریقہ کی پارلیمنٹ کے ممبر تھے اور جب منٹو کے ساتھ رشتے کی بات چیت ہو رہی تھی تو وہ افریقہ سے منٹو کو دیکھنے کے لئے بمبئی آئے تھے۔ منٹو کی رفیقہ حیات بیگم صفیہ منٹو کے والد کا خاندان سال ہا سال سے افریقہ میں رہائش پذیر تھا۔ وہاں منٹو کے دو بڑے بھائی بھی بیرسٹری کرتے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم السطور کی کتاب سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے

رہے تھے لہذا ان کو رشتہ پسند آیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ خود کشمیری الاصل تھے لہذا لڑکی کا رشتہ کسی کشمیری خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔ بیگم صفیہ جس کے والد افریقہ میں پولیس انسپکٹر تھے لیکن وہیں کسی حبشی نے انہیں ایک بلوے میں قتل کر دیا تھا۔ اب ان کے چچا ہی ان کی پرورش کرتے تھے۔ منٹو نے اپنی زندگی کی پوری تصویر ان کے سامنے رکھ دی لیکن یہ جان کر منٹو کو خود ہی تعجب ہوا کہ وہ اس رشتے پر رضامند ہو گئے۔

منٹو نے شادی سے پہلے اپنی بیوی کو نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ماں نے انہیں بتایا تھا کہ لڑکی بڑی ہوشیار اور سلیقہ مند ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ کشمیری ہے۔ منٹو اس بات سے بہت خوش ہوئے۔ انہیں جو کچھ معلوم ہوا اس کی تفصیل مزے لے لے کر اپنے دوست احمد ندیم قاسمی کو اپنے ایک خط میں یوں لکھتے ہیں:۔

> "میری شادی مکمل طور نہیں ہوئی ہے۔ میں صرف "نکاحیا" گیا ہوں۔ میری بیوی لاہور کے ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا باپ مر چکا ہے۔ میرا باپ بھی زندہ نہیں وہ چشمہ لگاتی ہے۔ میں بھی چشمہ لگاتا ہوں۔ وہ ۱۱ مئی کو پیدا ہوئی۔ میں بھی ۱۱ مئی کو پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں چشمہ لگاتی ہے۔ میری والدہ بھی چشمہ لگاتی ہے۔ اس کے نام کا پہلا حرف "ص" ہے۔ میرے نام کا پہلا حرف بھی "ص" ہے....."

منٹو کو زندگی بھر افسوس رہا کہ انہوں نے کبھی اپنی کھلی آنکھوں سے کشمیر کو نہیں دیکھا تھا وہ صرف بٹوت تک اس زمانے میں آئے تھے جب انہیں دق کا مریض قرار دے کر علی گڑھ یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا۔ یہاں وہ صرف تین ماہ رہے لیکن صحت پھر بھی سنبھل نہ سکی۔ یہیں ان کا پہلا عشق پروان چڑھا جس نے ان کے دل و دماغ کو مسحور کر دیا اس عشق کی پرچھائیاں ان کے بہت سے افسانوں میں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ "ایک خط" "بیگو" "مصری کی ڈلی" "لالٹین" وغیرہ اس ضمن میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ منٹو کو اس بات کا بھی افسوس تھا کہ وہ کشمیری زبان سمجھ اور بول نہیں سکتے تھے۔ کشمیری زبان کے سربرآوردہ شاعر مہجور کی شاعری کے جو تراجم انہوں نے پڑھے تھے۔ اس سے وہ مہجور کے پرستار بن چکے تھے۔ خاص طور

پر جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ مہجور نے ظلم و ستم سہہ کر بھی ان کے والدین کی طرح ترک وطن نہیں کیا تھا تو ان کے دل میں مہجور کی توقیر اور بھی بڑھ گئی تھی۔ مہجور کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مجھے ندامت ہے کہ میرے آباؤ اجداد نے ہجرت کی جور و ستم سہنا بڑی بات ہے لیکن ہجرت بہت بڑا مزہ ہے۔ مہجور نے ظلم و ستم سہے۔ اس نے سب سے بڑی اذیت جو ذہنی خصوصیت ہے برداشت کی، مگر وہ ڈٹا رہا۔ ہجرت کا خیال تک بھی اس کے دماغ میں نہ آیا ...... مہجور کے کلام کا ترجمہ پڑھنے کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا ہجر ہی اس کا وصال ہے ......"

منٹو ہند و پاک کی کشیدگی سے ناخوش تھے۔ انہیں اس بات کا بے حد قلق تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے سربراہ دونوں کشمیری ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے دشمن کیوں بنے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مہجور زندہ ہوتے تو حالات کچھ اور ہوتے (حالانکہ ۱۹۴۷ کی کشیدگی کے وقت مہجور زندہ تھے) اپنے شاعرانہ اور جذباتی نقطہ نظر کو انہوں نے اپنے مضمون "شاعر کشمیر ـــــ مہجور کشمیری" میں یوں بیان کیا ہے:

"اگر وہ زندہ ہوتا تو میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر گراہم کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ اپنے قلندرانہ انداز میں جواہر لال نہرو اور خواجہ ناظم الدین کو (یہ بھی کشمیری ہیں) سمجھا دیتا کہ دیکھو انسان کا خون پانی سے ارزاں نہیں ہے۔ کشمیری خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو، ہر حالت میں کشمیری ہے۔ تم جواہر لال نہرو ہو ـــــ یہ ناظم الدین ہے۔ دونوں کشمیری ہو ...... تم گوگجی اور بتھ (شلغم اور چاول) کے ایسے دسترخوان سے کبھی نکال نہیں سکتے ہو۔ پھر تم کیوں لڑتے ہو؟ شلغم اور بھات کی قسم کھا کر کیا تم ایک دوسرے کے گریبان میں ہاتھ ڈال سکتے ہو"؟

منٹو کی اکثر تحریروں میں کشمیر اور کشمیریوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی بعض کہانیاں کشمیر اور کشمیر کی زندگی کے

بعض پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کی کشیدگی پر ان کی کہانیاں "آخری سلیوٹ" "ٹیٹوال کا کتا" وغیرہ اہم مقام رکھتی ہیں۔ ان کہانیوں میں منٹو کی انسان دوستی سے دھڑکتی ہوئی روح صاف نظر آتی ہے جہاں مذہب، رنگ اور نسل کا کوئی بھید و بھاؤ نہیں ملتا۔ اسی طرح ان کی بہت سی کہانیوں کا پس منظر کشمیر ہے اور ان کے کردار کشمیری ہیں۔ ان کے یہاں متعدد بار ایسے استعاروں پر نظر جاتی ہے جن میں کشمیر کی مہک ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کشمیر کو اپنے لاشعور میں سے نکال نہیں سکے تھے۔ منٹو کی بیشتر کہانیوں، مضامین اور دوسری تحریروں میں کشمیر اور کشمیریوں کا ذکر بڑے چاؤ سے ملتا ہے۔ ان کا احاطہ کرنا یہاں طوالت کا باعث ہوگا۔ یہ سب باتیں ایک علیحدہ مضمون میں بیان کی جا سکتی ہیں لیکن یہاں یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ تقسیم ملک کے وقت منٹو ہندوستان میں تھے۔ اس کے بعد ہی ہند و پاک کشیدگی کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد منٹو پاکستان چلے گئے۔ جہاں انہوں نے ٹھنڈا گوشت، کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور اسی قبیل کی کہانیاں لکھیں۔ کشمیر سے متعلق ان کی دو کہانیاں اسی زمانے کی یادگار ہیں "ٹیٹوال کا کتا" اور "آخری سلیوٹ" لیکن اس کی وفاداریاں کہاں ہیں؟ ان میں وہ ہندوستانی منٹو ہے اور نہ پاکستانی منٹو ——— وہ صرف منٹو ہے، جس کی وفاداری انسانیت سے ہے اس کی فکر و نظر، جذبہ و احساس میں مذہب کا، رنگ کا، نسل کا، مملکت کا ——— کوئی تعصب نہیں، کوئی بھید و بھاؤ نہیں۔ بلکہ وہ دلوں کی خلیج کے درمیان امن صلح، دوستی، محبت اور بھائی چارے کے پُل باندھنا چاہتا ہے۔

"کچھ نہیں ارے رام سیاں ——— بھول ہی گیا تو سور کے نلا ———

کہ لڑائی ——— یہ لڑائی؟"

اس پُر آشوب دور میں بڑے بڑوں کے حوصلے شکست تھے۔ بڑے بڑوں کی وفاداریاں بٹی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے ادیب اور افسانہ نگار قتل اور خون اور لوٹ مار اور عصمت ریزی و زنا کا کھاتہ کھولے بیٹھے تھے اور اس میں برابر برابر کا اندراج کر رہے تھے۔ منٹو چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان اور وہ لہو کس کا ہے جو ہر روز اتنی بیدردی سے بہایا جا رہا ہے؟ وہ ہڈیاں کہاں

جلائی یا دفن کی جائیگی جن پر سے مذہب کا گوشت پوست چیلیں اور

گدھ نوچ نوچ کر کھا گئے تھے ـــــــ"

کشمیر سے متعلق منٹو کی کہانیاں، ڈوگرہ شاہی مظالم کے خلاف ان کا ردعمل، غنی اور مہجور کی شاعری سے عشق، کشمیر کھلی آنکھ سے نہ دیکھنے کا ارمان، قمر سے اپنے آپ کو "کاشر اور ہاتو" کہنا یہ اور ایسی بے شمار باتیں سعادت حسن منٹو کے لاشعور میں چھپی ہوئی وہ ناتمام آرزو تھی جس کی تشفی وہ چاہتے تھے لیکن نہ ہو سکی! موت ان کو بے وقت نہ چھینتی تو شاید ان کی آرزو پوری ہو جاتی ـــــ کون جانے؟ منٹو کے خاندان میں صرف ان کے بڑے بھائی خواجہ سلیم حسن منٹو ایک بار اہل خاندان کے ساتھ ۱۹۲۱ء کے دوران کشمیر آئے تھے اور یہاں منٹو خاندان کے بعض افراد سے مل کر اتنے خوش ہوئے تھے کہ کئی روز خوشی کے مارے سو نہ سکے تھے۔ مدتوں تک وہ اس قصے کو اپنے خاندان میں فخر سے دہراتے رہے تھے۔ لیکن منٹو پھر بھی کشمیر نہ آسکے تھے۔

منٹو کے چاچا جان خواجہ حبیب اللہ کا انتقال ۲۷، جون ۱۹۴۴ء، کوسری نگر میں نوے برس کی عمر میں ہوا تھا اور وہ یہیں دفن ہوئے۔ منٹو کو ان کی قبر کی زیارت بھی نصیب نہ ہو سکی۔

سعادت حسن منٹو زندگی بھر اس ناتمام آرزو کی تشنگی سے کڑھتے رہے۔ وہ وقت کی بے رحمی کے آگے بے بس تھے اور زندگی بھر رہے ـــــ

سعادت حسن منٹو، ہماری تاریخ کا ایک جاندار حصہ ہیں۔ ہم انہیں کیسے فراموش کر سکتے ہیں؟

منٹو اور شراب

منٹو کو شراب نوشی کی لت اپنے لڑکپن میں ہی امرتسر میں پڑی تھی۔ جہاں ہری سنگھ امرتسری نام کے ایک رئیس زادے کے ساتھ ان کے مراسم بڑھ گئے تھے۔ پھر دوست ایسے ملے جن کا کام جوا کھیلنا یا شراب پینا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ ایف، اے کی مہم کو سر کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے اور دو سال سے مسلسل ناکام ہو رہے تھے۔ کالج کی تعلیم کے دوران وہ دوسرے مشاغل میں دلچسپی لے رہے تھے اور شوخیوں اور شرارتوں کی ازلی سرشت نئی نئی صورتوں میں نمودار ہو رہی تھی گھر کی سہما دینے والی فضا نے ان میں بددلی پیدا کر دی تھی۔ امتحان میں مسلسل ناکام ہونے کے باعث ان کے سارے منصوبے درہم برہم ہو چکے تھے اور تعلیم سے ان کی طبیعت اُوب چکی تھی۔ تاہم اپنی طبیعت کے اضطرار کی آسودگی کے لئے کوئی نہ کوئی راہ تلاش کرنا ضروری تھا۔ اس لئے جب ہری سنگھ امرتسری جیسے بگڑے ہوئے رئیس زادوں کے ساتھ ان کی دوستی ہو گئی تو سستے شراب کے جام اس دوستی کی استواری کا موجب بن گئے۔ پاس پڑوس میں جوئے کا بازار گرم رہتا تھا۔ سعادت حسن نے بھی مایوسیوں کے اس بھنور میں قمار بازی کو ذریعہ نجات پایا۔ لیکن جوئے سے بھی تشفی نہ ہوئی۔ سعادت بے حد آرزو مند تھے۔ دنیا

بھر کی کامرانیوں پر اپنا حق جتاتے تھے لیکن مایوسیوں اور ٹھوکروں کے سوائے انہیں کچھ حاصل نہ ہوا۔ ان حالات میں کبھی آوارہ گردی طبیعت میں سما جاتی اور کبھی کسی سے الجھنے کو جی کرتا۔ کبھی انقلاب کا خام تصور جذبات کی دنیا میں سر اٹھانے لگتا کبھی شعر گوئی کی طرف طبیعت مائل ہوتی کبھی فرضی محبوباؤں کے تصورات میں گم رہتے۔ اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:۔

> "یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے آوارہ گردی شروع کر رکھی تھی طبیعت ہر وقت اچاٹ سی رہتی تھی۔ ایک عجیب قسم کی کھُد بُد ہر وقت دِل و دماغ میں ہوتی رہتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ جو چیز بھی سامنے آئے اسے چکھوں خواہ وہ اِنتہا درجے کی کڑوی ہی کیوں نہ ہو۔"

اس لئے آوارہ رئیس زادوں کی رفاقت اور دوستی انہیں راس آئی۔ اس زمانہ میں تکیوں اور قبرستانوں میں گھومنے سے لے کر کوکین، چرس اور شراب کے دور تک کونسا ایسا شغل تھا جو سعادت حسن نے آزمایا نہ ہو۔ اسی شدید قسم کی ذہنی اور روحانی افراتفری کے عالم میں رہ کر منٹو نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھ لیا۔ معاشرتی اور اخلاقی طور پر یہ دور کتنا ہی بدنما کیوں نہ دکھائی دے لیکن یہی وہ زمانہ تھا جس نے منٹو کو زندگی کے سنگلاخ حقایق کو سمجھنے میں مدد دی اور ان کے لاشعور کو تجربات کا ایک وسیع خزانہ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں ابتداسے ہی زندگی کے بیش بہا تجربات حاصل ہوئے اور زندگی اپنے اصلی روپ میں نظر آنے لگی۔

طالب علمی کے زمانے میں ہی منٹو کو زبردست مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے والد نے دو شادیاں کی تھیں اور وہ کثیر الاولاد تھے پہلی بیوی سے جو بچے تھے۔ ان کی تربیت میں انہوں نے خاص توجہ دی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے انتقال کے بعد ان کی والدہ اپنے دو بچوں کی پرداخت نہایت کسمپرسی میں کرتی رہیں۔ سعادت نے جب ہوش سنبھالا تو گھر میں افلاس اور ناداری کے گہرے سایے منڈلاتے ہوئے دیکھے اور یہ احساس ان کے شعور کا ایک حصہ بن گیا۔ یہ احساس آس پاس کے ماحول نے اور بھی گہرا کر دیا۔ شراب نوشی ایک سہارا ان کے سامنے آئی منٹو خود لکھتے ہیں:۔

"مالی حالت کچھ پہلے ہی کمزور تھی۔ آس پاس کے ماحول نے اور بھی نکما
کر دیا تو آمدنی کے محدود ذرائع اور بھی سکڑ گئے۔ غم غلط کرنے کیلئے
میں نے کثرت سے شراب نوشی شروع کر دی۔ اکثر گھر سے باہر رہتا
اور اپنے شرابی دوستوں کے گھر پڑا رہتا جن کو ادب سے دور کا
بھی واسطہ نہ تھا۔ ان کی صحبت میں رہ کر میں جسمانی اور روحانی
خودکشی کی کوشش میں مصروف تھا۔"

اس سے زیادہ بے بسی کا اظہار اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس دوران سعادت کی چونچال طبیعت نے ایک نئی راہ پائی تھی۔ باری (علیگ) مرحوم نے ان کے آوارہ جنوں کی تہذیب کی تھی اور وہ ان کی صحبت میں اشتراکیت کی طرف راغب ہونے لگے۔ منٹو نے اسی رعایت سے اپنے کمرے کا نام "دارالاحمر" رکھا تھا۔ جہاں انقلاب کے خواب بنے جاتے۔ اس کمرے میں باری صاحب اور ان کے تین فرماں بردار چیلے منٹو، حسن عباس اور ابوسعید قریشی دنیا بھر کی اسکیمیں سوچا کرتے۔ باری صاحب اس گروپ کو (FREE THINKERS) کہا کرتے تھے اور ان کے سکیم باز دماغ سے نکلی ہوئی باتیں ایک "مکتبۂ فکر" کی نمایندگی کرتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کو "دارالاحمر سکول آف تھاٹ" کا نام دیا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ابھی انجمن ترقی پسند مصنفین کا کوئی تصور بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ منٹو کا کمرہ روسی ادیبوں کی کتابوں سے بھرا ہوا نظر آتا تھا۔ منٹو نے "دشمنِ کامریڈ" اور "مفکر" کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان دنوں ان کے سینے میں شدید درد پیدا ہونے لگا۔ علاج کے لئے ان کے پاس معقول پیسہ نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے دیسی شراب پینا شروع کر دی۔ ایسی صورت میں ان کے نزدیک یہی معقول علاج تھا۔ شراب کا پورا پوا "دارالاحمر" کے اونچے طاقچے میں ایک کیلنڈر کے پیچھے چھپا رہتا تھا۔ مے نوشی کے دوران بوتل، لکھنے کی فرشی ڈیسک کے نیچے پڑی رہتی۔ زندگی کے آخری ایام میں منٹو کی نفاست پسندی جو ضرب المثل بن چکی تھی، اس درجہ متاثر ہوئی تھی کہ وہی بوتل غسل خانے کے کموڈ میں پہنچ گئی۔ جہاں اس پر فلش کا پانی قطرہ قطرہ

گرفتار رہتا اور منٹو بار بار لوگوں کی نظر بچا کر غسل خانے میں جا کر تھوڑی پی آتے۔

باری (علیگ) صاحب کی دوستی بڑی کار آمد ثابت ہوئی۔ منٹو نے خود اعتراف کیا ہے کہ انہیں تحریر و تصنیف کے راستے پر ڈالنے والے باری ہی تھے۔ انکے کہنے پر منٹو نے اولاً وکٹر ہیوگو کی کتاب LAST DAYS OF A CONDEMNED (ایک اسیر کی سرگزشت) کا ترجمہ لغت کی مدد سے کیا۔ شروع شروع میں جب ترجمے میں دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تو شراب کا سہارا لیا۔ وہ شاید یہ سمجھتے تھے کہ شراب سے ان کا ذہن کھل جائے گا۔ بادہ و ساغر کی ان محفلوں میں ان کے دوستوں کے علاوہ ان کے مرشد اور گرو اشتراکی ادیب باری (علیگ) بھی اکثر شریک ہوتے۔

شراب نوشی کی یہ لت بمبئی اور دہلی میں بڑھ گئی۔ حتیٰ کہ پاکستان چلے جانے کے بعد شراب ان کی سب سے بڑی کمزوری بن گئی اور ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۰-۴۱ء میں جب منٹو آل انڈیا ریڈیو دہلی کے ملازم ہو کر دہلی آئے اور کرشن چندر سے پہلی بار ملے تو چھوٹتے ہی انہوں نے کرشن کو شراب پیش کی۔ کرشن چندر نے مروّت میں یہ ظاہر کیا کہ وہ بھی پانچوں سواروں میں ہیں اور بقول منٹو زبردست پیاک ہیں۔ لیکن ایک ہی پیگ پی لینے کے بعد کرشن چندر کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس پر منٹو نے ایک پوری تقریر جھاڑ دی اور کرشن چندر پر ظاہر کر دیا کہ ایک ادیب کے لئے شراب پینا لازمی ہے۔ کرشن چندر نے اس واقعے کی پوری تفصیل لکھی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"میں تو پہلے ہی پیگ میں نہال ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرا میں نے نہیں لیا اور نہ منٹو نے اصرار کیا۔ کیونکہ وہ میری حالت دیکھ چکا تھا۔ میں نے اقبال کیا کہ پہلی بار شراب پی رہا ہوں۔ اس پر منٹو نے شراب کے فایدے گنائے۔ گناہ کی لذت شراب میں ہے۔ عورت کی رنگت میں شراب ہے۔ ادب کی چاشنی شراب میں ہے۔ مکروہات دنیا سے نجات شراب میں ہے۔ بھئی! تم کب تک پنڈت بنے رہوگے۔ آخر تمہیں ادب کی تخلیق کرنا ہے کوئی مکول

کے بچوں کو پڑھانا نہیں۔ زندگی نہیں دیکھو گے، گناہ نہیں کرو گے، موت
کے قریب نہیں جاؤ گے، غم کا مزہ نہیں چکھو گے۔ سولن وسکی نمبر ا نہیں
پیو گے تو تم کیا خاک لکھو گے"

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بچپن میں جس زہر کو وہ بری صحبت میں پڑ کر پینے لگے تھے اور چند برسوں کے بعد سینے کے درد سے توجہ ہٹانے کے لئے استعمال کرتے تھے وہی "خانہ خراب" دہلی میں آکر ایک ضرورت بن گئی تھی، نہ صرف عارضی بے خودی حاصل کرنے کے لئے بلکہ اس لئے کہ ادب کی چاشنی، عورت کی رنگت اور زندگی کا جمال صرف شراب کی مستی میں ہے۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ شراب پی کر انہوں نے شاہکار کہانیاں تخلیق کیں۔ لیکن ابتدا میں وہ لکھنے کے لئے شراب پیتے تھے۔ بعد میں بقول صفیہ بیگم شراب کے لئے لکھنے لگے۔

شراب کے بارے میں منٹو نے عجیب وغریب تاویلیں پیش کی ہیں۔ میں طوالت سے بچنے کیلئے ان بیسیوں تحریروں کا یہاں ذکر نہیں کروں گا جہاں انہوں نے شراب کا ذکر کیا ہے۔ مضامین میں، افسانوں میں، ڈراموں میں جہاں انہوں نے بادہ نوشی کے لئے جواز پیدا کئے ہیں۔ ان کے بیانات میں عجیب وغریب تضادات ملتے ہیں۔ کبھی وہ شراب صرف "ایک گونہ بے خودی" کے لئے پیتے ہیں اور اپنے غم کو غلط کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کبھی حالات ان کے دل ودماغ کو شل کر دیتے ہیں اور وہ اسی ظالم کے ہاں پناہ لیتے ہیں۔ کبھی اعلیٰ ادب تخلیق کرنے کے لئے شراب پیتے ہیں اور بے حد خوب صورت کہانیاں لکھتے ہیں۔ اور کبھی اپنے اندر کی تنہائی اور بے بسی میں کچھ کھوجنے اور پانے کے لئے اس زہراب کا سہارا لیتے ہیں۔ کبھی لکھنے کے لئے شراب پیتے ہیں اور کبھی پینے کے لئے لکھتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کو لات مار کر جب پھر بمبئی لوٹتے ہیں تو اپنے اندر پھر ایک خالی پن کا احساس ہو جاتا ہے اور بے تحاشا پی کر اپنے آپ کو شراب کے حوالے کرتے ہیں۔ اس دور کے ایک خط میں احمد ندیم قاسمی کو لکھتے ہیں:

"بہت زیادہ پینے لگا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ کچھ لکھوں۔ پی کر میں لکھ
ہی نہیں سکتا۔ دراصل میں اپنے اندر وہ بات ڈھونڈھ رہا ہوں جو

مجھے کرنا ہے اگر مجھے یہی کرنا ہے جو میں اب تک کر چکا ہوں تو یہ

کچھ بھی نہیں، کوئی بڑا کارنامہ نہیں"

دہلی کے قیام کا ذکر تازہ کرتے ہوئے ان کے دوست دیوان سنگھ مفتون نے راقم السطور کے استفسار کے جواب میں ایک بار لکھا تھا:

"جب وہ دہلی میں تھے تو قریب قریب ہر روز ہی میرے ہاں تشریف لاتے۔ اگر وہ دوپہر کو آتے تو بیئر پیتے اور اگر رات کو آتے تو میرے ساتھ برانڈی پیتے میں چاہتا تھا کہ وہ میری طرح ایک پیگ سے زیادہ نہ پئیں۔ مگر وہ کنٹرول میں نہ رہ سکتے تھے۔"

دہلی اور بمبئی کے قیام کے دوران منٹو کی آمدنی خاصی معقول تھی اور شراب ان کے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ لیکن پاکستان چلے جانے کے بعد ان کی مالی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ وہ وعدے جو اُن کے ساتھ کیے گئے تھے غلط ثابت ہوئے اور وہ کوڑی کوڑی کے لئے ترسنے لگے۔ بمبئی میں دوستوں نے ان کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ پاکستان میں انہوں نے جس تابناک مستقبل کا تصور کیا تھا اس کا کہیں نام ونشاں نہیں مل رہا تھا۔ ملک کے بٹوارے سے جو خون خرابہ ہوا تھا۔ اُس نے ان کے حساس دِل کو تڑپا دیا تھا۔ پاکستان کی شہریت قبول کرنے کے باوجود وہ ہندوستان اور پاکستان کے مشترکہ کلچر کو عزیز رکھتے تھے۔ لیکن بعد میں انہیں تقسیم کی اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا اور جب اپنے اندر کے فن کار کو انہوں نے لکھنے پر آمادہ کیا تو ایک ہنگامہ برپا ہوا۔ انہیں لطیفہ باز اور رجعت پسند قرار دیا گیا۔ تنگ آکر انہوں نے شراب کی مقدار زیادہ کردی اور آخر یہی شراب ان کے لئے سم قاتل ثابت ہوئی۔ منٹو ایک ہوش مندے خوار تھے اور زندگی میں کسی مرحلے پر شکست نہ کھانے والا یہ فن کار اپنے آخری ایام میں شراب سے ہار گیا۔

منٹو عام طور سے شام کو پیتے تھے اور پی کر بہک بھی جاتے تھے۔ حالانکہ انہیں اس بات کا زعم تھا کہ وہ کبھی بہکتے نہیں۔ زندگی کے آخری دنوں میں وہ رات دن پیئے ہوئے رہتے۔ رات کو ان کی آنکھ کھلتی تو بوتل تلاش کرتے۔ حتیٰ کہ انہوں نے زندگی کی تمام دلچسپیوں اور رعنائیوں سے منہ موڑ لیا اور جیا

کہ ذکر ہو چکا ہے کہ ان کی نفاست پسندی جواب دے چکی تھی اور بیوی بچوں کے ڈر سے بوتل غسل خانے میں چھپاتے اور وہیں پینے لگتے۔ ان کی ساری قوتِ ارادی ختم ہو چکی تھی۔ حامد جلال نے اس کی تصویر یوں کھینچی ہے:

"منٹو ماحول ایسی بوتل کو منہ سے لگا کر شراب پی لیتے تھے۔ جو ٹپکتے ہوئے
فلش کموڈ کے پیچھے رکھی ہوتی تھی ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جو
مجبوری حد سے زیادہ ہو۔"

لیکن اس کے باوجود کہ شراب ان کی رگ رگ میں اپنا زہر انڈیل رہی تھی اور ان کے قلم کی توانائی ختم ہو چکی تھی لیکن ایک جبلی قوت کے تحت وہ لکھنے سے باز نہ رہ سکتے تھے۔ انہوں نے ایک مجنونانہ کیفیت کے تحت افسانے لکھنا شروع کر دیئے اور روز کا افسانہ ہونے لگا۔ ذہن میں کسی موضوع نے ابھی ابتدائی خاکے کی صورت بھی قبول نہ کی ہوتی۔ کوئی پلاٹ سکیم متشکل بھی نہ ہوئی ہوتی کہ وہ قلم تھام کر ٹیڑھی میڑھی تحریریں لکھنے لگے۔ اس زمانے میں بھی انہوں نے بعض اوقات اپنی زبردست ذہانت اور طباعی کا ثبوت فراہم کیا۔ کسی کی زبان سے کوئی توجہ انگیز جملہ نکلتا تو انہیں افسانہ لکھنے کی تحریک ملتی اور اسی جملے سے وہ کہانی کا آغاز کرتے۔

شراب جو کسی زمانہ میں ان کے ذہن کے گوشے کھول دیتی تھی۔ رفتہ رفتہ ان کو اندر ہی اندر بھسم کرنے لگی۔ ان کے آخیری دور کی کہانیاں انتہائی گھٹیا درجے کی ہیں اور محض شراب کے لئے لکھی گئی ہیں۔ اس دور کی کہانیوں میں نہ پلاٹ کی شگفتگی ہے اور نہ اسلوب کا بانکپن۔ حتیٰ کہ ان کی سب سے بڑی مداح بیگم صفیہ منٹو بھی ان کی تحریروں سے اُوب گئیں۔ محمد اسد اللہ نے اپنی کتاب میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"صفیہ کہتی تھیں کہ میں صرف سعادت صاحب کو پڑھا کرتی تھی اب یہ
جس قسم کی چیزیں لکھتے ہیں۔ وہ قطعاً گھٹیا ہیں۔ اس سے ان کے نام
پر حرف آتا ہے۔ اب یہ صرف شراب ہی کے لئے لکھتے ہیں۔ اس میں

سے ایک پیسہ بھی مجھے نہیں ملتا۔"

انہی کا ایک اور بیان ملاحظہ ہو:۔

"تانگہ لیا جاتا۔ مکتبہ کارواں آخیری دنوں میں واحد منزل بن گئی تھی مکتبہ کارواں کے مالک چودھری حمید جو فلاسفی میں ایم' اے ہیں بڑی سوجھ بوجھ کے مالک ہیں۔ تانگہ دیکھتے ہی ۲۰ روپے نکال رکھتے کہانی لیتے ۲۰ روپے دیتے، منٹو زور سے سلام علیکم کہہ کر تانگہ پر سوار ہو جاتے۔ تانگہ کا رُخ "انگلش واین ہوس" کی طرف کرایا جاتا۔ ساڑھے تیرہ روپے کی منٹو شراب لیتے' ایک روپیہ تانگے والے کا' ایک روپیہ کے کیپسٹن سگریٹ آٹھ آنے دن بھر کے لئے موںی وغیرہ خریدنے کے لئے"

ایسی صورت میں کافی زود نویس بن گئے تھے۔ کہانی نام کی کہانی ہوتی۔ سعادت حسن منٹو مر چکا تھا۔ انہوں نے اب اپنی ذات کو اخلاقی ذمہ داریوں سے بھی سبکدوش سمجھ لیا۔ مثلاً اس زمانہ میں انہوں نے اپنی مطبوعہ کتابوں میں سے افسانے چن کر نئے مجموعوں میں شامل کر کے چھپوانے کا اہتمام کیا۔ بعض اوقات ان افسانوں کے عنوان بدل دیتے اور رسائل میں از سر نو شایع کرواتے۔ حد تو یہ کہ دوسرے لوگوں کے افسانے جو ان کے پاس تصیح کے لئے آتے تھے اپنے نام سے چھپوا لیتے یہ وہی منٹو تھے جو کسی سوچی سمجھی سکیم کے بغیر اپنے ڈرامے ٹائپ کرتے تھے اور جن کا قلم ۸۶، کے اعداد لکھنے کے بعد شاہکار افسانے تراش لیتا تھا۔ جو کسی بھی جملے سے کہانی شروع کر کے اسے تکمیل تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن مے نوشی کے اس پڑاو پر پہنچ کر ان کے برے اور بھلے کو تمیز کرنے کی صلاحیت سلب ہو چکی تھی۔ ان کے تخلیقی ذہن کے سوتے سوکھ گئے تھے اور وہ شراب کے ہاتھوں بے بس ہو چکے تھے۔ یہ ان کے ذہنی افلاس کا کلائمیکس تھا۔ لیکن اس افلاس کے باوجود ان کو وضعداری کا احساس تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں ایک بار نریش کمار شاد ان سے ملنے گئے۔ منٹو اس زمانہ میں قلاش تھے اسلئے بجائے اس کے کہ وہ خود شاد کی خاطر تواضع کرتے اُلٹا ان سے ہی شراب کے لئے پیسے طلب کئے۔ لیکن لڑکھڑاتی

زبان میں اعتراف کیا:

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں مدعو کرنے کے بجائے الٹا تم سے خرچ کروایا۔

یار! خدا کی قسم سعادت حسن منٹو بڑا رذیل آدمی ہے"

قیام پاکستان کے بعد ہندوستان سے پاکستان کی ہجرت منٹو کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ بمبئی میں بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ کشیدگی کا تناؤ، فلمستان میں ہندو فرقہ پرستی کا دباؤ اور اس کے تحت ان کو ملنے والے دھمکی آمیز خطوط، اُن کی انا اور خودداری کی قوت کو چیلنج، پاکستان میں خوش حال مستقبل کی ضمانت، مذہبی جنون سے بالاتر، انسان دوست منٹو کو پاکستان کی ہجرت پر مجبور کر گئی۔ لیکن پاکستان ان کے لئے ایک خواب ثابت ہوا۔ اسی زمانہ میں منٹو نے لکھا تھا:

"سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان اور وہ لہو کس کا ہے جو ہر روز اتنی بے دردی سے بہایا جا رہا ہے۔ وہ ہڈیاں کہاں جلائی یا دفن کی جائینگی جن پر سے مذہب کا گوشت پوست چیلیں اور گدھ نوچ نوچ کر کھا گئے تھے۔ ہندو اور مسلمان دھڑا دھڑ مر رہے تھے، کیسے مر رہے تھے کیوں مر رہے تھے؟ ان سوالوں کے مختلف جواب تھے۔ بھارتی جواب، پاکستانی جواب، انگریزی جواب۔ ہر سوال کا جواب موجود تھا۔ مگر اس جواب میں حقیقت تلاش کرنے کا سوال پیدا ہوتا تو اس کا کوئی جواب نہ ملتا۔ کوئی کہتا اسے غدر کے کھنڈرات میں تلاش کرو۔ کوئی کہتا یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ملے گا کوئی اور پیچھے ہٹ کر اسے مغلیہ خاندان کی تاریخ میں ٹٹولنے کے لئے کہتا۔ سب پیچھے ہی پیچھے ہٹتے جاتے تھے اور قاتل اور سفاک برابر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔"

منٹو کا مذہب انسانیت تھا۔ ان کی نظر میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، یہودی سب ایک

تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں یہ سب لوگ چلتے پھرتے حرکت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اسلام ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی اور اسے دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔ ان کی کوئی تحریر ۷۸۶ کے اعداد کے بغیر نہیں لکھی جاتی۔ اگرچہ وہ بادہ نوش تھے۔ لیکن شراب کے نشے میں دھت رہ کر بھی وہ اپنے مذہبی عقائد سے بے گانہ نہ رہے۔ ایک بار فلم ایکٹریس پارو دیوی کے یہاں محفل رقص و سرود جمی ہوئی تھی۔ فلمی دنیا سے متعلق بہت سے لوگ جمع تھے۔ سب لوگ ہوش و حواس کھوئے ہوئے پی رہے تھے۔ پارو نے ٹھمریاں، غزلیں اور گیت پیش کئے اور آخر میں ایک نعت شروع کی لیکن منٹو نے اس حال میں بھی کہ وہ مدہوش تھے کہا:۔

"پارو دیوی! یہ محفل نشاط ہے۔ شراب کے دور چل رہے ہیں۔ یہاں کالی کملی والے کا ذکر نہ کیا جائے تو اچھا ہے۔"

پاکستان چلے جانے کے بعد کچھ عرصہ تک وہ کچھ بھی نہ لکھ پائے۔ پھر ہلکے پھلکے مضامین سے شروعات کیں اور پھر بند ٹوٹ گیا۔ ٹھنڈا گوشت، کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ ایک کے بعد ایک شاہکار ان کے قلم سے باہر آیا۔ لیکن ان گنت افسانے لکھنے کے باوجود انہیں اطمینان حاصل نہ ہو سکا۔ مالی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ کافی محنت کے باوجود وہ بہتر زندگی گزار نہ سکے۔ خاندان کے افراد ان سے نالاں تھے۔ چند سال سسرال کے سہارے زندہ رہے اس سے ان کی انا اور بھی مجروح ہوئی۔ انہیں احساس ہونے لگا کہ ذلت کی زندگی گزار رہا ہوں۔ تب انہوں نے بے تحاشا پینا شروع کر دی۔ وہ اس ذہنی یکسوئی اور اطمینان سے یکسر محروم ہو گئے جو تخلیقی فن کاروں کو اپنے تجربات کی داخلی نشوونما کے لئے ناگزیر ہوتا ہے۔ اب ان کے افسانے ذہن کے بجائے جیب سے نکلتے۔ صفیہ بیگم ان سے اصرار کرتیں کہ وہ لکھنا ترک کر کے کوئی اور کام شروع کر دیں۔ شراب پی کر وہ بے ہوش ہو جاتے لگے۔ حتیٰ کہ اس لت کو چھڑوانے کے لئے ان کو پاگل خانے بھی بھیج دیا گیا۔ لیکن وہاں سے جب چھوٹے تو چلا اٹھے:۔

"چھوٹے پاگل خانے سے نکل کر بڑے پاگل خانے میں آ گیا ہوں۔"

اب ان کا کھانا بھی برائے نام رہ گیا تھا۔ شراب کے بغیر وہ رہ نہیں سکتے تھے۔ شراب نے ان کے جسم کو اندر

ہی اندر خاکستر کر دیا تھا۔ وہ کافی ناتواں ہو چکے تھے۔ ہسپتال میں رہ کر بار بار موت کے دہانے سے ان کو واپس گھسیٹ لیا گیا تھا۔ لیکن ہر بار اپنی اسی دیرینہ عادت کے سامنے بے بس ہو جاتے۔ ایک بار ان کی چہیتی بیٹی ٹائیفائیڈ سے بیمار تھی۔ علاج کے لئے پیسہ چاہیے تھا۔ اور گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ منٹو نے قرض لیا۔ لیکن دوا کے بجائے وسکی لے آئے۔ یہ ان کی سب سے بڑی شکست تھی۔ شراب نے ان کے احساسات کی متاع بھی چھین لی تھی۔ ان کے عیار دوست ان کو پھر شراب کی بھٹی میں جھونکنے میں کامیاب ہوئے اگرچہ وہ کئی بار توبہ کر چکے تھے۔ یہ ریاکار دوست ان کو اس لئے شراب پلاتے تاکہ بقول مولانا صلاح الدین احمد کل کو یہ کہہ سکیں کہ ہم نے منٹو کے ساتھ شراب پی ہے۔

منٹو کے ہم زلف اور بھانجے حامد جلال نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ایک روز کچھ لوگ گجرات سے ایک برہنہ لاش لے آئے۔ اس عورت اور اس کی ننھی سی بچی کو ایک بس اڈے سے اغوا کیا گیا تھا۔ نصف درجن لوگوں نے اس کے ساتھ زنا کیا۔ جسم پر لباس کا تار بھی نہ بچا تھا۔ ماں بچی دونوں سردی میں منجمد ہو گئے تھے۔ اس واقعے سے منٹو کو زبردست ہیجان ہوا۔ منٹو اس المناک سانحے کو کہانی میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ چنانچہ شراب زیادہ مقدار میں پی لی۔ جو ان کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔

مرنے سے ایک روز قبل منٹو سارے لاہور میں گھومے تھے۔ ریستوران میں اپنے احباب کے ساتھ گپ شپ میں شریک ہوئے تھے۔ رات کو گھر لوٹے۔ اچانک خون کی قے آ گئی۔ شاید ان کا جگر پھٹ گیا تھا۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ انجکشن لگوائے گئے اور انہیں ہسپتال پہنچانے کے لئے مشورہ دیا گیا۔ لیکن وہ بولے۔ "اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ مجھے ہسپتال نہ لے جاؤ اور یہیں سکون سے پڑا رہنے دو" ان کو اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا اور وہ بڑے سکون اور ضبط کے ساتھ موت کا انتظار کر رہے تھے۔ اس حال میں انہوں نے اصرار کیا ــــــ

"میرے کوٹ کی جیب میں ساڑھے تین روپے پڑے ہیں۔ ان میں کچھ اور پیسے ملا کر تھوڑی سی وہسکی منگا دو"۔

چنانچہ اس حال میں بھی انہیں پلائی گئی اور جب ایمبولنس میں انہیں لٹا دیا گیا انہوں نے آخری بار پھر

شراب کا تقاضہ کیا۔ "ایک چمچہ وہسکی ان کے منہ میں ڈال دی گئی لیکن شاید ایک قطرہ بھی ان کے حلق کے نیچے نہ اتر سکا اور ان پر غشی طاری ہو گئی" اور ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

حامد جلال لکھتے ہیں:۔

"بستر مرگ پر منٹو ماموں نے شراب کے سوا کوئی اور چیز نہیں مانگی۔ انہیں بہت پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ شراب ان کی جانی دشمن ہے۔ وہ اسے موت کے ہم معنی سمجھنے لگے تھے جس پر جسمانی فتح کسی صورت میں ممکن نہیں۔ جس طرح موت کے آگے کوئی انسان پیش نہیں پا سکتا۔ اسی طرح منٹو ماموں شراب کے سامنے بالکل بے بس ہوتے تھے لیکن ان کی فطرت چونکہ باغیانہ تھی اسلئے انہوں نے موت سے بھی بغاوت کی تھی۔"

منٹو بحیثیت ناول نگار

سعادت حسن منٹو کی عظمت کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ان کی عظمت اور انفرادیت کا ایک زبردست ثبوت یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور فن نہ صرف ان کے معاصرین کے لئے بلکہ ان کے بعد بھی بے حد متنازعہ فیہ رہا ان کے بیشتر افسانوں نے بحث و تمحیص کے دفتر کھول دیئے۔ فرانس کے مشہور افسانہ نگار موپساں کی طرح ان کی زندگی اور فن کا ماحصل مختصر افسانہ ہے۔ اگر وہ افسانوں کے بغیر کچھ اور نہ لکھتے تو بھی بقائے دوام کے دربار میں نظر آتے۔ لیکن انہوں نے صرف اس میدان تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے مکتوبات، مضامین، خاکوں، ڈراموں، ترجموں، انشائیوں اور فلمی کہانیوں سے بھی اپنا لوہا منوایا۔ انہوں نے ناول نگاری کے میدان میں بھی اپنے قلم کی توانائی آزمائی، حالانکہ یہ ان کا میدان نہیں تھا۔

بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں جب کرشن چندر نے اپنا پہلا ناول "شکست" لکھا تو اردو کے ادبی حلقوں میں ایک بھونچال سا آگیا تھا۔ اس ناول کو پڑھ کر منٹو، اشک، فیض، چراغ حسن حسرت اور کئی لوگ انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ مدتوں کے بعد ایک اچھا ناول سامنے آیا تھا۔ یہ سبھی لوگ ایک اچھے ناول کی تخلیق کے لئے پر تولنے لگے لیکن کرشن چندر کے چیلنج کا فوری طور مقابلہ نہ کر سکے۔ منٹو نے اسی دور کے آس پاس ایک ناولٹ "بغیر عنوان کے"

لکھا جوان کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ "کارواں" میں قسط وار شائع ہوتا رہا اور بعد میں کتابی صورت میں سامنے آیا۔ کئی برسوں کے بعد انہوں نے "تکلیف" کے عنوان سے ایک اور ناول لکھا جو مکمل نہ ہو سکا۔

ناول نگاری منٹو کا میدان نہیں۔ اس کے لئے ایک صبر آزما مزاج اور وقت کی فراوانی چاہیئے۔ یہ دونوں چیزیں منٹو کے پاس نہیں تھیں راقم السطور نے ایک بار ان کے دوست اور ہمعصر کرشن چندر کی توجہ اس طرف مبذول کی تھی انہوں نے کہا تھا:

"منٹو بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے اور اس کے ساتھ ہی کسی قدر عجلت پسند۔ لہٰذا انہوں نے ناول نہیں لکھے۔"

اس بات کی تصدیق محمد اسد اللہ کی کتاب "منٹو میرا دوست" سے بھی ہوتی ہے۔ منٹو کی ناول نگاری کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ میرے ایک دوست نے ان سے پوچھا منٹو صاحب! آپ ناول کیوں نہیں لکھتے؟ منٹو صاحب کا جواب تھا۔
یہاں روز پینے کے لئے پیسہ چاہیئے۔ روز افسانہ لکھتے ہیں۔ روز کا روز معاوضہ مل جاتا ہے۔ اب ناول کون لکھے"۔

سلیم چودھری نے اپنے ایک مضمون "سعادت حسن منٹو" میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قیام پاکستان کے دوران منٹو نے اس صنف پر سنجیدگی سے سوچا تھا اور ایک معرکتہ آرا ناول لکھنا شروع کیا تھا جو ان کی عجلت اور عدیم الفرصتی کی نذر ہوا اور منظر عام پر نہ آسکا۔ یہ ناول تحریکِ آزادی کے پس منظر میں لکھا گیا تھا اور قیام پاکستان تک کے عہد کا احاطہ کرتا تھا۔ اس کا پورا خاکہ منٹو کے ذہن میں تھا لیکن وہ ایک یا دو باب سے آگے نہ لکھ سکے۔ سلیم چودھری اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں:

"اس دوران ناول نگاری کی بات شروع ہوئی تو میں نے پوچھا۔ منٹو صاحب! آپ تو ناول لکھ رہے ہیں جن کا اشتہار بھی چھپتا رہا ہے کس مرحلہ پہ ہے آپ کا ناول؟

"یار میں نے کئی بار اسے شروع کیا لیکن ایک دو باب سے آگے کبھی نہ لکھ سکا"
انہوں نے جواب دیا۔
اصل میں بات یہ ہے کہ ناول طویل نشست چاہتا ہے اور میں اپنی افتادِ
طبع کی وجہ سے جم کر بیٹھ نہیں سکتا۔ ویسے میرے ذہن میں ناول کا تفہیم
ہی نہیں بلکہ اس کا پلاٹ پوری جزئیات سمیت مکمل ہے۔ سناؤں تمہیں"
..... ناول کیا تھا ایک ساگا تھا۔ جس میں انہوں نے جلیانوالہ باغ
امرتسر کے حادثہ سے لے کر قیام پاکستان تک شمالی ہندوستان کی تہذیبی
تمدنی اور سیاسی تاریخ کو اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں ایک جگہ جمع
کردیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ جو کچھ انہوں نے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے عرصہ
میں زبانی طور پر سنایا تھا۔ اگر وہی صفحہ قرطاس پر منتقل ہوجاتا تو ناول نگاری
کی تاریخ میں ایسے باب کا اضافہ ہوتا جو آنے والی نسلوں کے لئے
ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا۔"[1]

یہ بات صحیح ہے کہ بٹوارے کے بعد جب وہ پاکستان چلے گئے تو وہ مفلس وقلاش ہو چکے تھے لاہور میں جس سنہری مستقبل کی بشارت انہیں ملی تھی وہ ایک سراب ثابت ہو چکا تھا۔ مسلسل مایوسیوں نے ان کا ذہن شل کردیا تھا انہیں روز شراب چاہیئے تھی۔ روز کا افسانہ لکھتے اور اسے پیشگی بیچ کر بوتل کی قیمت وصول کرتے اور پھر یہ حقیقت کہ ناول نگاری کے لئے ان کا مزاج نہیں بنا تھا تاہم اس صنف میں انہوں نے سنجیدگی سے قلم اٹھایا ہوتا۔ تو یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اردو ناول نگاری کے فن میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہوتا۔ جو منٹو سے عبارت ہوتا۔

"بغیر عنوان کے" ایک مختصر ناولٹ ہے۔ جسے آٹھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ منٹو نے اسے احمد ندیم قاسمی کے نام ایک خط میں افسانہ کہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ منٹو جب اسے لکھ رہے تھے تو ان کے ذہن میں افسانے ہی کا خاکہ ہو جسے

[1] ادب لطیف لاہور فروری ۱۹۵۵ء ص ۷۔

بعد میں انہوں نے پھیلادیا اور ایک بڑے کینواس پر پیش کیا۔ ایک اور دلچسپ بات ہے کہ اس ناولٹ کے دوسرے اور تیسرے باب کو منٹو نے ایک علیحدہ افسانے کی صورت میں تحریر کیا تھا۔ جسے نقوش لاہور کے افسانہ نمبر بابت نومبر ۱۹۶۸ء (شمارہ ۱۱۰) میں نقوش کے مدیر نے "راجو" کے عنوان سے شایع کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک نوٹ لکھا ہے کہ یہ منٹو کی غیر مطبوعہ کہانی ہے۔ افسانے کی اختتامی چھ سطور خود منٹو کے ہاتھ کی تحریر کا عکس ہیں۔ جن کے نیچے سعادت حسن منٹو کے دستخط ہیں اور ۱۲ فروری ۱۹۵۵ء کی تاریخ درج ہے۔ اس تحریر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ افسانہ منٹو کی موت سے صرف تین دن پہلے لکھا گیا ہے اور اس کے بعد انہوں نے صرف ایک افسانہ "کبوتر اور کبوتری" کے عنوان سے لکھا۔ اس وجہ سے بھی اس افسانے کی بڑی اہمیت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "بغیر عنوان کے" ناولٹ کے دوسرے باب کا بیشتر حصہ اور تیسرے باب کے چند جز و اس افسانے میں مکمل طور سے نقل کئے گئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ "بغیر عنوان کے" کا ہیرو سعید ہے اور اس افسانے میں واحد غائب "وہ" ہے۔ بعض مقامات پر چند فقرے حذف کئے گئے ہیں۔ دونوں کے متن میں نوکرانی کے تئیں ہیرو کی نفرت کا اظہار ملتا ہے جس کے پس پشت دراصل اس کی پسندیدگی کا جذبہ کارفرما ہے۔ "راجو" (افسانے) میں اس جذبے کا اظہار کفایت الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے اور ناولٹ "بغیر عنوان کے" میں اس کو ذرا وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ لیکن بات ایک ہی ہے۔ ہاں البتہ اس کے بعد ناولٹ کو جس سمت میں موڑ دیا گیا ہے، افسانے کی سمت اس سے ذرا مختلف ہے۔ ناولٹ میں راجو، سعید کے تحت الشعور میں دبی رہتی ہے اور وہ بھاگ کر لاہور چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ آخر میں مس فریا کی باہوں میں دھنس کے رہ جاتا ہے۔ اس کے برعکس راجو (افسانے) میں وہ گھر سے بھاگ کر راجو کے ساتھ شادی کرتا ہے۔ ناولٹ کے اختتام پر قاری کچھ غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جو منٹو کا خاص بنیترا ہے۔ لیکن راجو نام کے افسانے میں یہ بات نہیں ملتی۔ راجو (افسانے) کا اختتام عامیانہ ہے۔ اور اس میں منٹو کی کہانیوں کے فن کارانہ اور چونکا دینے والے اختتام کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔

"بغیر عنوان کے" جیسا کہ ذکر ہو چکا آٹھ ابواب پر مشتمل ناولٹ ہے۔ اس میں صرف چار کردار اہم ہیں، سعید، عباس، راجو اور مس فریا۔ ناولٹ کا موضوع ایک کمزور سے نوجوان کی نفسیاتی کشمکش ہے جو مخلف قسم کی جوان

عورتوں کی قربت میں رہ کر مختلف نفسیاتی کیفیات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کا عمل اور ردعمل اس کے نفسیاتی ہیجانات کی عکاسی کرتا ہے۔ ناولٹ کا ہیرو سعید ایک کنوارہ نوجواں ہے۔ جس پر خبط سوار ہے کہ اسے عشق کیوں نہیں ہوتا۔ جبکہ اس کے احباب اور دوست بڑی ڈینگیں مار کر اپنے معاشقوں کا تذکرہ کرتے ہیں آخر وہ ان تمام لڑکیوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہے جو اس کی نظروں کے سامنے روز گزرتی ہیں۔ ان کے ساتھ عشق کرنے کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کوئی بھی لڑکی اس کی نگاہوں میں کھب نہیں جاتی۔ کوئی ہندو ہے جس کے ساتھ عشق کر کے فرقہ وارانہ فسادات رونما ہو سکتے ہیں۔ کسی کی منگنی کالومل جیسے گرانڈیل دیو سے ہو چکی ہے۔ کوئی کسی کٹر مولانا کی دختر نیک اختر ہے، جس کا تصور کرتے ہی سعید کی آنکھوں کے سامنے مسجد کی چٹائیاں آجاتی ہیں اور کسی کے دونوں ہاتھ عشق سے بھرے ہوئے ہیں۔ آخر اس کی نظریں سوداگروں کی نوکرانی راجو پر ٹھٹھک کر رہ جاتی ہیں۔ راجو چار بھائیوں کے کنبے کی نوکرانی ہے۔ یہ چاروں باری باری اس لڑکی کو "عورت" بنا چکے ہیں۔ اس لئے اس میں ایک نہیں تین چار عورتیں اکٹھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ایک رات گلی میں شور وغل سن کر سعید جاگ پڑتا ہے اور گلی میں اس لڑکی کو لالٹین کے کھمبے کے نیچے ننگ دھڑنگ دیکھتا ہے۔ سوداگروں کا چھوٹا بھائی راجو کی منتیں کرتا ہے کہ وہ کمرے کے اندر چلی آئے کیونکہ اس طرح سے رسوائی کا امکان ہے لیکن راجو متوقع مظالم سے ڈر کر کمرے کے اندر جانے سے انکار کرتی ہے۔ سعید جو فاصلے سے اس منظر کو دیکھ رہا ہے اپنے اندر اس لڑکی کے لئے رحم کا جذبہ محسوس کرتا ہے۔ لیکن دوسرے دن جب وہ سوداگروں کے ہاں سے بھاگ کر سعید کے گھر میں نوکرانی کی حیثیت سے پناہ لیتی ہے۔ تو سعید کے دل میں رحم اور نفرت کے ملے جلے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس اثنا میں وہ نمونیہ کا شکار ہو جاتا ہے اور سخت بخار میں ہذیانی کیفیت کے ماتحت راجو سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ اس دوران اسے علاج کے لئے ہسپتال میں داخلہ لینا پڑتا ہے۔ جہاں وہ مس فریا نام کی ایک شوخ وشنگ نرس کو التفات کی نظروں سے دیکھتا ہے اور اس سے دوستی کا متمنی ہوتا ہے۔ صحت یاب ہونے کے بعد جب وہ واپس گھر لوٹتا ہے۔ تو اس کی مڈ بھیڑ پھر راجو سے ہوتی ہے۔ اس کے تئیں وہ پھر نفرت کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ وہ اس سے نفرت بھی نہیں کرنا چاہتا۔ محبت کے بارے میں اس کا نظریہ یہ ہے کہ عورت ساری کی ساری اس کی ہو۔ وہ عاشق اور ڈکٹیٹر میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس کے مطابق جو عورت ایک ہی دسترخوان پر بڑے ہی

سلیقے سے چار بھائیوں کو کھلا چکی ہو اس سے محبت کرنا بے معنی ہے "تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے جب سعید لاہور چلا جاتا ہے تو وہاں اس کی ملاقات ایک بار پھر مس فریا سے ہوتی ہے جسے کوئی شخص دھوکہ دیکر ہسپتال سے بھگا لایا ہے، شادی کر لی ہے اور ایک رات بے یار و مددگار چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا ہے فریا سعید کے قریب آ جاتی ہے اس کے ساتھ ہوٹل میں قیام کرنے لگ جاتی ہے اور بڑے خلوص کے ساتھ سعید کو جسمانی محبت پیش کرتی ہے۔ لیکن سعید اس سے احتراز کرتا ہے۔ سعید اسے کہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ محبت نہیں کر سکتا۔ محبت تو کسی اور کے ساتھ کر چکا ہے جس سے وہ نفرت کرتا ہے۔ لیکن آخر فریا کی جلتی ہوئی باہنوں میں نڈھال ہو جاتا ہے۔

اس بظاہر معمولی پلاٹ کے کینڈے میں جس گہرائی اور بصیرت کے ساتھ منٹو نے ناول کے ہیرو کی جذباتی اور ذہنی کشمکش پیش کی ہے اردو ناول کی تاریخ میں اس کی کم مثالیں ہیں۔ جدید ناول دروں بینی کا فن ہے۔ اور کرداروں کی جذباتی زندگی کی غمازی کرتا ہے۔ منٹو نے یہ کارنامہ آج سے لگ بھگ پینتالیس سال قبل انجام دیا ہے۔ حیرت ہے کہ اردو کے کسی ادبی مورخ اور نقاد (بالاستثنائے ڈاکٹر یوسف سرمست) نے اس کی طرف توجہ نہیں کی ہے اور اردو کا یہ اہم ناولٹ نظر انداز ہو کر رہ گیا ہے۔ "بغیر عنوان کے" کرداری ناول ہے اور عصمت چغتائی کی ٹیڑھی لکیر کی طرح اس میں سوانحی انداز ہے۔ یہاں ناولٹ کے ہیرو سعید کے خیالات کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اسی اساس پر سعید کا کردار تعمیر ہوتا ہے۔ جو ناولٹ پر چھایا ہوا ہے۔ باقی کردار محض اس کا سایہ ہیں۔ پلاٹ میں واقعات کی بنت ڈرامائی ہے۔ واقعات کے سہارے سے مختلف خیالات اور نظریات سامنے آتے ہیں۔ نظریات کے ٹکراؤ سے کردار ابھرتے ہیں۔ مثلاً سعید کا دوست عباس، اپنے نظریۂ عشق کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

> "میں ایسی محبت کا قائل نہیں جو دق یا سل کے روگ کی طرح ہمیشہ کے لئے چمٹ جائے۔ میں زیادہ سے زیادہ ایک یا دو برس عورت سے عشق کر سکتا ہوں اور بس۔"

یا

"مجھے عورت چاہیئے، عورت، گرم گرم گوشت والی عورت جس کے

گالوں پر میں اپنی محبت کے سرو توس سینک سکوں۔"

مگر سعید اس نظریے کی نفی کرتا ہے۔ وہ عباس پر واضح کرتا ہے۔

"محبت وہ چیز نہیں جس کا ذکر تم کرتے ہو۔ تم ایک عورت سے صرف ایک برس تک محبت کرنے کے قابل ہو مگر میں عمر بھر کا پٹہ لکھوانا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے کسی سے عشق ہو جائے ..... تو میں اسی پر اپنی ملکیت چاہتا ہوں...... وہ عورت ساری کی ساری میری ہونی چاہیئے۔ اس کا ایک ایک ذرہ میری محبت کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ عاشق اور ڈکٹیٹر میں کچھ زیادہ فرق نہیں سمجھتا۔ دونوں طاقت چاہتے ہیں۔ دونوں حکمرانی کی آخری حد کے خواہش مند ہیں...... اگر تمہاری شہوت کی بھوکی عورت سے ملاقات ہو جائے تو تم کیا کہو گے۔ میں نے عشق لڑایا ہے....... یہ محبت نہیں، محبت کچھ اور ہے۔ میں یہ نہیں کہتا محبت ایک نہایت پاک جذبہ کا نام ہے اور جیسا ہمارے بزرگ کہتے ہیں کہ یہ شہوت سے ملوث نہیں ہوتی۔ میں اس کو بھی نہیں مانتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے معلوم ہے محبت کیا ہے ...... مگر......... میں واضح طور پر اپنا مافی الضمیر بیان نہیں کر سکتا۔"

اس طرح سے عباس اور سعید کی افتادِ طبع کا علم ہوتا ہے، بلکہ دونوں کے کردار ابھرتے ہیں۔ یہ دراصل سعید کے جذبات ہیں جن کے آئینے میں ہم عباس، راجو، مس فریا، اور دوسرے چھوٹے کرداروں کو دیکھ سکتے ہیں۔ سعید کی نوکرانی، راجو سوداگروں کے گھر میں رہ کر اپنی بے چارگی اور مفلسی کے ہاتھوں لٹ جاتی ہے۔ حالات نے اسے مجبور کیا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ اپنے مالکوں کے سپرد کر دے۔ لیکن اس کے باوجود وہ وہاں سے بھاگ کر سعید کے گھر میں پناہ لیتی ہے۔ یہاں سعید بھی بے خیالی میں اس کی طرف جھک جاتا ہے۔ لیکن

پھر اسے راجو سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔ "بغیر عنوان کے" کی کہانی محبت اور نفرت کے اس نفسیاتی امتزاج کی کہانی ہے۔ جسے منٹو نے انتہائی فن کاری سے پیش کیا ہے۔

جدید ناول کا فن درون بینی کا فن ہے۔ یہ خارج کو نہیں، داخل کو پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید ناول میں انسان کی نفسیاتی اور جذباتی زندگی کی مصوری پر زور دیا جاتا ہے۔ منٹو نے برسوں پہلے اس راز کو سمجھا تھا۔ سعید کے کردار میں دراصل منٹو نے انسان کی دوہری شخصیت کی تحلیل نفسی کی ہے۔ ایک انسان بیک وقت ایک ہی شخص سے محبت بھی کر سکتا ہے اور نفرت بھی۔ انسان کے بے کل باطن میں جذبات کا یہ تضاد اور ٹکراو بظاہر بے ہنگم لگتا ہے۔ لیکن اس کے پس پشت کتنی تہہ در تہہ الجھنیں ہیں۔ منٹو نے ان گرہوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے جب ایک کردار کے بعد دوسرا کردار آتا ہے۔ تو جذبات کے دبیز پردوں میں چھپی ہوئی سوچوں کی کئی پرتیں اٹھ جاتی ہیں۔ سعید کے سامنے دو مسئلے ہیں۔ وہ راجو کی طرف ایک نفسیاتی جھکاؤ محسوس کرتا ہے۔ یہ دل کا معاملہ ہے۔ لیکن ایک سماج اور ایک معاشرے میں رہتا ہے اور اس کے فرد کی حیثیت سے اس کے قوانین اور ضوابط کے سامنے سر بھی جھکاتا ہے وہ ان لوگوں میں نہیں کہ ان ضوابط کے سامنے بغاوت کا نعرہ بلند کرے۔ وہ سماجی اقدار کا پاسدار ہے۔ اسلئے وہ راجو جیسی آبرو باختہ عورت سے نفرت کرتا ہے۔ لیکن یہ ہوش کی بات ہے بخار میں جب اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ تو اس کا دل اس کی زبان پر یوں آجاتا ہے۔ وہ راجو سے کہتا ہے۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔ اس لئے کہ تم محبت کرنے کے قابل ہو۔ اس لئے نہیں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ پھر کس لئے ـــــ کاش کہ میں اس کا جواب دے سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس لئے کہ تم نفرت کے قابل ہو۔ تم عورت نہیں بلکہ ایک سالم مکان ہو۔ ایک بہت بڑی بلڈنگ ہو۔ مگر مجھے تمہارے سب کمروں سے محبت ہے۔ اس لئے کہ وہ غلیظ ہیں، ٹوٹے ہوئے ہیں۔...... مجھے تم سے محبت ہے۔"

سعید کا خیال ہے کہ محبت کے بغیر مرد کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ نرس مس فریا جب اس پر چھا جانا چاہتی ہے تو وہ اپنے تحت الشعور کو چھپا نہیں پاتا وہ صاف الفاظ میں اس کے سامنے اعتراف کرتا ہے۔

"تمہیں حیرت ہو گی کہ مجھے ایک عورت سے محبت ہے جو محبت
کیئے جانے کے بالکل قابل نہیں ...... مجھے اس سے نفرت
ہے۔ بخدا اس کے نام ہی سے نفرت ہے لیکن حقیقت یہ ہے
کہ اس نفرت نے، اس حقارت نے میرے دل میں اس کی محبت کے
بیج بو دیئے ہیں۔"

"بغیر عنوان کے" میں بظاہر کوئی بڑا موضوع نظر نہیں آتا۔ اس میں نہ رومان کا رنگ ہے اور نہ سیاست کا آہنگ۔ بلکہ ایک عام انسان کی نفسیاتی ناآسودگی کی داستان ہے۔ سعید کی ناآسودگی کا سبب راجو اور صرف راجو ہے۔ جو اسے نفسیاتی کشمکش میں جھونک دیتی ہے۔ اسے ہسپتال کے وارڈ میں پہنچاتی ہے اور اسے اندر ہی اندر تڑپاتی ہے۔ منٹو کے فن کار قلم نے اس کرب کو ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔

منٹو انسانی نفسیات کے بناض ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں انسانی جبلت کے فطری تقاضوں کی عکاسی کی ہے۔ یہ خصوصیت ان کی کہانیوں میں شروع سے ہی نظر آتی ہے۔ اسلئے "شوشو" ہو یا "خوشیا" "ہتک" ہو یا "سوراج کے لئے" انسانی نفسیات کی دروں بینی ہر جگہ جھلکتی ہے۔ وہ انسان کے باطن میں اندر ہی اندر گہرائیوں میں غوطہ لگاتے ہیں اور وہ دُرِ نایاب نکال لاتے ہیں۔ جو زبان پر آکر چمک نہیں سکتے۔ وہ سماجی بندشوں اور اخلاقی احتساب کے تمام حصاروں کو توڑ دیتے ہیں اور انسان کی اصل اس کی فطرت، اس کے جبلی تقاضوں پر پڑے پردے سرکا دیتے ہیں۔ "بغیر عنوان کے" انسان کے جبلی تقاضوں کی کہانی ہے۔ منٹو کا ہیرو اپنی ناآسودہ جنسی جبلت سے مغلوب ہے لیکن ساتھ ہی اپنے معاشرے کی روایت، اس کے قواعد و ضوابط، اس کے طور طریقوں کے تابع ہے۔ اس لئے وہ اپنی خواہشات کو دبانے پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ مس فریا کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اس پر واضح کرتا ہے۔

"میں تم سے بارہا کہہ چکا ہوں۔ میں نے ایسی فضا میں پرورش پائی ہے۔

جہاں آزادیٔ گفتار اور آزادیٔ خیال بہت بڑی بدتمیزی تصور کی جاتی ہے۔ جہاں سچی بات کہنے والا بے ادب سمجھا جاتا ہے۔ جہاں اپنی خواہشات کا دبانا بڑا ثواب خیال کیا جاتا ہے۔"

اور اسی کشمکش میں مارا جاتا ہے۔ لیکن آخیر میں وہ اپنے فطری جنسی دباؤ کی چکی میں پس کر نڈھال ہو جاتا ہے اور مس فریا کی سلگتی ہوئی باہنوں میں کھو جاتا ہے۔ اخلاقی اقدار پر فطری تقاضے غالب آجاتے ہیں۔

منٹو کا اسلوب منفرد ہے۔ جس طرح اپنے افسانوں میں انہوں نے زبان و بیان کا اپنا انداز اختیار کیا ہے جس کا کوئی مد مقابل نہیں۔ وہ شاعری نہیں کرتے اور نہ الفاظ کا اسراف۔ لیکن تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال ضرور کرتے ہیں۔ جن سے ان کا مافی الضمیر زیادہ واضح ہو جاتا ہے ان کی تراکیب بھی ان کے فن کے دوسرے لوازمات کی طرح ایک شانِ بے نیازی رکھتے ہیں۔ ان کے استعارے ہوں یا تراکیب وہ دوسرے لوگوں کی طرح کثرت استعمال سے گھسے اور پامال نظر نہیں آتے۔ ان میں ایک تازگی اور شادابی کا احساس ہوتا ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ لفظ 'ترکیب' استعارہ یا تشبیہ صرف اسی موقعے کے لئے گڑھ لی گئی ہے۔ کہانی کے چوکھٹے میں فٹ ہو کر یہ الفاظ اپنے معنی بدل دیتے ہیں اور ایک نئی دنیا سامنے آجاتی ہے۔ منٹو کے اسلوب کی یہ ندرت، جدت طرازی اور تیکھا پن ان کے فن کی رعنائی کا ایک اور ثبوت ہے۔ چند مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ لطیف اور اس میں اتنا ہی فرق تھا، جتنا لدھیانہ کی دری اور کشمیر کے گدگدے قالین میں۔

۲۔ اس کا ماتھا دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کہا کرتا۔ جب دیباچہ اتنا دلچسپ ہے تو معلوم نہیں کتاب کتنی دلچسپ ہوگی۔

۳۔ اس کے جسم کا ہر ذرہ بیوی تھا۔

۴۔ ناف کا گڈھا اس کے خمیرے آٹے جیسے پھولے ہوئے پیٹ پر یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کسی نے انگلی کھبودی ہے۔

۵۔ اس لڑکی کو دیکھ کر اس کی زبان پر وہی ذائقہ پیدا ہوا جو شلجم کا گودا چباتے وقت پیدا ہوتا ہے۔

منٹو کا یہ چھوٹا سا ناولٹ، ناول نگاری کے شعبے میں منٹو کا پہلا تجربہ تھا لیکن اس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اگر وہ اس شعبے میں اسی لگن اور فن کارانہ خلوص کے ساتھ توجہ کرتے۔ جو ان کی کہانیوں کا طرۂ امتیاز ہے تو اردو ناول نگاری میں ایک بالکل نئی ہجے کا اضافہ ہوتا اور ان کے بعد کے ناول نگاروں کی نسل اس سے متاثر ہوتی اور اردو ناول کا ایک نیا اسکول سامنے آجاتا۔ بہر حال اردو ناول کے فن کا مطالعہ کرتے ہوئے منٹو کے اس چھوٹے ناول کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

منٹو شناسی

سعادت حسن منٹو (نئے ادب کے معمار) — کرشن چندر — ۱۹۴۸ء — کتاب پبلشرز، بمبئی۔

منٹو — ابوسعید قریشی — ۱۹۵۵ء — ادارہ فروغ اردو، لاہور

منٹو میرا دوست — محمد اسداللہ — ۱۹۵۵ء — منٹو میموریل، کراچی

منٹو میرا دشمن — اوپندر ناتھ اشک — ۱۹۵۵ء — جمشید کتاب گھر، حیدرآباد

منٹو میرا دوست (پاکٹ بک) — ڈاکٹر کیول دھیر — مشورہ بک ڈپو، دہلی

سعادت حسن منٹو: اپنی تخلیقات کی روشنی میں۔ پروفیسر سید محمد حسن ۱۹۸۲ء — دارالاشاعت دہلی

سعادت حسن منٹو — انیس ناگی — ۱۹۸۴ء — مکتبہ جمالیات لاہور

منٹو: نوری نہ ناری۔ — ممتاز شیریں مرتب آصف فرخی۔ ۱۹۸۵ء۔ مکتبہ اسلوب، کراچی

سعادت حسن منٹو — حیات اور کارنامے — ڈاکٹر برج پریمی — ۱۹۸۶ء — دیپ پبلی کیشنز، سرینگر

سعادت حسن منٹو — ضیا ساجد — انجم بک ڈپو، دہلی

منٹو (انگریزی میں) — لزلی فلیمنگ۔ اپریل ۱۹۷۸ء — وین گارڈ بکس لمیٹڈ لاہور

منٹو نامہ ——— جگدیش چندر ودھاون ——— ۱۹۸۹ء ——— جگدیش چندر ودھاون، دہلی

منٹو: شخصیت اور فن ——— پریم گوپال متل ——— ۱۹۸۵ء ——— موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ماہنامہ نقوش لاہور ——— (منٹو نمبر) ——— محمد طفیل ——— ۱۹۵۵ء ———

ماہنامہ شاعر بمبئی ——— (منٹو نمبر) ——— اعجاز صدیقی ——— مارچ تا اپریل ۱۹۵۵ء

ماہنامہ پگڈنڈی امرتسر ——— (منٹو نمبر) ——— مہندر باوا / امریک آنند ——— اپریل و مئی ۱۹۵۵ء

ماہنامہ افکار کراچی ——— (منٹو نمبر) ——— صہبا لکھنوی ———

دستاویز، دہلی ——— (منٹو نمبر) ——— بلراج مین را ——— ۱۹۸۶ء ——— موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ماہنامہ روبی دہلی ——— (منٹو نمبر) ——— رحمن نیر ——— ۱۹۷۷ء ——— روبی پبلی کیشنز، دہلی

شعور، دہلی ——— (نمبر چار) ——— بلراج مین را ——— مارچ ۱۹۸۰ء ——— شعور پبلی کیشنز، دہلی

●

منٹو کی تحریروں میں ذکرِ غالب

غالب اور منٹو دو مختلف میدانوں کے شہ سوار ہیں۔ دونوں کے درمیان زمانی اور مکانی اعتبار سے کوئی قرب نہیں۔ ایک انیسویں صدی کا شاعر اور دوسرا بیسویں صدی کا افسانہ نگار۔ ایک کا پیشہ آبا سپہ گری اور دوسرے کے اسلاف تجارت پیشہ اور قانون دان لیکن اس کے باوصف دونوں میں حیرت انگیز مماثلت تھی۔ غالب کے سینے میں تخلیق کا جو شعلہ دہک رہا تھا۔ اس نے اس کی شخصیت کو تہہ دار بنایا تھا۔ یہی سبب ہے کہ سعادت حسن منٹو جیسا کج کلاہ اور انانیت پسند صرف ایک شخص کے سامنے ادب اور احترام کے ساتھ جھک جاتا ہے اور وہ ہیں مرزا اسداللہ خان غالب۔ منٹو زندگی بھر اپنی انا کے سہارے جیے۔ یہ ان کی کمزوری بھی تھی اور طاقت بھی۔ لیکن یہ انا اگر کہیں دبی تو وہ غالب کی عظمت کا ہالہ تھا جس کے سامنے منٹو کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ منٹو کی بیشتر تحریروں میں غالب کا ذکر مختلف انداز سے ملتا ہے۔ جس سے صاف طور پر اس صداقت کا احساس ہوتا ہے۔

مزاج کے اعتبار سے منٹو غالب کے ہمزاد تھے۔ دونوں بلا کے رند خرابات تھے۔ غالب کو ایک زمانے میں قرض کی شراب سے احتراز نہ تھا اور منٹو زندگی کے آخری ایام میں شراب کے ہاتھوں اس قدر

بے بس ہو گئے تھے کہ اپنا فن بیچ کر بلکہ دوسروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈال کر پیا کرتے تھے۔ غالب نے کہا تھا۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

غالب ہی کی طرح ممکن ہے منٹو نے اوائل جوانی میں عیش کوشی کے لئے پینا شروع کر دی ہو لیکن بعد میں بے خودی کا ہی معاملہ ہو گیا تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں غالب کو معاشی اور ذہنی پریشانیوں نے گھیر لیا تھا اور وہ مصیبتوں کو بھلانے کے لئے پینے لگے تھے۔ منٹو کی زندگی کے آخری ایام نہایت اذیت ناک تھے۔ ان کا ذہن شل ہو چکا تھا اور شراب ان کا تنہا سہارا رہ گیا تھا۔ دونوں کا غم ذاتی بھی تھا اور اس معاشرے اور نظام کا بھی جس میں وہ مر مر کر جی رہے تھے۔ غدر کے بعد غالب ٹوٹ گئے تھے۔ انہیں چاروں طرف ایک حبس کا احساس ہو رہا تھا۔ اس درد کا احساس واضح طور پر ان کی تحریروں اور خاص طور پر خطوط میں ملتا ہے۔ منٹو تقسیم ہندوستان کے المیے کے دوران جیسے اور فرقہ وارانہ فسادات کے دیکھتے ہوئے صحرا میں سے گزرے۔ ان کی کہانیاں اور ان کے مضامین جو اس دوران لکھے گئے ان کے باطن کے کرب کا واضح ثبوت ہیں۔ دونوں فن کار خارج کے مظاہر سے اسی طرح متاثر ہوتے ہیں۔ جس طرح باطن کے درد سے اور اپنے اپنے انداز میں اس اجڑے ہوئے دیار کی داستان سناتے ہیں جو ان کے دلوں میں بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

منٹو جیسا ذکر ہوا زبردست انانیت پسند تھے۔ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ وہ بمبئی کے ہفت روزہ "مصور" سے اسلئے علیحدہ ہو گئے کہ ان کے دوست اور مصور کے مالک نذیر لدھیانوی کے خلوص میں بال آ گیا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی کی ملازمت پر اس لئے لات ماری کہ کہانی کار اوپندر ناتھ اشک (جن کے ساتھ اس زمانے میں منٹو کا جھگڑا چل رہا تھا) کے کہنے پر ان کے نشر ہونے والے ڈرامے ترمیم کی زد میں آنے لگے تھے اور بمبئی کی فلم کمپنی "فلمستان" سے حاصل ہو رہی ہزاروں کی آمدنی چھوڑ کر پاکستان اس لئے چلے گئے کہ ان کے دوست اداکار اشوک کمار نے نذیر اجمیری کمال امروہی اور عصمت چغتائی کی فلمی کہانیوں کو ان کی کہانی پر ترجیح دیکر فلمانے کا پلان بنایا تھا۔ یہ سب منٹو کیلئے

ناقابل برداشت تھا اور انہوں نے اپنے مفادات کو خود اپنے ہاتھوں دفن کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ غالب بھی جب سفر کلکتہ کے دوران لکھنؤ میں ٹھہرے اور بعض احباب نے ان کی ملاقات سلطنت اودھ کے وزیر اعظم آغا میر سے کرانا چاہی لیکن یہ ملاقات اس لئے نہ ہو سکی کہ آغا میر نے غالب کی یہ شرط قبول نہیں کی کہ انہیں نقد نذرانہ پیش کرنے سے چھوٹ دی جائے اور کھڑے ہو کر ان کی پذیرائی کی جائے ان کی روشن ضمیری اور عزت نفس کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انہوں نے دہلی کالج کی فارسی مدرسی کو اس لئے ٹھکرا دیا کہ سیکرٹری حکومت ہند ٹامسن صاحب سے جب گھر پر ملنے گئے تو وہ اُن کے استقبال کے لئے دروازے پر نہیں آئے۔

—— دونوں باکمال انانیت کے مارے ہوئے تھے جو ان کی طاقت بھی تھی اور کمزوری بھی۔ غالب کی شاعری میں انسانی احساسات اور تجربوں کی پیچیدگیاں رمز و علایم کے حریری پردوں میں چھپی ہوئی ملتی ہیں۔ ان کے استعارے ایک جہانِ معنی سمیٹے ہوئے ملتے ہیں اور منٹو کی کہانیاں انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں اور باطنی کرب کو جستہ جستہ زبان دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ غالب شاعر ہیں لیکن داستانی روایات سے ان کا ذہن جڑا ہوا ہے۔ وہ فرصت کے وقت میں داستانوں کا مطالعہ گہری دلچسپی سے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے مخصوص اشعاروں میں داستانوں کا آہنگ ملتا ہے اور منٹو کی کہانیوں میں قصوں کا سارا حسن ہے اور قصہ پن پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ دونوں باکمال لفظ و معنی کے رشتے کے قایل ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ دونوں اپنی اپنی سلطنت کے شہنشاہ ہیں۔ غالب شاعر ہونے کے باوصف ایک بڑے نثر نگار ہیں اور جدید نثر کے بانی کار۔ ان کی تقلید ناممکن ہے اور منٹو کا معاملہ کچھ مختلف نہیں۔ ان کے موضوعات، ان کا اسلوب اور زبان کا برتاؤ بھی ناقابل تقلید ہے جس طرح غالب کے تجربے پیچیدہ اور متنوع ہیں۔ سعادت حسن منٹو کے موضوعات بھی اس طرح متنوع ہیں —— یہی ذہنی اور جذباتی مماثلت ہے جو غالب کے انتقال کے چالیس سال بعد پیدا ہونے والے سعادت حسن منٹو کو قدم قدم پر غالب کا پرستار، اس کا عاشق اور اس کا مدح خواں بناتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا اور واضح ثبوت وہ بے شمار تحریریں ہیں جو غالب سے متعلق منٹو کے پورے

ادب میں نظر آتی ہیں۔

کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے کہ منٹو جیسا شخص جسے شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جس کی تحریروں میں شاعری اور شاعروں کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو ۱۹۴۵ء میں آج کل کے مشہور شاعر مجروح سلطان پوری سے کہتا ہے۔

"غزل کی شاعری کو میں پسند نہیں کرتا۔"[1]

کیونکر غالب اور غالب کی غزل پر سر دُھنتا ہے۔ غالب کا ذکر بار بار کرتا ہے ان کے شعر حوالے کے طور پر استعمال کرتا ہے اور ان سے اپنے جہاں معنی کی جہتوں میں اضافہ کرتا ہے۔ منٹو نے ۱۹۴۰ء کے آس پاس مرزا غالب پر ایک فلم لکھنے کا ارادہ کیا اور غالبیات کا سنجیدگی سے مطالعہ شروع کیا۔ اپنے دوست احمد ندیم قاسمی کے نام اکتوبر ۱۹۴۰ء میں ایک خط لکھتے ہیں جس میں اس بات کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"میں آج کل غالب کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس پر ایک فلمی افسانہ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ مواد بہت کم ہے۔ بہر حال گزارہ ہو جائے گا"

(منٹو کے خطوط ص ۱۶۳)

---

[1] راقم السطور کے استفسار پر مجروح صاحب نے اپنے خط میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا متن یوں ہے۔

"۱۹۴۵ء میں جب میں صرف چار سال کا شاعر تھا۔ پانچواں سال شروع ہوا تھا بمبئی آیا۔ انہی دنوں صرف ایک بار منٹو صاحب سے ملاقات یوں ہوئی کہ میں ان کے درِ دولت پر سلام کرنے حاضر ہوا تھا ملے اور کہا کچھ شعر سنائیے میں نے ایک غزل سنائی فرمایا غزل کی شاعری کو میں پسند نہیں کرتا ہوں۔ میں ان سے بہت چھوٹا تھا۔ کچھ اس لئے اور کچھ اس لئے کہ کم علمی کے باعث خود اعتمادی کی کمی تھی چپ ہو رہا۔ ورنہ آج یہی بات اگر مجھ سے کہتے تو میں ان سے ضرور کہتا کہ محترم آپ نے یہ کہہ کر نہ تو علم شعر و سخن اظہار کیا ہے نہ ذوق سخن ہی کا"

یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا۔ ۱۹۴۳ء کے آس پاس انہوں نے غالب پر اپنی کہانی لکھنا شروع کردی اس کا اشارہ اپریل ۱۹۴۳ء کو احمد ندیم قاسمی کے نام ایک خط میں ملتا ہے:۔

"میں دو کہانیاں لکھ رہا ہوں ایک غالب کی سوانح حیات ہے"

(منٹو کے خطوط ص ۱۹۹)

لیکن اس کہانی کو فلمایا نہ جا سکا۔ منٹو جب تک ہندوستان میں رہے ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ برسوں کے بعد جب وہ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے تب ہدایت کار سہراب مودی نے اس کہانی کو فلم کا روپ دیا اور راجندر سنگھ بیدی سے اس کے مکالمے لکھوائیے۔ یہ منٹو کی کامیاب فلم ثابت ہوئی۔

منٹو کے یہاں غالب کے اشعار کا برمحل استعمال ان کے متعدد مضامین اور خاکوں میں ملتا ہے۔ خاص طور پر وہ اپنے طنزیہ مضامین اور انشائیوں میں موضوع اور مضمون کی رعایت سے اشعار کا استعمال کرتے ہیں اور پورے مضمون میں ایک عجیب تیکھا پن پیدا کرتے ہیں۔ یہ شعر ان کے مضامین کے سانچے میں اس طرح کھپ جاتے ہیں جیسے مضمون کا حصہ ہوں۔ میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گا:۔

(۱) "ہماری زبان اردو کا ایک شاعر غالب ہوا ہے۔ اُس نے آج سے قریب قریب ایک صدی پہلے کہا تھا ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

غریب کو زندگی میں رسوائی کا ڈر نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اول تا آخر رسوائے زمانہ رہی۔ اس کو خوف اس بات کا تھا کہ بعد از مرگ رسوائی ہوگی۔ آدمی وضع دار تھا اُسے خوف نہیں بلکہ یقین تھا۔ اس لئے اس نے غرقِ دریا ہونے کی خواہش کی کہ جنازہ اٹھے نہ مزار بنے کاش وہ ...

کے ملک میں پیدا ہوا ہوتا۔ آپ اس کا بڑی شان و شوکت سے
جنازہ اٹھاتے اور اس کا مزار اسکائی سیکیکر کی صورت میں بنواتے
اور اگر اس کی خواہش پر عمل کرتے تو شیشے کا ایک حوض تیار کرتے
جس میں اس کی لاش رہتی دنیا تک غرق رہتی اور چڑیا گھر میں لوگ
اُسے جا جا کر دیکھتے"

{ چچا سام کے نام ایک خط
اوپر، نیچے، درمیان ص ۱۵۸۔۱۵۹ }

۲) "کپڑا اتنا مہنگا ہو گیا ہے کہ جو غریب ہیں ان کو مرنے پر کفن نہیں
ملتا۔ جو زندہ ہیں وہ تار تار لباس میں نظر آتے ہیں۔ میں نے تنگ آکر
سوچا کہ ایک ننگا کلب کھول دوں۔
لیکن سوچتا ہوں ننگے کھائیں گے کیا؟ ایک دوسرے کا ننگ ـــ؟
مگر وہ بھی اتنا کہ یہی ہو گا کہ نگاہیں لقمہ اٹھاتے ہی وہیں رکھ دیں گی۔
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔ کوئی تنگی سی تنگی ہے کوئی تُرشی سی
تُرشی ہے لیکن چچا جان! داد دیجیے۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

{ چچا سام کے نام پانچواں خط
اوپر، نیچے، درمیان ص ۲۱۸ }

۳) ہوٹلوں میں آپ نے اکثر دیواروں پر یہ شعر دیکھا ہو گا ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اگر غریب الوطن ہیں تو یہ تحریر دیکھ کر یقیناً آپ کا دل محزون ہوجائے گا۔"

{ دیواروں پر لکھنا / تلخ، ترش، شریں ص ۹ }

(۴) غالبؔ کا ایک شعر ہے ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

چونکہ ایسی دیواروں پر لکھتے وقت دمِ تحریر فرشتے نہیں ہو سکتے.... اس لیے پکڑنے پکڑانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دیواری ادب اور مصوری کی یہ شاخ حکومت کے احتساب اور اس کے خوف سے بالکل پاک رہی ہے۔

{ دیواروں پر لکھنا / تلخ، ترش، شریں ص ۷ }

(۵) غالبؔ کہتا ہے ؎

میں بلاتا تو ہوں ان کو مگر اے جذبۂ دل
ان پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

یعنی اگر اسے بن بلائے مہمانوں سے کد ہوتی تو یہ شعر اس کے دیوان میں ہرگز نہ ملتا۔ غالبؔ کہتا ہے میں بلاتا تو ہوں ان کو مگر میرا تو جی چاہتا ہے کہ کوئی ایسی بات ہوجائے کہ وہ بن بُلائے چلے آئیں اور سچ تو یہ ہے کہ بلا کر کسی کے آجانے میں وہ مزا کہاں ہے جو بن بُلائے آجانے میں ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کیوں لوگوں کو بن بلائے مہمانوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ آپ کہیں گے کہ صاحب غالبؔ

نے تو معشوقوں کے متعلق کہا تھا کہ ان کا بن بلائے آجانا عاشقوں
کے لئے ایک بہت بڑی بات ہے۔ آپ نے زبردستی یہ شعر مہمانوں
کے ساتھ چپک دیا۔ اچھا صاحب یوں ہی سہی۔"

{ بن بلائے مہمان / اوپر، نیچے اور درمیان ص ۹۸ }

اس طرح سے غالب کے اشعار کی خاصی تعداد منٹو کی تحریروں میں نظر آتی ہیں۔ منٹو کے مضامین میں عنوانات اور ذیلی عنوانات غالب کے بعض مصرعوں سے مزین ہیں مثلاً

(ا) چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد
(ب) کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
(ج) سر کھجاتا ہے جہاں زخم سر اچھا ہو جائے
لذت سنگ، باندازِ تقریر نہیں
(د) زحمت مہرِ درخشاں

ذکر ہو چکا ہے کہ منٹو انانیت پسند تھے ان کی پوری زندگی انانیت کی آگ میں سلگتی رہی۔ اُوپندر ناتھ اشک نے اپنی کتاب 'منٹو، میرا دشمن' میں لکھا ہے۔

"منٹو کی رن چھوڑیت اس کی زبردست انانیت کے باعث
تھی اور اس کی اس انانیت میں اس کی عظمت کا راز مضمر ہے۔
منٹو کو خوشامد کرنے سے عار نہیں تھا۔ مکرجی کے پاس بیٹھ کر
ان کی خوشنودی کے لئے منٹو، غالب کے اشعار سناتے۔ میں
نے دیکھا ہے حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ مکرجی کے سامنے غالب
کے شعر پڑھنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔ اس سے مکرجی کی
عظمت کم نہیں ہوتی۔ اپنے فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ لیکن

غالب کو سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں"۔

(منٹو میرا دشمن ص ۵۲)

صاف ظاہر ہے کہ منٹو اپنی انا کی آسودگی نہ پا کر میدان سے بھاگ جاتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ وہ فراریت پسند تھے۔ بلکہ اپنی انا کی آسودگی کے لئے وہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتے تھے۔ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے تھے لیکن جب راستہ مسدود پاتے تو ذلت، رسوائی اور بھکڑ پن سے بچنے کے لئے "باجو کی گلی" سے بھاگ جاتے تھے۔ گھر سے بھاگنے، امرتسر سے بھاگنے، لاہور سے بھاگنے، بمبئی سے بھاگنے، ریڈیو کی ملازمت سے بھاگنے اور پھر فلمستان بمبئی سے بھاگنے کا بنیادی محرک ان کی انا کی شکست ہی تھی ——— آشک نے جس زمانے کا ذکر کیا ہے یہ فلمستان کا وہی سنہری دور ہے جب منٹو کی حیثیت کمپنی کے آقاؤں (BOSSES) کی سی تھی اور اس بھرم کو قائم رکھنے کے لئے وہ کمپنی کے قضاد قدر کے مالک مکرجی کی خوشامد سے بھی عار نہیں کرتے تھے اور اس خوشامد کا سب سے بڑا وسیلہ غالب کے اشعار کی صورت میں ان کے پاس موجود تھا۔ اور یہ تیر بہدف والا معاملہ تھا۔ اس لئے کہ غالب، منٹو کا محبوب تھا۔ غالب کے اشعار کی کئی جہتیں ہیں۔ غالب کے شعر سن کر لوگ جھومتے ہیں اور جو غالب کو نہیں سمجھتے، وہ اپنی نابیگی کا اظہار نہیں کرتے ——— غالب اور غالب کی شاعری کا ذکر ایک 'CRAZE' کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے منٹو اس بات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے۔

منٹو نے صرف اتنا ہی نہیں کیا۔ ان کے یہاں غالب سے متعلق متعدد مضامین ملتے ہیں مثلاً۔

(۱) غالب اور چودھویں

فیچر نما مضمون ہے اس کی بنیاد حاتم علی مہر کے نام لکھے ہوئے خط پر ہے..... "مغل بچے بھی عجیب ہوتے ہیں کہ جس سے عشق کرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں..... میں نے بھی اپنی جوانی میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی سے عشق کیا ہے اور اسے مار

رکھا ہے"۔۔۔۔

منٹو، غالب کے ایک فارسی خط کا سہارا بھی لیتے ہیں ـــ

"کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے۔ میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔"

منٹو لکھتے ہیں:۔

"افسانہ نگار کے لئے یہ چند اشارے مرزا غالب کی رومانی زندگی کا نقشہ تیار کرنے میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔ رومان کی ازلی تکون "تو ستم پیشہ ڈومنی۔

اور کوتوال دشمن تھا" کے مختصر الفاظ ہی مکمل کر دیتے ہیں"

چنانچہ ان ہی اشاروں پر منٹو نے اپنا ایک مضمون تیار کر لیا ہے۔ یہی مضمون دراصل فلم مرزا غالب کی بھی بنیاد ہے۔

(ب) آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی

مرزا کی نوجوانی کے دور کا احاطہ کرنے کے لئے یہ بھی فیچر نما مضمون ہے۔ جس میں غالب کی پتنگ بازی، کنور بلوان سنگھ کے ساتھ معرکے، مرزا کی چوسر بازی کا ذکر ہے۔ امراؤ بیگم، ملا عبدالصمد، خواجہ غلام حسین خان نواب الٰہی بخش، مرزا یوسف اور دوسرے کتنے ہی کردار سامنے آتے ہیں اور آگرہ میں مرزا کے شب و روز کی زندگی کے چند پہلو روشن ہوتے ہیں۔ منٹو نے اپنے مخصوص رنگ میں یہ سب کچھ پیش کیا ہے۔

(ج) غالب اور سرکاری ملازمت

اس عنوان کے تحت غالب کے دلی کالج کی ملازمت کا شاخسانہ سامنے آتا ہے۔ منٹو نے اس فیچر کا آغاز یوں کیا ہے:

"حکیم محمود خان مرحوم کے دیوان خانے کے متصل یہ جو مسجد کے عقب میں ایک مکان ہے مرزا غالب کا ہے اس کی نسبت آپ نے ایک دفعہ کہا تھا ؎

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنالیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

آیئے ہم آپ کو دیوان خانے میں لے چلیں کوئی حرج نہیں۔ رات ہے تو کیا مرزا صاحب کے یہاں یقیناً اس وقت بھی رونق ہوگی۔ رونق تو خیر اتنی نہیں لیکن منشی شو نرائن موجود ہیں۔"

اس کے بعد بڑی خوب صورتی کے ساتھ دہلی کالج کی ملازمت کے سلسلے میں مسٹر ٹامسن سے ملاقات کا ذکر کرتے ہیں اور پوری جزئیات کے ساتھ اس واقعے کی تصویر کھینچتے ہیں جب وہ فارسی کی مدرسی پر اس لئے لات مار کر آتے ہیں کہ ٹامسن صاحب ان کے استقبال کے لئے باہر نہیں آتے۔ اس موضوع کو بھی ڈرامائی روپ دیا گیا ہے۔

(د) مرزا غالب کی حشمت خان کے گھر دعوت

ایک مختصر سا ہلکے پھلکے انداز میں تحریر کیا ہوا مضمون جس میں غالب، حشمت خان اور چودھویں کے کرداروں سے ایک واقعہ گھڑ لیا گیا ہے اور غالب اور حشمت خان کی چشمک کو دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے۔

(ر) قرض کی پیتے تھے

غالب اور متھرا داس نام کے مہاجن کے تعلقات۔ غالب کی قرضداری مفتی صدرالدین آزردہ صدالصدور کی عدالت میں مقدمے کی کاروائی۔ منٹو نے ان باتوں کا ذکر اس مضمون میں کیا ہے۔ بیچ بیچ میں غالب کے اشعار سے مضمون میں دلچسپی پیدا کی ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں غالب کے ان لاتعداد اشعار کا ذکر کرنا باعث طوالت ہوگا۔ جن کا استعمال منٹو نے اپنی تحریروں میں بار بار کیا ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ منٹو کی اکثر تحریریں (میں ان میں افسانوں کو شامل نہیں کرتا) غالب کے اشعار سے مزین ہیں۔

ذکر ہو چکا ہے کہ منٹو اور غالب دونوں میں انانیت اور خود پسندی قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالب کے بیشتر اشعار میں یہ جذبہ تعلی کی صورت میں سر اٹھاتا ہوا ملتا ہے اور منٹو بھی اس سے خالی نہیں۔ چند مثالیں:-

غالب کہتے ہیں۔

ے آج مجھ سا نہیں زمانے میں ‏ شاعر نغز گو و خوش گفتار

ے ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

ے گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ے ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صدائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے

ے ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں ‏ دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

یہ غالب کی خود بینی ہے، انانیت ہے اور نرگسیت بھی. سعادت حسن منٹو بھی اسی قبیل کے فن کار تھے ان کے اسی جذبے اور رجحان کا اظہار ملاحظہ ہو :۔

"میں پہلے سارے ہندوستان کا ایک بڑا افسانہ نگار تھا اب پاکستان کا ایک بڑا افسانہ نگار ہوں. میرے افسانوں کے کئی مجموعے شایع ہو چکے ہیں. لوگ مجھے عزت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں. سالم ہندوستان میں مجھ پر تین مقدمے چلے تھے. یہاں پاکستان میں ایک لیکن اسے ابھی بنے کے برس ہوئے."

(چچا سام کے نام ایک خط)

یا منٹو کا وہ معرکتہ الآرا کتبہ جو انتقال سے ایک سال قبل وہ آٹو گراف کے طور پر اپنے مداحوں کو دیا کرتے تھے.

۷۸۶

کتبہ

یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے. اس کے سینے میں فنِ افسانہ نگاری کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا!

سعادت حسن منٹو

۱۸، اگست ۱۹۵۴ء

آخر میں منٹو کا ایک انتساب ملاحظہ ہو. اپنے خاکوں کا مجموعہ "گنجے فرشتے" غالب کی نذر یوں کرتے ہیں :۔

بگنج معانی حضرتِ غالب

کے نام

ہوس گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا

عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ منٹو جیسا سرپھرا اور غیور فن کار غالب جیسے سر پھرے فن کار سے کس درجہ متاثر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو غالب کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کفایت الفاظ کا جو راز منٹو کو معلوم تھا وہ دراصل غالب کی تعلیم کا ہی نتیجہ تھا۔ اس میں کوئی باک نہیں کہ غالب، منٹو کے معنوی استاد تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو منٹو جیسا باغی اور خود سر غالب کی شان میں رطب اللسان نہ ہوتا۔

منٹو۔ فکر و فن کے چند پہلو

اُردو میں مختصر افسانے کا پہلا چراغ منشی پریم چند نے روشن کیا۔ اس چراغ کی لو سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری اور دوسرے لوگوں نے بڑھائی۔ ان لوگوں کی کاوشوں سے اردو افسانے میں اس زمین کی خوشبو پیدا ہوئی جس میں وہ سانس لے رہے تھے۔ خلاؤں میں پرواز کرنے والے خیالات، مافوق الفطرت عناصر اور ان جانی زندگی کی پُر اسرار فضا کی جگہ عصری زندگی کے مسائل نے اس فن میں تازہ کاری پیدا کر دی۔ پریم چند نے مغرب کے فن سے شعوری اکتساب کیا۔ لیکن یہ اکتساب مغرب کی کورانہ تقلید تک محدود نہیں تھا بلکہ انہوں نے فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ اپنے مطالعے کو مشاہدے کی بھٹی پر تپا کر کندن بنا دیا۔ پریم چند نے نہ صرف وطنی اور قومی موضوعات کو برتا بلکہ اپنے عصری رجحانات کی بھرپور عکاسی کی حتیٰ کہ ایک روایت پیدا کر کے اسے انگارے گروپ کے فنکاروں کو سونپ دیا۔ اپنے آخری دَور میں کفن جیسا شاہکار تخلیق کر کے انہوں نے ایک نئی منزل کی نشاندہی کی اور اُردو افسانے میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوا۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں جب پریم چند کا فن اپنے عروج پر تھا۔ تب انگارے کے

افسانے نمودار ہوئے اور ترقی پسند تحریک نے جنم لیا۔ اردو افسانے میں ایک نئی جہت کا آغاز ہوا۔ اس زمانے میں اردو افسانے کے افق پر کئی نئے چہرے طلوع ہوئے اُن میں خاص طور پر کرشن چندر، بیدی اور منٹو قابلِ ذکر ہیں۔ اس تثلیث نے اردو ادب کی تاریخ میں ایک باب لکھا اور اردو افسانے کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ یہ اردو افسانے کی خوش بختی تھی کہ اسے پریم چند کے بعد منٹو جیسا تخلیق کار ملا جس نے اپنی انفرادیت سے فن افسانہ نگاری میں نئے نقوش اُبھارے۔

منٹو ازل سے ہی ایک باغی طبیعت لے کر آئے تھے۔ بچپن ہی میں گھر میں افلاس اور ناداری کے سائے منڈلاتے ہوئے دیکھے تھے اور یہ احساس ان کے شعور کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ والد سخت گیر تھے اس لئے باپ کا پیار نہ مل سکا محبت وشفقت اور ہمدردی کے اس فقدان نے سعادت حسن کو منٹو بنا دیا۔ ان کی زندگی میں جو لاابالی پن غیر معمولی انانیت اور اپنے آپ کو دوسروں پر حاوی کرنے کی جو قوت ملتی ہے وہ اس کمی کی تلافی کرتی ہوئی نظر آتی ہے جو باپ کے پیار کو نہ پاسکنے کی وجہ سے ان میں پیدا ہوئی تھی۔

شریف پورہ امرتسر کے مسلم ہائی اسکول میں داخلہ لینے کے بعد منٹو کی شوخیوں اور شرارتوں میں اضافہ ہوا اور ہندو سبھا کالج میں یہی شوخیاں نقطۂ عروج پر پہنچ گئیں۔ ان شوخیوں اور شرارتوں کی وجہ سے وہ اپنے ہم عصروں اور ساتھیوں کی توجہ کا مرکز بن گئے تھے اور "ٹامی" کا نام حاصل کر چکے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں مسلم ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر خواجہ محمد عمر جان خاص طور پر اس شوخ لڑکے کی شرارتوں سے تنگ آچکے تھے تاہم اس کی غیر معمولی ذہانت کے معترف تھے۔ سعادت حسن منٹو کو شرارتوں کے ساتھ ساتھ مطالعہ کا اس قدر شوق تھا کہ وہ اپنے آپ کو ہیڈ ماسٹر صاحب کا بیٹا ظاہر کر کے مقامی کتب فروش سے کتابیں اُدھار لیا کرتے تھے اور پڑھ کر سیکنڈ ہینڈ دام میں فروخت کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ہیڈ ماسٹر کو کتابوں کی قیمت اپنی جیب سے ادا کرنا پڑتی تھی اور منٹو ان پیسوں سے سگریٹ پھونک دیا کرتے اور فخر سے کہتے "میں گھٹیا قسم کے سگریٹ کبھی نہیں پیتا"۔

منٹو کی ہر ادا نرالی تھی۔ بچپن کے بے فکرے لمحات سے لے کر زندگی کے آخری سانسوں تک

انہوں نے ہر معاملے میں غیر روایتی اندازِ نظر اختیار کر لیا تھا۔ اور اپنے لئے ایک منفرد راستہ بنا لیا۔ یہ انفرادیت نہ صرف ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں میں نظر آتی ہے بلکہ اس کا پرتو ان کے ادب میں بھی ہر جگہ ملتا ہے۔ بچپن کا افلاس، والد کی موت، عزیزوں اور رشتہ داروں کی بیگانگی، دوستوں کی سرد مہری، حقوق کی تلفی، ان سب باتوں کا نفسیاتی ردِ عمل یہ ہوا کہ وہ ذہنی الجھنوں کے شکار ہو گئے اور انسانی تعلقات کے کھوکھلے پن سے آشنا ہو گئے۔ منٹو کو ابتدا ہی سے اپنے ارد گرد ایک عجیب خلا کا احساس پریشان کرتا رہتا۔ اس خلا کو پر کرنے کے لئے لوگوں کی توجہ کو مختلف طریقوں سے اپنی جانب مبذول کرتے رہے۔ اپنی زندگی اور فکر و فن میں تقلید پرستی اور روایت پسندی سے گریز کر کے انہوں نے ہر قدم پر جدت پسندی اور انفرادیت کا اظہار کر کے اپنے غیر معمولی تخلیقی ذہن کا ثبوت فراہم کیا۔

منٹو بچپن کے ایام میں ایک بار اللہ رکھا نامی جادوگر کے ساتھ بھرے مجمع میں ننگے پاؤں دہکتے ہوئے انگاروں پر چلے تھے اور منہ سے اُف بھی نہ کی تھی حالاں کہ وہاں لوگوں کا ایک جمِ غفیر موجود تھا اور کسی نے اللہ رکھا کی یقین دہانی کے باوجود سامنے آنے کی جرأت نہ کی تھی۔ منٹو کے آگ پر چلنے کی یہ جرأت رندانہ ان کے کسی لمحاتی جوش کی غماز نہیں۔ اس واقعے کے پس پشت ان کی نفسیاتی شخصیت کارفرما تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ان کی آئندہ زندگی کا ایک اہم اشاریہ تھا۔ وہ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے روایتی تصورات کو ترک کر کے ہمیشہ نئی راہوں کی تلاش میں رہے اور انہیں تمام عمر آگ کے صحراؤں سے گزرنا پڑا۔ ایک فن کار کی حیثیت سے وہ زندگی بھر آگ پر چلتے رہے۔ شہرت کی بلند منزلیں چھو لیں اور ساتھ ہی بدنامی کے طوق بھی قبول کر لئے۔

بچپن سے منٹو اپنے پوشیدہ تخلیقی جوہر کا مختلف طریقوں سے اظہار کرتے رہے۔ انہیں افواہیں پھیلانے کا شوق تھا۔ وہ طرح طرح کی افواہیں پھیلاتے جو دوسرے روز شہر میں گھوم کر پھیل جاتیں۔ یہ افواہیں بڑی دلچسپ اور تحیر پیدا کرنے والی ہوا کرتی تھیں مثلاً:

۱۔ امریکہ والوں نے تاج محل خرید لیا ہے اور وہ اسے بڑی مشینوں کے ذریعے امریکہ لے

جالے میں ہیں۔

۲۔ لاہور میں ٹریفک کے سپاہیوں کو برف کے کوٹ مہیا کئے گئے ہیں۔

۳۔ میرا فونٹین پین گدھے کے سینگ کا بنا ہوا ہے۔

منٹو نے اپنے چند ہم خیال احباب کے ساتھ مل کر ایک انجمن منظم کرلی تھی۔ 'انجمن احمقاں' اس انجمن سے وابستہ لوگوں کا کام عجیب و غریب باتوں سے لوگوں کو پریشان کرنا تھا۔ مثلاً منٹو خود کہا کرتے تھے۔

"اس قلم کے متعلق آپ کی نب کیا ہے؟ اس قمیض کے متعلق آپ کا بٹن کیا ہے؟"

منٹو نے جب ادبی زندگی کا آغاز کیا تو شروع سے ہی ہنگامہ آرائی پیدا کر آئے۔ اپنے افسانوں کے پہلے مجموعے 'منٹو کے افسانے' کی اشاعت کے وقت ناشر کو ہدایت دی کہ وہ کتاب کا ایسا گرد پوش بنائے کہ لوگ اس کو دیکھتے ہی انہیں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ کہانیاں ایسی لکھیں کہ چاروں طرف واہ واہ اور ہا ہا کار کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ترقی پسندوں نے رجعت پسندی کا لیبل چسپاں کر دیا اور رجعت پسندوں نے ترقی پسند اور دہریہ کہا۔ ان کے افسانوں پر ان کے خلاف مقدمے چلائے گئے اور ان کو فحش نگار اور گندہ ذہن قرار دیا گیا۔ شراب نوشی سے چھٹکارا دلوانے کے لئے پاگل خانے بھیج دیئے گئے لیکن جب پاگل خانے سے چھوٹے تو اُن کے منہ سے یہ معنی خیز جملہ ادا ہوا۔

"چھوٹے پاگل خانے سے نکل کر بڑے پاگل خانے میں آگیا ہوں"۔

منٹو کی ایک بڑی کمزوری ان کی بے باکی اور صاف گوئی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ سیاہ کو سیاہ اور سفید کو سفید کہا۔ اپنے ضمیر کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے بڑی قربانیاں دیں۔ وہ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ مرنے کے بعد کسی شخص کا کردار "لانڈری سے دھل کر آتا ہے"۔ اس بات کی وضاحت اپنے خاکوں کے مجموعے 'گنجے فرشتے' میں یوں کرتے ہیں:۔

"میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں، کوئی شمپو نہیں۔ کوئی گھونگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں۔ میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی۔ میراجی کی ضلالت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور

کر سکا کہ وہ بدخود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے"۔

منٹو خط مخنی کے فن کار تھے۔ بچپن سے لے کر اپنی موت تک، ترجموں سے لے کر طبع زاد افسانوں، مضامین، ڈراموں اور خاکوں تک ہر جگہ، ہر سطر میں ٹیڑھے میڑھے خطوط نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ہر میدان میں نیا راستہ کھودا اور اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔ نفسیاتی اور جنسی نفسیات کے افسانے لکھنے کی ایک بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ لوگوں نے ایسے افسانوں کو فحش اور بے کار قرار دیا تھا جن میں انہوں نے مروجہ اصولوں سے بغاوت کی تھی۔ انہوں نے ضد میں آکر ایسے ہی موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی یہی وجہ ہے کہ سردار جعفری جیسے ترقی پسند نے ان سے اختلاف کے باوجود ان کے بارے میں لکھا:۔

"منٹو کی افسانہ نگاری ہندوستان کے درمیانی طبقے کے مجرم ضمیر کی فریاد ہے اس لئے منٹو اردو کا سب سے زیادہ بدنام افسانہ نگار ہے اور یہ بدنامی جو منٹو کو نصیب ہوئی ہے مقبولیت اور شہرت کی طرح صرف کوشش سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لئے فن کار میں اصلی جوہر ہونا چاہیے اور منٹو کا جوہر اس کے قلم کی نوک پر نگینے کی طرح چمکتا ہے"۔

منٹو کا سب سے بڑا مسلک انسان دوستی تھا۔ ان کے یہاں مصلحت اندیشی کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ انہیں معلوم تھا کہ مذہب، دین دھرم کے نعروں کے پس پشت محض مذہبی منافرت، تعصب اور تنگ نظری چھپی ہوئی ہے اور مفاد پرستوں نے اسے محض ایک آڑ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ ان مکاریوں اور جعلسازیوں کا قلع قمع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اپنی کہانی سہائے میں رقمطراز ہیں:۔

"یہ مت کہو ایک لاکھ مسلمان اور ایک لاکھ ہندو مرے، یہ کہو دو لاکھ انسان مرے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمان یہ سمجھے ہوں گے کہ ہندو مذہب مر گیا ہے لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہوں گی کہ اسلام ختم ہو گیا۔ مگر اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہ آئی۔ وہ لوگ بے وقوف ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب شکار کیا جاسکتا ہے۔ مذہب، دین، دھرم، ایمان، یقین، عقیدت جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں ہماری

رُوح میں ہوتا ہے چھرے، چاقو یا گولی سے فنا نہیں ہو سکتا"۔

تقسیمِ ملک ان کے دَور کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ اس سے ان کا ذہن شل ہو چکا تھا۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کو دِل سے قبول نہیں کر سکے تھے۔ اگرچہ انہوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان میں پناہ لی تھی، وہ پھر بھی اپنے آپ کو اس عظیم ہندوستان کا وارث سمجھتے تھے جہاں انہوں نے جنم لیا تھا۔ بٹوارے کے بعد مذہب کے نام پر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ بچوں کے قہقہے لٹے اور عصمتوں کا نیلام ہوا۔ منٹو دم بخود ہو کر چلّائے :۔

"ہندوستان آزاد ہو گیا۔ پاکستان عالمِ وجود میں آتے ہی آزاد ہو گیا، لیکن انسان ان دونوں مملکتوں میں غلام تھا، تعصب کا غلام، مذہبی جنون کا غلام، حیوانیت اور بربریت کا غلام"۔

منٹو ایک عظیم فن کار ہیں۔ ان کی عظمت اور انفرادیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور فن اپنے معاصرین اور متاخرین کے لئے بے حد متنازعہ فیہ رہا ہے اور ان کے بیشتر افسانوں نے بحث و تمحیص کے دفتر کھول دیے ہیں۔ بعض نقادوں نے اُن کو محض عریاں نگار اور فحش نگار قرار دے کر رد کر دیا اور بعضوں نے ان کے ہاں فن کاری کے اعلیٰ نمونے تلاش کئے ہیں۔ لیکن حق بات تو یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی تہذیب کے پس منظر میں سماجی، ذہنی اور فکری زندگی کی عکاسی کی ہے اور انسانی سماج میں رِستے ہوئے ناسوروں پر نشتر رکھ دیئے ہیں۔ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ مسخ شدہ کرداروں کے سب سے بڑے ترجمان تھے۔ یہ صحیح ہے کہ معروضی طور پر ان کے موضوعات محدود تھے لیکن اس بات کو تسلیم کرنا ہوگا کہ ان موضوعات کو جس نئی ہنرمندی کے ساتھ انہوں نے پیش کیا، وہ بے مثال ہے۔ منٹو کا فن پروپگنڈے اور صحافت کا فن نہیں۔ یہ بات اس لئے بھی مستحسن ہے کہ جس زمانے میں منٹو جیئے وہ ترقی پسندی کے عروج کا زمانہ تھا اور اس دَور میں کسان، مزدور، طبقہ داری، نابرابری، سرخ سویرا، پرولتاری انقلاب اور اس قبیل کے موضوعات کے گرد کہانیاں گھومتی تھیں۔ منٹو نے اس راستے پر کچھ دُور چل کر اپنا ایک علیحدہ راستہ تراش لیا اور

اسی پر گامزن رہے۔ منٹو کا اسلوب بھی دوسروں سے مختلف اور منفرد ہے۔ وہ نثر میں شاعری کے قایل نہیں۔ وہ چچے تلے الفاظ میں کفایت الفاظ کے ساتھ نہایت احتیاط سے اپنے موضوع کی تخلیقی بازیافت کرتے ہیں۔ ان کا فن یقیناً شیشہ گری کا فن ہے۔ وہ دور از کار استعاروں اور تشبیہوں کی بیساکھیاں بھی استعمال نہیں کرتے بلکہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کے معانی قارئین کے ضمیر کی جڑوں کو ہلا دیتے ہیں۔

منٹو مقصدی ادب کے قایل نہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو پیش کرتے ہوئے کسی اخلاقی نظریے کے تابع بھی نہیں رہتے۔ یہی سبب ہے کہ وہ سکہ بند تصورات سے بچے رہے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے دوسرے اصناف نثر پر بھی قلم چلایا لیکن جن تخلیقات نے ان کے جوہر تخلیق کا لوہا منوایا اور ان کو عظمت بخشی وہ ان کے افسانے ہیں اور اس صنف میں ان کی ہمسری کا دعویٰ بہت کم لوگوں کو ہے۔ ان کے موضوعات ان کے پیشروؤں اور ہمعصروں سے مختلف ہیں۔ ابلاغ و اظہار کا وہ ذریعہ جو انہوں نے برتا وہ بھی منفرد ہے۔ اس طرح سے منٹو کا فن اپنی الگ روایت قائم کرتا ہے منٹو کے یہاں کوئی نظریاتی وابستگی بھی نہیں ملتی۔ حالانکہ شروع شروع میں انہوں نے بھی طے شدہ فارمولوں اور منشوروں میں اپنی کہانیاں ڈھال دی تھیں۔

ذکر ہو چکا ہے کہ موضوع کے اعتبار سے بھی منٹو کے افسانے منفرد ہیں۔ وہ اپنے مشاہدے، محسوسات اور جذبات بھی تخلیقی عمل کے قالب میں اس طرح ڈھال دیتے ہیں کہ کہیں پر بھی تصنع کا شائبہ نظر نہیں آتا ہے۔ اسلوب میں نام نہاد اخلاق کی پاسداری بھی نہیں ملتی۔ ان کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ انسانی شخصیت کے نفسیاتی اور لاشعوری تجربات سے غیر فطری پردے سرکاتے ہیں اور ان تجربات اور کیفیات کو بڑی صفائی کے ساتھ آئینہ کر دیتے ہیں جن کا تعلق انسان کی اصلی سرشت سے ہے۔ ان کا بنیادی موضوع طوائف اور جنس زدہ عورتیں اور مرد ہیں۔ سادیت اور جنسیت کے مارے ہوئے یہ بدچلن مرد اور آوارہ عورتیں جب منٹو کی کہانیوں میں ڈھلتے ہیں تو انسانی سرشت اس کی نیکی اور بدی کا ضمیر پوری عریانی اور اصلیت کے ساتھ سامنے آتا ہے،

اور فطری انسان کے وجود پر تھوپا ہوا اخلاق کا غازہ اُڑ جاتا ہے۔ اس عمل میں منٹو کا عمیق مشاہدہ بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے کرشن چندر نے منٹو کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"منٹو نے زندگی کے مشاہدے میں اپنے آپ کو ایک معمولی شمع کی طرح پگھلایا ہے
وہ اُردو ادب کا واحد شنکر ہے جس نے زندگی کے زہر کو گھول کر پیا ہے
اور پھر اس ذائقے کو اس کے رنگ کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔"

منٹو اُردو ادب کے پہلے کہانی کار ہیں جنہوں نے طوائفوں، عصمت باختہ عورتوں، دلالی کرنے والے بھڑوؤں اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں کو پہلی بار انسانی ہمدردی کے ساتھ دیکھا اور اپنے فن میں ڈھال دیا۔ انہوں نے اپنے عہد کو بھی یکسر نظر انداز نہیں کیا بلکہ بڑی آزاد خیالی کے ساتھ کسی سیاسی پارٹی کے منشور کے تابع ہوئے بغیر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا جس کی انہیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

موضوعات سے قطع نظر منٹو کے یہاں افسانے کی واحد خصوصیت وحدت تاثر کی واضح شکل سامنے آتی ہے۔ وہ پوری جزئیات کے ساتھ اپنی بات پیش کرتے ہیں اور اپنے کرداروں کو اپنی جزئیات کے آئینہ خانے میں اپنی بھرپور حیثیت میں اُبھارتے ہیں۔ نیا قانون کا منگو۔ ننک کی سوگندھی۔ ٹھنڈا گوشت کا ایشر سنگھ۔ خوشیا کا دلال، کھول دو کی سکینہ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا بشن سنگھ یا موذیل کی آوارہ یہودن کسی بھی کردار کو دیکھ لیجئے اپنی تہہ دار شخصیت رکھتا ہے لیکن جو بات قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے وہ دراصل اس مخصوص تاثر کی وحدت ہے جو سارا افسانہ پڑھ کر سامنے آتی ہے۔ اس تاثر کو قائم کرنے کے لئے نہ صرف وہ سازگار پلاٹ بنتے ہیں بلکہ اس کے آغاز و انجام پر بڑی محنت کرتے ہیں اور قاری کو فوراً اپنی گرفت میں لیتے ہیں۔ منٹو، لفظ اور معنی کے رشتے سے واقف ہیں۔ وہ اپنے اسلوب بیان سے اپنی کہانیوں میں نئی روح پھونک دیتے ہیں۔ ہر لفظ اپنی جگہ پر صحیح، مناسب اور بلیغ ہے۔ کوئی بھی فقرہ نکال

دیکھئے تو افسانے میں کوئی جان باقی نہیں رہتی۔ آغاز و انجام کو ملانے والی درمیانی کڑیاں بھی اسی حال میں ملتی ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے کوئی افسانہ اہم ہو یا نہ ہو۔ ابتدائی رومانی اور تفریحی افسانوں سے لے کر طوائفوں اور جنس سے متعلق افسانوں تک سیاسی سماجی یا نفسیاتی افسانوں میں منٹو کے یہاں آغاز، واقعات کا تانا بانا، نقطۂ عروج اور انجام فنی لحاظ سے مکمل ہے منٹو نے اپنی کہانیوں میں جس زبان کا استعمال کیا ہے وہ زندگی سے اس طرح قریب ہے جس طرح ان کے موضوعات۔ قاری ان کی نثر پڑھ کر نہیں چھوتا بلکہ اپنے اندر ایک عجیب حرارت محسوس کرتا ہے معمولی بات کو اثر انگیز الفاظ میں بیان کرنے کی قوت، ترکیبوں کو اس طرح استعمال کرنے کی صلاحیت کہ ان کا موضوع اور ان کا مقصد واضح ہو جائے۔ منٹو کے شروع کے افسانوں سے لے کر ان کے آخری افسانوں تک موجود ہے۔ ان کی ہر تشبیہہ اس فضا کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے جس کو وہ بن رہے ہوں۔ ان میں جو بے ساختگی اور برجستگی نظر آتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی جزئیات خود بخود فقط اس فضا کو تعمیر کر رہی ہے۔ چند مثالیں:-

۱۔ گالی ٹھیک اس طرح سے الجھ کر رہ گئی تھی جیسے بیری کے کانٹوں میں کوئی کپڑا (نعرہ)۔

۲۔ اس کے تنگ ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئیں جیسے ململ میں پنیر کو آہستہ سے دبا دیا گیا ہو۔ (خوشیا)۔

۳۔ اس کی عمر بمشکل چودہ برس کی ہوگی مگر اس کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے جسم کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئی ہے۔ (پہچان)

۴۔ وہ کچھ اس طرح سمٹی جیسے کسی نے بلندی سے ریشمی تھان کھول کر پھینک دیا ہو۔ (مصری کی ڈلی)

۵۔ یہ اشوک کمار بھی عجیب چیز ہے پردے پر عشق کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کاسٹرائیل پی رہا ہو۔ (سجدہ)۔

منٹو کا اسلوب شاعرانہ ہوتے ہوئے بھی ایک عجیب طرح کا گداز سمیٹے ہوئے ہے۔ ایسی

نثر قابل رشک ہے۔ کہیں کہیں یہ طنز کے تیکھے وار ہیں جن میں شمشیر آب دار کی سی کاٹ ہے۔ کہیں ایسی صباحت اور ملاحت کہ دل کے نہاں خانوں میں اتر جاتی ہے اور کہیں معصومانہ انداز جس سے دوشیزگی ٹپکتی ہے۔

منٹو کی کردار نگاری قابل رشک ہے۔ وہ اس طرح واقعات کا تانا بانا تیار کرتے ہیں کہ ان کا کردار اپنی شخصیت کے تمام خول اتار کر سامنے آتا ہے۔ منٹو کے فن کی عظمت ایک طرف ان کے افسانے کی تکنیک پر مکمل گرفت کی وجہ سے ہے، دوسری طرف ان کے کرداروں کے باعث ہے۔ پریم چند کے بعد اگر کسی فن کار نے کردار نگاری کی اہمیت کو تسلیم کرکے اردو ادب کو زندہ جاوید کردار دیئے تو وہ سعادت حسن منٹو ہیں۔ حق بات تو یہ ہے کہ انہوں نے اردو افسانے میں کردار کی اہمیت کو منوایا۔ منٹو کے کردار اسی سماج میں رہنے والے ہیں، وہ روزمرہ کی زندگی سے ان کا انتخاب کرتے ہیں۔ اپنی انفرادیت کو واضح کرنے کے لئے وہ ان کو خاص ماحول میں ڈھال کر انسانی تجربوں سے مالا مال کرتے ہیں۔ یہی فن کا اعجاز ہے۔ منٹو کے کرداروں کی آرٹ گیلری میں طوائفیں، دلال، جنس زدہ مرد اور عورتیں جنسی طور پر بیدار بالغ اور نابالغ رند خرابات، ریاکار، زاہد، سرمایہ دار، داداگری کرنے والے اوباش، قاتل، سادیت کے مارے ہوئے مرد اور عورتیں، پاگل، مذہب زدہ اور آزاد خیال لوگ ہندو مسلمان، سکھ اور یہودی نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی تمام فطری حقیقتوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ منٹو اپنی ذات کو ان کرداروں پر مسلط نہیں کرتے بلکہ ان کو اپنی ازلی سرشت کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ بے نقاب کرتے ہیں۔ یہی وہ منزل ہے جہاں وہ اپنے معاصر فن کاروں سے کوسوں آگے نکل جاتے ہیں۔

منٹو کے خطوط — ایک جائزہ

مکتوب نویسی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی تاریخ۔ تہذیب تمدن کے آغاز سے ہی لوگ اپنا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لئے خطوط لکھا کرتے تھے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ابلاغ کی ضرورت نے خطوط نویسی کو جنم دیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب مکتوب نصف ملاقات کہلائے جانے لگے کیونکہ مکتوب نگار کی غیر حاضری میں خط سے ملاقات کا سا حظ اور تسکین حاصل ہو سکتی تھی۔ بعد میں خطوط نگاری ترقی کرتے کرتے ایسے مقام پر آ گئی جہاں اس کی حیثیت 'فن لطیف' کی سی ہو گئی۔ اسلامی تہذیب میں خطوط نگاری کے آداب سے کامل شناسا آدمی کو فضائل کے لحاظ سے شائستہ ترین آدمی سمجھا جاتا تھا۔

دنیا کی ہر زبان میں خطوط کا اچھا خاصا سرمایہ ملتا ہے۔ یہ خطوط مختلف نوعیت کے ہیں اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی آئینہ داری کرتے ہیں لیکن ادب میں ایسے خطوط اہم خیال کئے جاتے ہیں جو کسی اہلِ قلم نے لکھے ہوں چنانچہ مکاتیبی ادب نے ایک اہم ادبی صنف کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ انگریزی ادب میں کیٹس اور شیلے کے خطوط کی کافی اہمیت ہے۔ اسی طرح اردو میں غالب، شبلی، اقبال، سرسید

ابوالکلام آزاد مہدی افادی، پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، سجاد ظہیر، صفیہ اختر اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے خطوط ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان خطوط سے لکھنے والوں کی شخصیت کے بعض اہم پہلوؤں کی عکاسی ہوتی ہے۔

خطوط کو گھر کا آنگن کہا جاتا ہے۔ ان میں انسان کا سارا ظاہر اور باطن محسوسات اور جذبات خلوص اور ریا ظاہر ہو جاتا ہے۔ ان میں ان لمحات کا بھی عکس ملتا ہے جن میں انسان خود کلامی کرتا ہے اور اُن لمحات کا بھی جن میں اس کا ذہن خالی ہوتا ہے۔ خطوط میں اس کا پیار، اس کی نفرت، اس کی بری اور اچھی خواہشات اور آرزوئیں، اس کی ذہنیت، اس کا کرب، اس کا کھوکھلاپن اور اس کا سارا جوہر سب کچھ آئینہ ہو جاتا ہے۔

خطوط کی مقبولیت کا راز جہاں اُن کی بے ساختگی پر ہے وہاں اُن کی سادگی پر بھی ہے۔ یہ سادگی کسی اور ادبی صنف میں نہیں ملتی۔ خطوط میں ایک مکتوب نگار اپنا دل چیر کر کاغذ پر رکھ دیتا ہے۔ بعض اوقات وہ ایسی باتوں کا بھی ذکر کرتا ہے جن کا گذر صرف دل کی وادیوں میں ہو سکتا ہے اور زبان میں ان کے اظہار کا یارا نہیں ہوتا۔ ایسے خطوط کے مطالعے سے مکتوب نگار کی زندگی، اُس کے ماحول، اُس کے کردار اور اُس کے ذہنی ارتقا اور جذباتی رویوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ خطوط سوانح نگاری کی جان ہیں۔ بہت سے شاعروں اور ادیبوں کی سوانح حیات اُن کے خطوط کی مرہونِ منت ہے۔ خطوط میں بے ساختگی اس لئے ہوتی ہے کیوں کہ ان میں کسی جچی تُلی اسکیم کے تحت پہلے ہی سے خاکہ تیار کیا ہوا نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کی صداقت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اُردو کی خطوط نگاری میں غالب نے ایک نئی طرح ڈال دی۔ ان کے خطوط کی نگارش اعلیٰ فن کاری کا نمونہ ہے۔ بعد کے لکھنے والوں نے ان کی تقلید کرنا چاہی لیکن اس میں انہیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی لیکن اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دوسرے لکھنے والوں نے بھی اپنا اپنا رنگ جمایا۔ اس ضمن میں ابوالکلام آزاد، شبلی، سجاد ظہیر، مہدی حسن، پریم چند، صفیہ اختر اور منٹو وغیرہ کے خطوط خاص طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ خطوط ایک زمانے سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

سعادت حسن منٹو نے بھی اپنی زندگی میں اپنے احباب، عزیزوں اور دوستوں کو بے شمار خطوط لکھے۔ ان میں سے چند بہت ہی اہم خطوط منظرِ عام پر آئے ہیں۔ خاص طور پر ان کے وہ خطوط جو انہوں نے مشہور شاعر اور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کو لکھے ہیں۔ خطوط کا یہ مجموعہ منٹو کے خطوط کے نام سے شائع ہوا ہے اور اردو کے مکاتیبی ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس مجموعے میں منٹو کے بیانوے خطوط شامل ہیں۔ سب سے پہلا خط اختر شیرانی مرحوم کے نام ملتا ہے جو جنوری ۱۹۳۷ء کو لکھا گیا۔ مجموعے کا آخری خط فروری ۱۹۴۸ء کو لکھا گیا ہے۔ اس طرح خطوط کا یہ مجموعہ گیارہ برس کے عرصے پر محیط ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ یہ خطوط ایک ہی شخص کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ (پہلے خط کے بغیر) پھر بھی ان سے منٹو کی مکتوب نگاری کا اندازہ ہوتا ہے اور ان الفاظ کے آئینے میں اس شخص کا تفکر، اس کے خیالات، کردار اور رنگا رنگ شخصیت سامنے آجاتی ہے جس کی شخصیت اور جس کا ادب اپنے زمانے میں سب سے زیادہ متنازعہ رہا ہے۔

منٹو نے اپنے خطوط میں مندرجہ ذیل القابات استعمال کئے ہیں:۔

برادرِ مکرم، ندیم صاحب، برادرِ محترم، بھائی صاحب، برادرِ عزیز، پیارے ندیم، برادرم ندیم جانِ من وغیرہ۔ اختتامی الفاظ یوں ہیں:۔ خاکسار، آپ کا بھائی، نیاز کیش، آپ کا، تمہارا بھائی، ہمیشہ تمہارا ایک صرف اختر شیرانی مرحوم کو مکرمی و معظمی کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اکثر خطوط میں آداب کے طور پر السلام علیکم یا وعلیکم السلام لکھا ہے لیکن ایسے خطوط جہاں القاب میں خاصی بے تکلفی ہے مثلاً جہاں پیارے ندیم، جانِ من، بھائی ندیم، ندیم بھیا وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہاں آداب کے کلمات غائب ہیں۔

منٹو کے یہ خطوط اس زمانے کی یادگار ہیں جب انہوں نے صحافت اور فلمی صنعت کے میدان میں اپنے قدم جمائے تھے۔ یہ سارا زمانہ ان کے پختہ ہوئے شعور کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں انہوں نے زندگی کے بڑے نشیب و فراز دیکھے۔ ان کی شادی ہوئی، بچے پیدا ہوئے۔ صحافت اور فلمی منشی گری کا پیشہ اختیار کیا۔ ریڈیو کی ملازمت اپنائی اور پھر مستقل طور پر فلمی دنیا کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔

اُس زمانے میں انہوں نے غربت کی سختیاں جھیلیں اور دولت کے ٹھاٹھ دیکھے۔ بہترین کہانیاں لکھیں اور شہرت کی بلندیاں چوم لیں۔ اس دوران میں آن کے خیالات اور نظریات میں جو تغیر و تبدل ہوا۔ اُن کو بھی ان خطوط میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

منٹو کی شخصیت کے بارے میں اکثر عجیب و غریب تبصرے ہوا کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں موضوع، اسلوب اور ٹیکنیک کی انفرادیت، اِن کی ذاتی زندگی اور اُن کے نظریات ایک زمانے کو پریشان کر چکے ہیں۔ ایسے میں ان کے نجی خطوط (جو کبھی شایع کرنے کے لئے نہیں لکھے گئے تھے) کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

منٹو کے ان خطوط کی ایک اہم خصوصیت ان کا بیکراں خلوص ہے۔ منٹو کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کے خلوص کی قدر نہیں ہوئی۔ یہ اسی خلوص کا اعجاز ہے جو وہ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی اپنے چہرے پر خود غرضی، ریاکاری یا مصلحت اندیشی کا پردہ نہیں ڈالا بلکہ اپنے ظاہر اور باطن کو تمام تر برہنگی کے ساتھ پیش کیا۔ منٹو کو اپنے خلوص کی شدت کا اس قدر احساس تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ قاسمی صاحب کے ساتھ ملاقات کرنے کے بعد کہیں دوستی کا یہ رشتہ ٹوٹ نہ جائے۔ احمد ندیم قاسمی منٹو کے خطوط کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"چار برس کی خط و کتابت نے ہمارے درمیان پیار اور خلوص کا ایک ایسا رشتہ پیدا کر دیا جس کے بارے میں منٹو کو مسلسل یہ ڈر لگا رہا کہ کہیں ہم دونوں کی مُلاقات ہو گئی تو یہ رشتہ ٹوٹ نہ جائے۔"

اسی خلوص کی بنا پر منٹو اکثر گھاٹے میں رہے۔ منٹو کے نظریات ان کے دوستوں کے نظریات سے بالکل مختلف تھے۔ ادب کے مسایل پر بھی ان کی رائے دوسروں سے بالکل متضاد تھی۔ وہ دوست بنا کر دوستی کو نبھانے کا فن جانتے تھے لیکن ان کی حد سے بڑھتی ہوئی انانیت جو اُن کی شہرت کا ایک اہم عنصر تھا بعض اوقات ان کی دوستی کی راہ میں حایل ہوتی تھی لیکن خلوص کا جذبہ قایم و دایم رہتا۔

تقسیم ملک کے بعد جب وہ پاکستان چلے گئے تو وہاں احمد ندیم قاسمی کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا اور جس بات کا خطرہ منٹو کو بہت پہلے پیدا ہوا تھا وہ اب ٹلنے والا نہیں تھا۔ قاسمی صاحب کٹر قسم کے اشتراکی تھے اور منٹو اشتراکیت سے دُور چلے آئے تھے۔ چنانچہ ان کے درمیان نظریات کی جنگ کا آغاز ہوا۔ منٹو کے خلوص میں ذرہ بھر بھی فرق پیدا نہ ہوا لیکن بعد میں جب قاسمی صاحب کا لہجہ ناقدانہ اور ناصحانہ ہو گیا تو منٹو کی ازلی انانیت نے پھر سے سر اٹھا لیا اور انہوں نے قاسمی صاحب سے کھلے الفاظ میں کہا "میں نے تمہیں اپنے ضمیر کی مسجد کا امام مقرر نہیں کیا صرف دوست بنایا ہے" منٹو کی شخصیت کا یہ پہلو ان کے خطوط میں ہر جگہ جھلکتا ہے۔ چند مثالیں :-

۱۔ "مجھ میں بحیثیت ایک انسان کے بے حد کمزوریاں ہیں۔ اس لئے مجھے ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ یہ کمزوریاں دوسروں کے دل میں میرے متعلق نفرت پیدا کرنے کا موجب ہوں"۔

۲۔ "مجھ میں ایک لاکھ عیب ہیں جو اس وقت آپ کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں جس وقت آپ میرے قریب آ گئے تو میں بالکل ننگا ہو جاؤں گا"۔

۳۔ "نذیر صاحب یا پنڈت کرپا رام ان چار برسوں کے ڈھیر میں ایک دن بھی ایسا کرید کر نہیں نکال سکتے جن کے ساتھ میرا خلوص چمٹا ہوا نہ ہو"۔

۴۔ "آپ کے تعریفی الفاظ سے مجھے ذرا "وہ" ہو گیا۔ میں لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ میں اپنی تعریف سے خوش نہیں ہوتا لیکن یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ نے میرے افسانوں کی تعریف کی تو واللہ میں مخمور سا ہو گیا"۔

منٹو کے خطوط میں اکثر حصے ایسے ملتے ہیں جہاں انہوں نے اپنے سینے کو چاک کر کے رکھ دیا ہے اور اپنی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ ان خطوط کو پڑھ کر ہمارے سامنے ایک بہت ہی پریشان حال، مالی مشکلات میں گھرے ہوئے دوست نما دشمنوں کے ستائے ہوئے آرزوؤں کو سینے میں چھپائے ہوئے ایک نوجوان فن کار کی تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ یہ فن کار حالات کی ستم رانیوں کا ذکر کر کے اپنی بے شمار کوتاہیوں کو تسلیم کرتا ہے اور پھر بھی جئے جاتا ہوں۔ ایسی تمام انانیت کے

باوجود اُس کے سینے میں چھپے ہوئے ان جذبات کو دیکھئے جن سے اس کا سارا باطن صاف طور پر نظر آتا ہے مثلاً:۔

۱۔ "میں ایک شکستہ دیوار ہوں جس پر پلستر کے ٹکڑے گر کر زمین پر مختلف شکلیں بناتے رہتے ہیں"۔

۲۔ "مجھ میں بحیثیت ایک انسان کے بے حد کمزوریاں ہیں۔ اس لئے مجھے ہر وقت ڈر رہتا ہے کہ یہ کمزوریاں دوسروں کے دل میں میرے متعلق نفرت پیدا کرنے کا موجب نہ بن جائیں۔ اور اکثر اوقات ایسا ہوا ہے کہ ان ہی کمزوریوں کے باعث مجھے کئی صدمے اٹھانے پڑے ہیں"۔

۳۔ "بہت زیادہ شراب پینے لگا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ کچھ لکھوں۔ پی کر میں لکھ ہی نہیں سکتا۔ دراصل میں اپنے اندر وہ بات ڈھونڈھ رہا ہوں جو مجھے کرنا ہے۔ اگر مجھے یہی کرنا ہے جو میں اب تک کر چکا ہوں تو یہ کچھ بھی نہیں"۔

۴۔ "زندگی کے جن ادوار سے میں گذر رہا ہوں اس پر نظر کرنے کی میرے پاس فرصت نہیں۔ کئی اسٹیشن آتے ہیں جن پر میری زندگی کی گاڑی ٹھہرتی ہے مگر میں تھکاوٹ سے چور سفر کے آغاز سے ہی تنگ آیا ہوں۔ وہ بورڈ ہی نہیں پڑھ سکتا جس سے مجھے سٹیشن کا نام معلوم ہو جائے۔ عجیب حالت ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور سمجھ میں آئے بھی کیسے جب کہ سمجھنے کی فرصت بھی نہیں"۔

۵۔ "میری زندگی ایک دیوار ہے جس کا پلستر میں ناخنوں سے کھرچتا رہتا ہوں۔ کبھی چاہتا ہوں کہ اس کی تمام اینٹیں پراگندہ کر دوں۔ کبھی یہ جی میں آتا ہے اس ملبے کے ڈھیر پر ایک نئی عمارت کھڑی کر دوں۔ اس اُدھیڑ بن میں لگا رہتا ہوں دماغ ہر وقت کام کرنے کے باعث تپتا رہتا ہے۔ میرا نارمل درجہ حرارت ایک ڈگری زیادہ ہے جس سے آپ میری اندرونی تپش کا اندازہ کر سکتے ہیں"۔

یہ اور اس قبیل کی کمزوریاں ' منٹو کے خطوط' میں ہر جگہ بکھری پڑی ہیں۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ ان کمزوریوں کی وجہ سے اُن سے مُنہ نہ موڑیں حتیٰ کہ انہوں نے قاسمی صاحب کو ایک بار یہ بھی لکھا کہ وہ ان تلخ حقائق کے پیشِ نظر اُن کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہ کریں تاکہ بعد میں انہیں اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی نہ کرنا پڑے۔ 'منٹو کے خطوط' پکار پکار کے یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ وہ زمانے کے ہاتھوں لُٹ چکے ہیں۔ وہ خود سے مطمئن نہ تھے۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتے تھے اس کے لئے انہیں مواقع میسر تھے اور نہ ہی سہولتیں۔ وہ ایک مریض معاشرے میں پستے جا رہے تھے جہاں منٹو جیسے صاحبِ قلم اور فنکار کو معمولی سی اُجرت کے لئے زیادہ محنت کرنا پڑتی تھی۔ کافی محنت کرنے کی وجہ سے انہیں مسلسل نقاہت اور تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ بعض اوقات زندگی انہیں ایک بارِ گراں محسوس ہو رہی تھی۔ کبھی انہیں خودکشی کا خیال آتا تھا اور کبھی وہ شراب میں پناہ لینے لگتے تھے۔

'منٹو کے خطوط' کی ایک اہم خصوصیت اُن کے تنقیدی تجزیئے ہیں۔ منٹو کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف اکیس برس کی عمر میں ہفت روزہ 'مصور' کی ادارت سنبھالی۔ ان کی تعلیمی قابلیت معمولی تھی۔ میٹریکولیشن میں تیسری بار کوشش کرنے پر کامیاب ہوئے تھے اور اُردو کے مضمون میں ناکام قرار دیئے گئے تھے لیکن مصور کی ادارت کے دوران میں انہوں نے نہ صرف مصور کی ادارت کامیابی سے کی بلکہ خود ہی لکھنے پڑھنے کا کارنامہ انجام دیا۔ ترجموں سے طبعزاد مضامین افسانوں اور ڈراموں پر چلے آئے اور ساتھ ہی دوسروں کے کارناموں پر نظر ڈالنے کی صلاحیت پیدا کر لی۔ منٹو فلم انڈسٹری کے ساتھ وابستہ ہو کر اس کی تمام باریکیوں سے واقف ہو چکے تھے۔ انہوں نے فلمی کہانیوں کی تکنیک پر کافی دسترس حاصل کر لی۔ چنانچہ اُن کے خطوط میں فلم اور ادب سے متعلق مختلف موضوعات پر ان کے جائزے بار بار نظر آتے ہیں مثلاً:-

۱۔ اسٹوری لکھتے وقت یہ امر ضرور پیش نظر رکھئے گا کہ جو کچھ آپ کہنا چاہیں وہ آپ اپنے کریکٹروں کے ذریعے سے ESTABLISH کراتے چلے جائیں۔ مثلاً آپ لکھتے ہیں:-

"فضل بڑا ظالم ہے تو یہ چیز سکرین پہ دکھانے کے لئے ایک INCIDENT کی ضرورت ہے مثلاً ڈائیلاگ سے کام نہیں چل سکتا۔ اسٹوری SMOOTH اور وقائع و مناظر سے بھری ہوئی ہو۔ قدم قدم پر ایک GRIP ہو"

۲۔ "فسانہ (فلمی) لکھتے وقت یہ خیال رکھیئے کہ اس میں پبلک کی دل چسپی کا کافی سامان ہو۔ دیہاتی رقص دیہاتی گانے اور اس قسم کی دوسری چیزیں آپ بڑی آسانی سے آپ اپنے افسانے میں رکھ سکتے ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ فسانہ بالکل سیدھا سادھا یعنی SMOOTH ہو اور کہیں الجھن نہ ہو۔ ہمارے یہاں کے فلمی افسانوں میں عام طور پر JERKS ہوتے ہیں جو ناقابلِ عضو سقم ہے۔ عام طور پر ٹریجڈی زیادہ پسند کی جاتی ہے۔"

۳۔ "آپ کا افسانہ میں نے پڑھا میری بے لوث رائے یہ ہے کہ آپ بقدر کفالت ضبط کو کام میں نہیں لاتے۔ آپ کا دماغ اسراف کا زیادہ قائل ہے۔ ایک چھوٹے سے فسانے میں آپ نے سینکڑوں چیزیں ٹھونس ڈالی ہیں حالانکہ وہ کسی دوسری جگہ کام آسکتی تھیں۔"

مندرجہ بالا اقتباسات سے منٹو کے تنقیدی شعور پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب اور فن کو پرکھنے کا ایک معیار رکھتے تھے۔ منٹو نے بہت سے مضامین بھی لکھے ہیں جو ان کے مضامین کے مجموعوں میں شامل ہیں لیکن یہاں پر یہ بتانا ضروری ہے کہ انہوں نے جہاں کہیں بھی دوسروں کے فن پر اظہار کیا ہے یا فلموں کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ بھی ان کے سلجھے ہوئے ذوقِ سلیم کی غمازی کرتا ہے۔ منٹو خاص طور پر افسانے کی تکنیک اور ہیئت کے فنی اصولوں سے گہری واقفیت رکھتے تھے اور ظاہر ہے انہوں نے افسانہ نگاری کے فنی اصولوں سے مغربی تنقید سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ انہوں نے افسانے کی تکنیک کے بارے میں بارہا اختصار پسندی اور الفاظ کی کفایت، افسانے کی فطری گرفت، وحدتِ تاثر OBJECTIVE TOUCH اور عروجی مناظر کا ذکر کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ افسانے کے فن پر انہیں کس قدر دسترس حاصل تھی۔ منٹو کے خطوط میں دوسرے موضوعات پر بھی ان کے خیالات ملتے ہیں۔ عورت اور اس

کی زندگی ان کا محبوب موضوع رہا ہے۔ ان کے بہت کم افسانے ہیں جن میں انہوں نے عورت کے باطن کو ٹٹول کر نہ رکھ دیا ہو۔ ان کی عورت عام پتی ورتا اور عصمت شعار عورت نہیں۔ کیوں کہ ایسی عورتوں سے متعلق ہمارا ادب بھرا پڑا ہوا ہے۔ وہ چونکہ بنے ہوئے راستوں پر چلنے کے عادی نہ تھے لہذا انہوں نے عورت کے دوسرے رُخ کو بھی بے نقاب کر دیا۔ انہوں نے ایسی عورتوں کی کہانیاں لکھیں جن کو عرفِ عام میں آبرو باختہ کہا جاتا ہے۔ ایک خط میں خود لکھتے ہیں :-

"پتی ورتا استریوں اور نیک دل بیویوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اب ایسی داستانیں فضول ہیں۔ کیوں نہ ایسی عورت کا دل کھول کر بتایا جائے جو اپنے پتی کی آغوش سے نکل کر کسی دوسرے مرد کی بغل گرما رہی ہو اور اس کا پتی کمرے میں بیٹھا سب کچھ ایسے دیکھ رہا ہو، گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔"

منٹو عشق کے افلاطونی نظریئے پر یقین نہیں رکھتے۔ وہ عورت کے عشق کی شہوانیت سے خارج کر کے نہیں دیکھتے لیکن اس ضمن میں ان کے خیالات واضح نہیں بلکہ ایک بات کہہ کر وہ اپنی ہی تشکیک کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اپنے ایک خط میں رقمطراز ہیں :-

"عشق و محبت کے متعلق سوچتا ہوں تو صرف شہوانیت ہی نظر آتی ہے۔ عورت کو شہوانیت سے الگ کر کے میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ پتھر کی ایک مورتی رہ جاتی ہے.....
مگر یہ ٹھیک بات ہے نہیں۔ میں جانتا ہوں۔ نہیں میں جاننا چاہتا ہوں کہ پھر آخر کیا ہے؟ کیا ہونا چاہئیے؟ اگر یہ نہیں تو پھر اور کیا ہوگا لیکن میں عورتوں کے بارے میں وثوق سے کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتا۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہی کہاں ہوا ہے عورت کا وہ تصور جو ہم لوگ اپنے دماغ میں قائم کرتے ہیں۔ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔"

منٹو کے خطوط کا سب سے امتیازی پہلو ان کا طرز بیان ہے ان خطوط میں نہ شاعرانہ اسلوب ملتا ہے اور نہ فلسفیانہ رنگ۔ نہ تشبیہوں کا سہارا لیا گیا ہے اور نہ استعاروں کا دامن پکڑا گیا ہے۔ یہ خطوط عام روزمرہ کی زبان میں ملتے ہیں اور ان میں وہی بے تکلفی اور سادگی ملتی ہے

جو قریبی دوستوں کی گفتگو میں ہو سکتی ہے۔ ان میں انگریزی الفاظ کا بے جا استعمال اور بات بات پر اشعار کی بھرمار نہیں ملتی بعض اوقات یہ خیال ہی نہیں ہوتا کہ یہ خطوط اردو کے ایک عظیم افسانہ نگار کے خطوط ہیں۔ کفایت الفاظ کا خیال بدرجہ اتم رکھا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ایک منفرد کئے ہوئے سانچے کے مطابق لکھتے جا رہے ہوں۔ مکاتیبی ادب میں اکثر خطوط ایسے دیکھنے میں آتے ہیں جو خطوط کم اور افسانے زیادہ ہیں لیکن منٹو کے خطوط کسی اخبار میں چھپی ہوئی خبروں کی مانند ہوتے ہیں۔ اس اندازِ تحریر سے بعض اوقات اُن کے خطوط بے رنگ محسوس ہوتے ہیں۔ جملوں میں ایک دوسرے کے ساتھ کوئی ربط نہیں جیسے تار کی زبان ہو مثلاً:۔

"مصوّر کے لئے جو غزلیں آپ نے روانہ کی ہیں ان کا شکریہ۔ اگر آپ یہاں ہوتے تو میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا تھا۔ آپ جب چاہیں میرے پاس تشریف لا سکتے ہیں میری صحت دن بدن خراب ہو رہی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ... بخیریت ہوں گے"۔

منٹو کے نام — مشاہیرِ ادب کے خطوط

سعادت حسن منٹو کو یہ سعادت بھی نصیب ہوئی کہ اُن کی انفرادیت کو معاصر ادیبوں نے بھی تسلیم کی تھی۔ اس بات کا عندیہ اُن کے نام لکھے گئے اُن خطوط سے ملتا ہے جو ہم اس کتاب میں شامل کر رہے ہیں۔ اس طرح سے منٹو کی شخصیت کو ایک بھرپور تواریخی تناظر میں دیکھا اور پرکھا جا سکے۔ زیرِ نظر خطوط کی ادبی اور تاریخی اہمیت مسلّمہ ہے۔ یہ خطوط منٹو پر کام کرنے والوں کی راہوں کو روشن کرنے میں لازمی طور پر کارآمد ثابت ہوں گے۔

(ا۔پ)

باری (علیگ)

عزیز منٹو

تسلیم۔ میں تمہارا مضمون "آغا حشر سے دو ملاقاتیں" (مطبوعہ ماہنامہ جاوید) پڑھ چکا ہوں۔ تم تیسری ملاقات بھول گئے ہو۔ مجھے یاد ہے۔ کہاں؟ پوچھو؟ تمہیں سن یاد نہیں رہتے اور یہاں مہینے اور دن تک حافظے میں محفوظ ہیں۔ اس مضمون نے میرے ذہن کے سامنے ان واقعات کی تصویر پیش کر دی جن پر سولہ سال بیت چکے ہیں۔ ان واقعات کی یاد قائم رکھنے کی ذہن میں آئی کہ تمہیں ایک خط لکھوں۔ خط لکھنا شروع تو کر دیا لیکن اب اس سوچ میں ہوں کہ اسے کہاں ختم کروں۔

"لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم"

یہ خط آج کل میں تمہیں پہنچ جائے گا۔ بچوں کو پیار۔

تمہارا

باری (مرحوم)[1]

لاہور۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۴۹ء

[1] غالباً یہ باری (علیگ) کا آخری خط ہے۔

احمد ندیم قاسمی

سعادت بھائی۔ سلام محبت

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں ۲۴ اپریل سے علیل ہوں۔ آپ کی مجوزہ دوا کا اشتہار مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ بہر کیف اس امر کا مجھے افسوس رہا کہ آپ مجھے پوچھنے تک نہ آئے۔ آپ کو اس بات کا تو یقیناً احساس ہو گا کہ یہ شکایت کرتے ہوئے میں حق پر ہوں۔

۱۵ اگست کو 'نقوش' کا ضخیم آزادی نمبر آرہا ہے۔ اگر اس کے لئے آپ کوئی کہانی مرحمت فرمائیں تو یہ آپ کا بہت بڑا کرم ہو گا۔ میں یہاں کوئٹہ ہی میں آپ کی عنایت کا منتظر ہوں گا۔

احمد ندیم قاسمی

کوئٹہ

●

احمد ندیم قاسمی

برادرم سعادت، سلام مسنون۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ میرا وہ خط جو میں نے کوئٹہ سے لکھا تھا اپنے رسالہ 'اردو ادب' میں شائع کر رہے ہیں۔ میرے اس خط کی اشاعت روک لیں۔ جب میں نے آپ سے افسانہ طلب کیا تھا۔ تو ہماری انجمن (انجمن ترقی پسند مصنفین) نے ایسی کوئی پابندی عائد نہیں کر رکھی تھی کہ وہ رسالے جنہیں ترقی پسند ادب کی نمائندگی کا دعویٰ ہے ایسے ادیبوں کی تحریریں شائع نہ کریں جنہیں ترقی پسند ادب کی تحریک سے اتفاق نہیں۔ اب یہ فیصلہ ہو چکا ہے اور میں انجمن کے منشور، آئین اور فیصلوں کا پابند ہونے کے باعث یہ نہیں چاہتا کہ میرا وہ خط پڑھ کر ہماری تحریک کے ہمدرد الجھن میں پڑ جائیں۔ امید ہے آپ میرا وہ خط روک لیں گے اور اگر ایسا ناممکن ہوا تو یہ خط بھی شائع کر دیں گے۔ شکریہ۔ والسلام

احمد ندیم قاسمی

لاہور۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۴۹ء

●

جاوید اقبال۔

بھائی سعادت۔ سلام مسنون

میں اپنا وعدہ نہیں بھولا۔ انگلستان جانے سے پیشتر ضرور آپ سے مل کر جاؤں گا اور جب تک سعادت حسن منٹو کمیونسٹوں سے الگ ہے جب تک سعادت حسن منٹو کے دل میں پاکستان کے مسلمانوں کے لئے درد ہے میں اس پر اپنے نظریات کی تبلیغ کرتا رہوں گا۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں ایک طویل عرصے کے لئے اپنے وطن کو خیر باد کہہ رہا ہوں لیکن مجھے یہ تسلی ضرور ہے کہ سعادت حسن منٹو عسکری کی معیت میں ہے اور عسکری اسے غلط راستے پر چلنے سے ٹوکے گا۔ عسکری اسے بچائے گا۔

اب ڈرامے لکھنے پر کچھ طبیعت نہیں جمتی میری تمام تر توجہ اب فقہ اسلامی اور فلسفے پر ہے اور میرے دشمن ابھی بہت سے پیدا ہونے ہیں کیوں کہ میں نے فقہ کے متعلق ابھی تک اپنے نظریات کا اظہار نہیں کیا۔ میری اللہ سے دعا ہے کہ آپ کا ایمان برقرار رکھے۔ ایمان کا تعلق قلب سے ہے اور قلب انسانی نیت کا مسکن۔ یہ نیت یا تو فرد خود جانتا ہے یا خدا۔ دنیوی مسائل خیر و شر سے نیت انسانی ماورا ہے۔ خلوص نفسیاتی طور پر حقارت اور طنز سے شروع ہوتا ہے۔

اللہ آپ کو اس درد سے آشنا کر دے کیوں کہ مجھے درد سے شناسائی کی اہلیت آپ میں دکھائی دیتی ہے۔

جاوید اقبال

لاہور۔ ۱۲ اگست ۱۹۴۹ء

●

راجہ مہدی علی خان

منٹوام۔ تم منٹو رہو ہزار برس۔

تمہارا بہت موٹا پرچہ اور بہت دبلا خط ملا۔ اتنا موٹا پرچہ شائد تم نے میری یاد میں شائع کیا ہے۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ ارادہ تھا کہ پرچے کے متعلق اپنی تفصیلی رائے لکھوں لیکن آج مجھے پچھلے ایک سال کے موصول شدہ خطوط کا جواب دینا ہے۔ تمہارے جانے کے بعد میرا شغل خطوط

نویسی بھی گیا تیرے جلتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت۔

"اردو ادب" میں نے ٹائیٹل سے لے کر اشتہاروں تک پڑھ ڈالا۔ آج تک میں نے کسی پرچے کا اس قدر بری طرح سے مطالعہ نہیں کیا۔ معلوم نہیں یہ تمہاری محبت تھی یا پرچے کی غیر معمولیت؟

'اردو ادب' بھی منٹو کی طرح دوسرے پرچوں سے جدا نظر آتا ہے۔ ہمایوں مرحوم کے بعد دوسرا اچھا پرچہ نظر آیا۔ نظم کا حصہ تو خیر ویسا ہی ہے جیسا ہے لیکن اس میں تمہارا کیا قصور۔ اچھی نظم تو اب کسی پرچے میں نظر نہیں آتی۔ آج کل نظموں میں شاعری کم ہے اور ترقی زیادہ۔

راجہ مہدی علی خاں

بمبئی۔ ۸۔ اگست ۱۹۴۹ء

کنہیا لال کپور

پیارے منٹو

جے اردو ادب۔ 'اردو ادب' کا پہلا نمبر ملا۔ تمہاری قسم بہت پسند آیا۔ عسکری کا مقالہ تمہارا شہید ساز، شوکت تھانوی کی پیروڈی اور فراق کی غزل، شفیق کا افسانہ اور اپنا مضمون عسکری کی قسم مزا آگیا۔

چودھری رشید کی قسم جھوٹ نہیں کہتا، بھئی تم یقیناً بے وقوف نہیں ہو۔ سردار جعفری کی قسم یہ لوگ جو تمہارے ارد گرد پھیلے ہوئے ہیں، بے وقوف ہی نہیں پاگل بھی ہیں۔ کرشن چندر کی قسم میں 'اردو ادب' کے دوسرے نمبر کے لئے پانچ سات دنوں میں مضمون بھیج دوں گا۔

یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ تم بیمار ہو۔ میری جان تندرست کب تھے؟

کنہیا لال کپور

موگا۔ ضلع فیروز پور

فکر تونسوی

برادرم منٹو صاحب

میں مشورہ دے سکتا ہوں نہ نصیحت کرنے کا اہل ہوں۔ اس لئے کہ اردو ادب پر تبصرہ کرنے والے اہلِ نظر کی کمی نہیں۔

آپ پر اور آپ کے گذشتہ اور موجودہ آرٹ پر جو لے دے ہوئی اسے پڑھتا اور سنتا رہا ہوں۔ اس سارے غوغا پر سوائے اس کے میں اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ آپ خواہ مخواہ ترقی پسند دوستوں سے بچھڑ گئے۔ یہ جدائی مستحسن نہیں۔

فکر تونسوی

جالندھر۔ ۸۔ اگست ۱۹۴۹ء

●

سلام مچھلی شہری

محترمی منٹو صاحب

یہاں میری حیثیت ایک اچھوت کی سی ہے۔ لکھنؤ اور بمبئی کے ترقی پسند حلقوں میں شائد پسند نہیں کیا جا رہا ہوں۔ میرا قصور یہ ہے کہ میں عورت اور آرٹ کی باتیں زیادہ کرتا ہوں۔ نوکر ہوں اور اسی لئے چاپلوس ہوں۔ کمیونسٹ نہیں ہوں۔ اس لئے پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں پھر بھی کوشش کروں گا کہ اپنے خاص جاننے والوں کی کچھ چیزیں آپ کو بھجواؤں۔

سلام مچھلی شہری

لکھنؤ۔ ۲۶ اگست ۱۹۴۹ء

●

عبدالسلام خورشید

بھائی منٹو!

آپ نے مضمون لکھنے کو کہا۔ اور میں مخمصے میں پڑ گیا کیوں کہ آپ جانتے ہیں میں ایک ترقی پسند

لکھاری ہوں۔ ادیب کا لفظ جان بوجھ کر استعمال نہیں کر رہا۔ اگرچہ میرے ترقی پسند بھائیوں نے اس لفظ کو ہر لکھاری کے نام سے وابستہ کر دیا ہے لیکن میں اپنے آپ کو ادیب کہہ کر لسانی بد دیانتی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ 'نقوش' کے پچھلے جشن آزادی نمبر میں بھائی احمد ندیم قاسمی نے ڈاکٹر تاثیر کی تصویر کے نیچے لکھا: 'جو ادب کے ہر گوشے پر حاوی ہیں' بس یہی ادیب کی تعریف ہے۔ میں افسانہ نگار ہوں نہ شاعر۔ کبھی کبھی ہلکی پھلکی تنقید کر لیتا ہوں لیکن بر اہو اس نالائقی کا کہ شعور تحت الشعور اور لاشعور کے سے الفاظ استعمال کرنے کا شعور نہیں۔ مارکسیت اور جدلیات سے بے بہرہ ہوں اس لئے وہ جو ترقی پسند تنقید ہوتی ہے میرے بس کا روگ نہیں۔ سیاسی اور صحافتی مقالے لکھ لیتا ہوں اور میرے ترقی پسند دوست انہیں کبھی کبھی اپنی ترازو میں تول کر کہتے ہیں۔ ترقی پسند تو ہے لیکن بورژوائی بُو ابھی تک آتی ہے۔

ہاں تو میں ایک ترقی پسند لکھاری ہوں۔ آپ جانتے ہیں آج کل رسالوں کی ترقی کا دارومدار اسی بات پر ہے کہ اس میں ترقی پسندوں کی نگارشات چھپیں۔ اس لئے ہم ترقی پسند لوگ عام طور پر احتیاط برتتے ہیں کہ کسی غیر ترقی پسند یا رجعت پسند رسالے میں مضمون نہ لکھا جائے۔ اس سے ایسے رسالے خواہ مخواہ بازار میں زیادہ بکنے لگتے ہیں اور ظاہر ہے ہم رجعت پسندوں کا فروغ نہیں چاہتے۔ اندر ہی اندر ہم ترقی پسندوں میں کھچڑی پکتی رہی کہ فلاں فلاں رسالے کا بائیکاٹ کر دیا جائے۔ اس سے وہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گا۔ بعض پرولتاری ساتھی ذرا تیز تھے۔ انہوں نے اخبارات اور رسائل کے متعلق تخلیقی پس منظر جو دیکھا تو علامہ مشرقی کی ایک حرکت دیکھ کر پھڑک اٹھے۔ علامہ مشرقی کی پتنگ کسی زمانے میں خوب چڑھی ہوئی تھی اس نے ایک اخبار کے بائیکاٹ کا حکم جاری کیا۔ خاکساروں سے کہا اس میں کوئی خبر اشاعت کے لئے نہ بھیجو اور ہر شخص سے کہو کہ وہ اس اخبار کو کبھی نہ پڑھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بائیکاٹ کامیاب نہیں ہوا۔ لیکن پرولتاری ساتھیوں نے کہا، ہم اس نسخے کو ضرور آزمائیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین مغربی پنجاب کی مجلس عاملہ نے پچھلے دنوں ایک قرارداد منظور کر دی جس کے آخر میں لکھا تھا۔

"اس کے ساتھ ہی ہم ترقی پسند ادیبوں اور صحافیوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ سرکاری رسائل اور ان پرچوں کے ساتھ تعاون کر کے عوام کو غلط فہمی کا موقعہ نہ دیں جو اپنے اداریوں

میں تحریک کی مخالفت کرتے ہیں اور انتشار پھیلاتے ہیں۔"

مجھے یاد نہیں کہ آپ نے اپنے کسی اداریئے میں تحریک کی مخالفت کی یا نہیں لیکن اس کے باوجود 'اردو ادب' میں مضمون چھپنے سے بس گھبراتا تھا کہ اسی قرارداد میں ترقی پسند ادیبوں، صحافیوں اور دانشوروں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ رجعت پسند رجحانات کے علمبردار ادیبوں کے خلاف سخت جدوجہد کریں اور انہیں مکمل طور پر بے نقاب کریں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:۔

"آج پاکستان میں ان رجعت پسند اور عوام دشمن ادیبوں کی پوزیشن یہ ہے کہ ایک طرف تو ادبی لیٹروں کا وہ سرغنہ ہے جو انجمن کی مخالفت میں تنظیمی طور پر ایڑی چوٹی کا پسینہ صرف کئے دے رہا ہے (ادبی قیادت کا محاورہ ملاحظہ ہو) اس سرغنے میں عزیز احمد، حسن عسکری، ڈاکٹر تاثیر، ممتاز شیرین اور اس کے شوہر ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اونچی ملازمتوں سے فیض یاب ہو کر اس سرغنے کی پشت پناہی کرتا ہے۔ اس گروہ میں احمد علی اور اختر حسین رائے پوری کا نام لیا جا سکتا ہے۔ تیسرا گروہ ان ادیبوں کا ہے جو اپنی رجعت پسندی میں گھٹنوں دھنسے رہنے کے باعث ترقی پسند ادب سے نفرت کرتے ہیں اور چونکہ وہ خلا میں نہیں رہ سکتا اس لئے ادبی لٹیروں کے ساتھ تعاون کر رہا ہے۔ اس گروہ میں سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی (کچھ نام جو اصل کاغذ پر کاٹ دیئے گئے ان میں قرۃ العین حیدر اور اس خاکسار کے اسماء شامل تھے۔ قرۃ العین حیدر کا نام اس لئے کٹا کہ نقوش کے تازہ پرچے میں غلطی سے ان کی تصویر چھپ چکی ہے اور خاکسار کا نام اس وجہ سے کاٹا گیا کہ مجلس عاملہ کے کچھ ممبروں نے اصرار کیا) وغیرہ شامل ہیں۔"

منٹو صاحب! اب آپ ہی فرمایئے میں 'اردو ادب' کے لئے کیسے کوئی مضمون لکھوں؟ آپ کے ایک ایڈیٹر میرے ترقی پسند ساتھیوں کے نزدیک ادبی لٹیرے ہیں اور آپ ادبی لٹیروں سے تعاون کر رہے ہیں۔ اگر میں نے آپ کے لئے مضمون لکھ دیا تو انجمن سے نکالا جاؤں گا۔ خدا را میری حالت پر رحم کیجئے۔ میں لٹیروں کا ساتھی بننے سے بال بال بچا اور اب آپ مجھے گمراہ کر رہے ہیں۔

میں آپ سے ترقی پسندی کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ آپ اپنے موجودہ مشاغل سے باز آجایئے اور اچھی چیزیں مت لکھیئے آپ کے اچھے افسانوں اور مقالوں سے میرے ساتھیوں کی چودھراہٹ ختم ہوتی جارہی ہے۔ انہیں چودھری بنا رہنے دیجئے۔ آپ کا کیا حرج ہے اور اگر آپ موجودہ حرکتیں جاری رکھیں گے تو یاد رکھیئے ہماری قرارداد میں یہ بھی لکھا ہے:۔

"ہم ترقی پسند رسائل اور اُن کے مدیروں سے خاص طور پر اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان رجعت پسند اور حکمرانوں کے نقارچی ادیبوں اور ان کے حالی موالیوں کی گمراہ کن تحریروں کو اپنے صفحات میں جگہ نہ دیں۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ 'نقوش' اور 'سویرا' میں ادبی پبلک سیفٹی ایکٹ کے ماتحت آپ کا داخلہ ممنوع قرار دیا جائے۔ پھر آپ کو کون پوچھے گا؟ اسی عبرتناک انجام پر اچھی طرح سوچ بچار کر لیجئے۔

ممکن ہے آپ کے دل میں سوال اُٹھے کہ اگر میں لٹیروں کا ساتھی ہوں تو انجمن ترقی پسند مصنفین مغربی پنجاب نے پہلے یوم اقبال کی صدارت مجھے کیوں سونپی؟ صاحب! ہم نے جھک ماری۔ برا کیا کہ آپ کو بلالیا۔ اور کیا کہتے ہیں؟ آپ سوچیں گے کہ مجھے تو ترقی پسند نقاد بانس پر چڑھائے پھرتے تھے لیکن ہم ایسی باتیں سننے کو تیار نہیں۔ جو شخص ادبی تخلیق کے بہتر نمونے پیش کرکے اپنے پرانے ساتھیوں کو احساس کمتری دلاتا ہے وہ فاشی ہے، رجعت پسند ہے، لٹیرا ہے۔ ہم آپ کی ایک بات بھی سننے کو تیار نہیں۔ آپ کو غصہ آگیا؟۔ یہ سب کچھ حکمران طاقت کے اشارے پر کیا جارہا ہے۔ یہ عوام دشمنی ہے۔ یاد رکھیئے آج عوام دوستی اسی کا نام ہے کہ ترقی پسند مصنفین کے دائرے کو محدود کیا جائے۔ صرف وہی لوگ لئے جائیں جو پارٹی لائن پر چلنے کو تیار ہوں۔ آپ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں تو آپ کبھی ترقی پسند نہیں بن سکتے۔ بھائی منٹو! دیکھا آپ نے میرے ساتھیوں کا غصہ۔ ان اصول پسند لوگوں کے حلقے سے الگ ہوکر میں کہاں جاؤں؟ میں کیسے آپ کے لئے مضمون لکھوں؟

لیجئے۔ اب اجازت چاہتا ہوں اور جاتے جاتے یہ مشورہ دیئے جاتا ہوں کہ 'آمریت' کو ہمیشہ 'عامریت' لکھا کیجئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین مغربی پنجاب کی قرارداد میں یوں ہی لکھا ہے اس لئے 'آمریت' لکھنا رجعت پسندی ہے۔

عبدالسلام خورشید

لاہور۔ ۲۰ راگست ۱۹۴۹ء

منٹو کے چند اہم خطوط

سعادت حسن منٹو نہ صرف ایک عظیم افسانہ نگار ہیں بلکہ ڈرامانگاری خاکہ نگاری اور مضمون نگاری میں بھی وہ منفرد اور ممتاز ہے۔ اسی طرح اُن کے خطوط بھی خاصے کی چیز ہیں۔ اب تک منٹو کے صرف چند بہت ہی اہم خطوط جو انھوں نے مشہور شاعر و افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے نام لکھے "منٹو کے خطوط" کے نام سے شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن ان خطوط کے علاوہ بھی انھوں نے احباب و اقربا کے نام بے شمار خطوط لکھے ہیں جو خاصے دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں۔ چناں چہ میں نے تلاش بسیار کے بعد انھیں حاصل کر کے اس مجموعے میں شامل کر دیا ہے تاکہ قارئین بھی ان سے فیض حاصل کر سکیں۔ ان خطوط کے مطالعہ سے منٹو کی شخصیت اور اُن کے فن کے بعض اہم گوشے اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ منٹو کے خطوط کا سب سے امتیازی پہلو اُن کا طرزِ بیان ہے۔ ان خطوط میں نہ شاعرانہ اسلوب ملتا ہے اور نہ فلسفیانہ رنگ، نہ تشبیہوں کا سہارا لیا گیا ہے اور نہ استعاروں کی مدد۔ یہ خطوط عام روزمرہ زبان میں لکھے گئے ہیں اور ان میں وہی بے تکلفی اور سادگی ملتی ہے جو قریبی دوستوں کی گفتگو میں ہو سکتی ہے۔ بہرحال قارئین کی دلچسپی کے لئے منٹو کے بعض قابلِ ذکر خطوط پیش ہیں۔

(ب۔ پ)

محمد طفیل کے نام۔

برادرم، السّلام علیکم۔

مجھے یہاں آئے ہوئے ساڑھے تین مہینے گذر چکے ہیں لیکن میں تمہیں اپنی خیریت کا خط تک نہ لکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ماحول میرے لئے نیا تھا۔ بہر حال اُس ماحول سے یقیناً بہتر ہے جس میں میں نے ۴۲ برس تک جھک ماری تھی۔ وہاں جب تک رہا سولی پر لٹکتا رہا۔

جب سے یہاں آیا ہوں۔ نہ صفیہ نے مجھ سے کوئی فرمائش کی ہے اور نہ ہی نگہت، نزہت اور نصرت میں سے کسی نے، ورنہ اکثر یہ ہوتا تھا۔ ابا فلاں چیز لا دو۔ فلاں چیز لا دو۔ تمہیں تو علم ہے کہ مجھے اپنی بچیوں سے بے انتہا محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی فرمائش اپنی تنگ دستی کی بنا پر پوری نہیں کر پاتا تھا تو خون کے آنسو رویا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ بعض منحوس سال ایسے بھی آئے تھے کہ بچی کی سالگرہ تھی اور جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔

ایسے ماحول میں میں کب تک رہ سکتا تھا۔ قدرت تو مجھے ایسے انسان کُش ماحول میں اور رکھنا چاہتی تھی لیکن میں نے خود ایسے ویئے اختیار کر لئے تھے کہ آپ کے جہنم زار سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں جب وہاں رہا۔ آپ لوگوں ہی کے غموں میں گھلتا رہا۔ نہ صرف گھلتا رہا۔ بلکہ آہستہ آہستہ معدوم ہی ہو رہا تھا۔ میں بھی تمہارے دُکھوں اور غموں کو اس لئے رقم کر آیا ہوں تاکہ آنے والی نسلیں تم سب کو مظلوم کی حیثیت سے یاد رکھ سکیں۔

میں ہر وقت یہاں یہی دُعا کیا کرتا ہوں کہ یہ زندگی میرے تمام ہمعصر افسانہ نگاروں کو جلد نصیب ہو۔ اس لئے کہ وہاں رہ کر میں نے جیسی ان کی زندگی بسر ہوتی دیکھی تھی۔ وہ تو مجھ سے بھی بدتر تھی جب مجھی کو وہاں سے آنا پڑا تو نہ جانے وہ کیوں ٹکے ہوئے ہیں۔

آپ کے تمام لکھنے والوں سے تعلقات ہیں جو لاہور میں موجود ہیں۔ اُن سے زبانی کہہ دیں۔ جو لاہور سے باہر ہیں۔ انہیں بذریعہ خط مطلع کر دیں کہ وہ سب کے سب بیوی بچوں سمیت میرے پاس آ جائیں۔ میں نے یہاں تمام ابتدائی معاملات طے کر لئے ہیں۔ اس لئے کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔

زمانے نے نہ میری قدر کی اور نہ دوسرے اہلِ قلم کی تمہیں علم ہے۔ اگر ہم لوگ تمہارے ہاں نہ ہوتے تو سوائے علم ادب اور آرٹ کے سب کچھ ہوتا۔

یہاں جو بھی پہنچ گیا ہے مزے میں ہے۔ اکثر قلمکاروں سے ملاقات رہتی ہے۔ سب میری طرح پھولے بیٹھے ہیں بعض نے تو تمہارے نمائش آباد کی شان میں ایسی ایسی ہجویات سپرد قلم کی ہیں کہ جب تک کلیجہ کو دونوں ہاتھوں سے نہ تھام لیا جائے ہنسی ہی نہیں جا سکتیں۔ اگر وہ چھپ گئیں تو تمہارے ہاں کے بعض سر پھرے سر بازار پٹیں گے۔

بہرحال ہجویات کا وہ مجموعہ جب بھی شائع ہوا تمہیں اس کا ایک نسخہ ضرور بھیجوں گا نقوش میں اس پر تبصرہ کر دینا۔

تمہارے ہاں کے ادیب اور تمہارے پڑوسی ملک کے ادیب اپنے اپنے ناخداؤں سے جو بڑی خوشگوار قسم کی امیدیں وابستہ کئے بیٹھے ہیں وہ سراسر حماقت ہے۔ ان خوشگوار قسم کی امیدوں کے پیٹ میں تو صرف بہن خوش فہمی لمبی تانے سو رہی ہے۔

تمہارے ہاں کی سیاست تو بڑی دھڑن تختہ قسم کی ہے۔ آج کوئی وزیر ہے تو کل جیل میں ہے۔ اگر کوئی چند دن پہلے جیل میں تھا اور ساتھ ہی غدار وطن بھی تو آناً فاناً وزیر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر میرے احباب جب تمہارے ہاں کی سیاست کے بارے میں گفت گو کرتے ہیں تو یقین جاننا میں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

تمہیں علم ہے کہ مجھ پر آپ کے ہاں پانچ مقدمے صرف فحاشی کے جرم میں چلے تھے۔ حالانکہ میں نے کوئی فحش تحریر نہیں لکھی تھی۔ اس ضمن میں مجھ پر کیا کیا ستم نہیں ڈھائے گئے تھے کبھی وارنٹ نکلے کبھی گرفتار ہوا کبھی دوستوں سے ادھار مانگ کر جرمانہ ادا کیا۔ اس کے باوجود میں نے انصاف زندہ باد کا نعرہ لگایا تھا۔ اگر میں کچھ دن اور وہاں رہ جاتا تو بہت ممکن تھا مجھ پر قتل، ڈاکہ زنی اور زنا بالجبر کے جھوٹے مقدمے بنا دیئے جاتے۔ جہاں ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہو وہاں کون مسخرہ رہے۔

اگر حکومت کے عتاب سے بچ جائیں تو نقاد پیچھا نہیں چھوڑتے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ساری عمر

نقادوں سے دُور بھاگتا ہوں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض نقاد بھی مجھ سے دُور بھاگتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ وہ ہیں جو بگڑے ہوئے افسانہ نویس اور بگڑے ہوئے شاعر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تخلیق کی قوت سے جب محروم ہوتے ہیں تو تنقید میں علامہ بن جاتے ہیں۔ مجھے ان سب سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے۔ اس لئے کہ جب یہ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھتے ہیں تو اچھی بھلی چیز میں سو سو عیب نکال لیتے ہیں لیکن ان حضرات کو اپنی تحریر کے عیوب کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ خدا کے لئے مجھے ان بے تحاشا لکھے پڑھوں سے بچانا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اپنے قلم تیز کر لیں اور میرے فن کی دوشیزگی کا جھٹکا کر دیں۔

آج ادب جبھی ترقی کریگا کہ جو نقاد کہئے اس کا اُلٹ کیا جائے۔ نقادوں کا منشا بھی یہی ہوتا ہے لیکن اسے میرے سوا سمجھا کوئی نہیں ہے۔

کاش مجھے یہاں کوئی نقاد مل جائے تاکہ میں اُس سے تنقیدی بحث کر سکوں۔ تنقیدی بحث کرتے ہوئے اگر کسی نے ان تینوں لفظوں کا صحیح استعمال کر لیا تو سمجھ لیجئے بازی لے گیا۔ وہ تین الفاظ یہ ہیں۔ اگر، مگر اور لیکن۔ جب تک نقاد تخلیق کی قوتوں سے مالا مال نہ ہوں گے۔ ان کی تحریروں میں نہ توازن پیدا ہوگا۔ اس پر ایمان لانا ہی پڑے گا۔[1]

یہاں شراب طہور عام ہے۔ پانی نہ پیجئے شراب طہور نوش کر لیجئے۔ تمہارے ہاں تو بڑی تھرڈ کلاس قسم کی شراب ملتی تھی اور اُس جگر پاش شراب کے لئے بھی مجھے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے تھے۔ بعض اوقات اس نامراد کے لئے ذلیل تک ہوا۔ دوستوں میں میری عزت نہ رہی۔ جدھر جاتا تھا۔ احباب مُنہ موڑ لیتے تھے۔ راستہ تک چھوڑ کر انجان بن جاتے تھے۔ اگر کسی سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ میرے مُنہ پر جھوٹی قسمیں کھا کر کہتا تھا کہ میری جیب میں دھیلہ تک نہیں ہے۔ حالاں کہ میں جانتا تھا کہ اس کی جیب میں دھیلہ چھوڑ اتنے روپے ہیں کہ وہ مجھے اس خانہ خراب کی کئی بوتلیں خرید کر دے سکتا ہے۔ میں نے شراب کو خانہ خراب اس لئے کہا ہے کہ اس کی بنا پر کئی بار خانہ میں خرابی پیدا ہوئی تھی۔

---

[1] نقادوں کے بارے میں منٹو کے جو خیالات ہیں۔ مجھے اُن سے اتفاق نہیں ہے لیکن مجھے ان کی رائے کے سلسلے میں خود کوئی ترمیم کرنے کا حق بھی نہیں۔ (محمد طفیل)

ایک بڑی خطرناک مگر راز کی بات کہتا ہوں۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ ورنہ پٹو گے۔ یہاں جتنی لڑکیاں ہیں۔ وہ سب ہزاروں برس پرانی ہیں لیکن ان کمبختوں کا جسم اور بانکپن تقدس توڑ ہے۔ اس مسئلہ پر تم سے بات کرنا قطعی حماقت ہے۔ اس لئے کہ تم اس مسئلے میں نرے چغد واقع ہوئے ہو تمہاری چغدیت کا احترام کرنے کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ ان سب میں ایسی پُر وقار کشش اور سپردگی سی پائی جاتی ہے کہ تمہارے ہاں کی لڑکیاں ان کے سامنے بالکل بکواس ہیں۔

یہاں ایسے ایسے جمال آور لڑکے بھی ہیں کہ تمہارے ہاں کا کوئی شاعر اور ادیب دیکھ لے تو اس کمبخت کے بے ہوش ہونے کے قطعی امکانات موجود ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ جانبر ہی نہ ہو سکے۔

میں ساری عمر ادبی تخلیقات کے سلسلے میں اپنے ہمعصروں سے شرمندہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے بھی کہ میرے مقابلہ ہی کا کون تھا لیکن یہاں آیا تو غالب نے بڑا پریشان کیا۔ بڑا پھبتی باز ہے۔ کہنے لگا تو تو میرا چور ہے، میرے شعروں سے تو نے اپنے افسانوں کے عنوان چنے۔ کتابوں کے نام تک جب سوجھے تو میرے شعروں کو دھر رگڑا۔ اور محسن کشی ایسی کی کہ میرے بارے میں جو فلمی کہانی لکھی۔ اس میں بجائے میری شگفتہ نگاری کے اظہار کے میری کسی خوبی کا ذکر تک نہیں کیا بلکہ الٹی میری کمزوریاں گنوا کے رکھ دیں کہ میں بڑا وہ تھا۔ رنڈی باز تھا۔ جوا کھیلتا تھا۔ اور اس کی یادداشت میں جھول تک ہو گئی تھی وغیرہ وغیرہ۔

تمہیں علم ہے کہ میں تمام لکھنے والوں میں صرف غالب ہی کو تو مانتا تھا جب اس نے بھی مجھ سے ایسی ایسی باتیں کہیں تو میں نے دل میں کہا لعنت ہو سعادت حسن منٹو تمہاری حقیقت نگاری پر۔

لیکن غالب ہے بڑا زندہ دل قسم کا انسان، میری اتنی زیادتی کے باوجود گاڑھی چھنتی ہے۔ ہم اکثر ایک ساتھ پیتے ہیں اور پیتے ہی؛ جب ہم حقیقت آشنا ہو جاتے ہیں اور ہماری انا بیدار ہوتی ہے۔ تو غالب کہتا ہے میں تم سے بڑا افسانہ نگار ہو سکتا تھا لیکن میں نے اسے فضول چیز سمجھ کر ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا اور میں اس سے کہتا ہوں شعر کہنا کون سا کمال ہے مرزا صاحب، میری تو نثر کی ہر ہر سطر میں ایک شعر کیا، پوری غزل کی غزل پنہاں ہوتی ہے۔ بات دونوں کی غلط ہے۔ اس کا علم اسے بھی ہے اور مجھے بھی لیکن ہم اپنی اپنی انا کا کیا کریں۔

چچا سام کا دبدبہ تو تمہارے ہاں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے مبارک ہو۔

بڑوں کی عزت ضرور کرنی چاہیئے لیکن سعادت مندی کے معنی یہ بالکل نہیں ہیں کہ تم اپنی ننھی سی جان بھی خطرے میں ڈال دو۔ میں نے یہ خبر بد بھی سنی ہے کہ اب تو تمہارے ہاں کا سارا کام وہی کرتے ہیں اور تم سب لولوؤں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے اندھیرے کے منتظر ہو۔ آسنی تن آسانی اچھی نہیں ورنہ پچھتاؤ گے۔ حتیٰ کہ تم لوگوں نے اپنی خودداری تک کو قفل لگا کے الماریوں میں رکھ دیا ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ میں یہاں سے چچا سام کے نام کوئی خط نہیں لکھ سکتا۔ ورنہ میں اُن سے اپنی حدود میں رہنے کی درخواست ضرور کرتا۔ دعا کرو کہ وہ خود ہی میرے پاس جلد سے جلد آجائیں تاکہ تمہاری جان چھوٹے۔ میں تو ان سے نپٹ ہی لوں گا۔ فراڈ کو فراڈ ہی پچھاڑ سکتا ہے۔

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جب سے یہاں آیا ہوں۔ تمہارے ہاں میرا بڑا سوگ منایا گیا۔ خدا کی قسم یہ سنتے ہی میرا دل کباب ہو گیا۔ اس لئے کہ جب تک میں وہاں رہا۔ سب نے مل جل کر مجھے اپنے ہاں سے دور کرنا چاہا۔ جب یہاں کچھ دوسروں کی اور کچھ اپنی مرضی سے آ گیا ہوں تو ریڈیو پر اس ناچیز کی گمشدگی کے اعلانات کیوں کئے جاتے ہیں۔ یہ وہی ریڈیو والے ہیں جو مجھے اپنے ہاں ناک تک صاف نہیں کرنے دیتے تھے۔ رسالے اور اخبار والے بھی میرے روپوش ہونے پر خصوصی ماتم کیوں کر رہے ہیں۔ ان کا بھی میرے ساتھ یوسف کے بھائیوں جیسا سلوک تھا۔ ان حالات میں تمہیں اپنے اس منافقانہ رویہ پر شرم آنی چاہیئے۔

یہاں میرے کچھ قدردان پیدا ہو گئے ہیں اور پچھلے دنوں انھوں نے میرے ذمہ یہ کام کیا تھا کہ میں یہاں کے بارے میں اپنی سہ ماہی رپورٹ پیش کروں۔ یہ فریضہ میرے سپرد اس لئے ہوا تھا کہ ان کے خیال کے مطابق مجھ جیسا حقیقت نگار یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے بھی اپنی عادت کے مطابق سب کچھ لکھ دیا ہے۔ اس میں اپنے ایک دوست کی خوب ڈٹ کر مخالفت بھی کی اور اس کا جو معاشقہ اندر ہی اندر چل رہا تھا۔ اس کا بھی کچا چٹھا لکھ دیا ہے۔

حتیٰ کہ میں نے رپورٹ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہاں جو داڑھی نہ منڈوانے کا دستور ہے،

وہ بعض نستعلیق قسم کی طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے۔ اس لئے اس کی اجازت ہونی چاہیئے کہ جس کا دل چاہے داڑھی رکھے جس کا دل نہ چاہے نہ رکھے۔

اتنے بڑے حاکم کے سامنے اتنا کہہ دینا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرنا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ تمہارے ہاں ایسی کوئی کھری بات کہہ دیتا تو میری زبان گدی سے نکلوا دی جاتی۔

اطلاعاً عرض ہے۔ یہاں میری کتاب "گنجے فرشتے" کافی پسند کی گئی ہے۔ ہو سکے تو میری بیوی بچوں کا خیال رکھنا۔

خاکسار
سعادت حسن منٹو
۲۰، اپریل ۱۹۵۵ء

محمد طفیل کے نام

مکرمی طفیل صاحب!

السلام علیکم۔ برادرم قتیل شفائی صاحب نے مجھے اپنا مجموعہ کلام بعنوان "بازار" اس غرض سے دیا تھا کہ میں اس کا دیباچہ لکھ دوں۔ یہ مسودہ چودھری نذیر صاحب کی دکان یعنی "نیا ادارہ" میں پڑا رہا۔ اس دوران میں، میں بیمار ہو گیا۔ صحت یاب ہونے پر جب میں نے نذیر صاحب سے مسودہ کا مطالبہ کیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ کہیں گم ہو گیا ہے۔

مجھے بے حد افسوس ہے کہ میری غفلت کے باعث قتیل صاحب کا مسودہ گم ہو گیا ہے خدا کے لئے آپ میری طرف سے اُن کی خدمت میں معذرت پیش کر دیں۔

میں چوہدری نذیر صاحب سے پھر گذارش کروں گا کہ وہ تلاش کریں۔ شاید وہ مسودہ مل جائے، بشرطیکہ انہوں نے کسی کو بغرضِ اشاعت دے نہ دیا ہو۔

خاکسار
سعادت حسن منٹو
۱۲، دسمبر ۱۹۵۲ء

"نقوش" لاہور

ممتاز شیریں کے نام

مکرمی ۔ تسلیم !

"نیا دور" کا پہلا نمبر ملا۔ بنگلور جیسے دور افتادہ شہر سے ایسا کامیاب پرچہ نکالنا بڑی ہمت کا کام ہے امید ہے آپ اسے جاری رکھیں گی۔ گو "نیا دور" اپنی قسم کی واحد چیز نہیں پھر بھی اردو ادب میں یہ ایک اضافے کا باعث ہو سکتا ہے۔ "نیا دور" کے لیے میں اپنا تازہ افسانہ یا مضمون بھیجنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اصول کے مطابق میں ایک سطر بھی معاوضے کے بغیر نہیں لکھتا۔ اگر آپ میرا حق الخدمت ادا کر سکیں تو مجھے "نیا دور" کی معاونت میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔

"نیا دور" کے لیے میرا یہ پیغام ہے کہ پرانے دور کے رندوں کا نئے دور کے شعلہ آشاموں کے ساتھ "شراب کا رشتہ" ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ہم زلف ہیں۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گی۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو ، بمبئی

(نقوش لاہور ۶۵۔۶۶

نومبر ۱۹۵۷ء)

●

ممتاز شیریں کے نام

خاتون مکرم۔ تسلیمات !

مکتوب گرامی مورخہ ۵ اگست ۴۷ء ملا۔ جواب کا شکریہ۔ مگر آپ کا مختصر افسانہ ابھی تک موصول نہیں ہوا۔ آج کل ڈاک کی ترسیل بہت ہی ناقص ہے۔ خدا کرے کہ مل جائے۔

پاکستان کے رسالوں کی واضح اور قطعی پالیسی کے متعلق آپ کا ارشاد درست ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ حکومت بھی ابھی تک کوئی واضح اور قطعی پالیسی متعین نہیں کر سکی۔ "نیا دور" میں شاہین صاحب نے جو طویل اداریہ لکھا ہے۔ میں اسے بہت غور سے پڑھوں گا۔

میں آپ سے قطعی وعدہ نہیں کرتا۔ مگر میں "نیادور" کے فسادات نمبر کے لئے کوئی افسانہ لکھنے کی مزید کوشش کروں گا۔ ادھر میں نے فساد کے موضوع پر چند افسانے لکھے ہیں۔ مگر اس وقت ذہن میں کوئی چیز موجود نہیں۔ ممکن ہے لکھنے بیٹھوں تو کچھ سوجھ جائے۔ اگر نا کام رہا تو آپ کو مطلع کر دوں گا۔

فسادات نمبر کے مضامین کی فہرست کافی مرعوب کن ہے۔

مجبوس عورتوں پر شاید اب میں اور کچھ نہ لکھ سکوں۔

شاہین صاحب کی خدمت میں آداب۔ عسکری آپ کو علیحدہ خط لکھیں گے۔

۱۲ اگست ۱۹۴۷ء

(نقوش لاہور ۶۵-۶۶ نومبر ۱۹۵۷ء)

خاکسار
سعادت حسن منٹو

ممتاز شیریں کے نام

خاتون محترم!

السلام علیکم۔ عرصہ ہوا آپ کا ایک خط ملا تھا۔ جس میں درج تھا کہ آپ فسادات نمبر بھیج رہی ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ ابھی تک مجھے نہیں ملا۔ اس لئے میں اپنی رائے لکھنے سے معذور ہوں۔

"اردو ادب" کا عتاب زدہ پہلا شمارہ اب شائع ہو چکا ہے۔ امید ہے مل گیا ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ یہاں کی پراگندہ ادبی فضا کے باعث میں اور عسکری کوئی خاص چیز پیش نہیں کر سکے۔ بہر حال جو کچھ بن پڑا ہے۔ حاضر ہے ایک افسوس اور ہے کہ "سویرا" والوں نے دو مضمون چرا کر شائع کر دیئے —— ہو سکتا ہے یہ ترقی پسندی ہو۔

"اردو ادب" کا دوسرا شمارہ زیر ترتیب ہے۔ براہ کرم فوراً ہی اپنے افسانے یا تنقیدی مضمون سے ممنون و متشکر فرمایئے۔

لاہور کی عدالت میں "ٹھنڈا گوشت" کا مقدمہ پیش ہے۔ میں نے آپ کو اور صمد شاہین صاحب کو صفائی کے گواہ کے طور پر طلب کیا ہے۔ لاہور آیئے گا تو اسی بہانے آپ دونوں سے شرف ملاقات بھی حاصل ہو جائے گا۔

اُمید ہے آپ دونوں بخیریت ہوں گے۔ صمد صاحب کی خدمت میں سلام۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

(نقوش لاہور ۶۵-۶۶

نومبر، ۱۹۵۰ء)

سلام مچھلی شہری کے نام

ایڈیٹر اردو ادب

مکتبہ جدید لاہور

سلام صاحب

سلام۔ افسوس ہے کہ اس سے پہلے آپ کو خط نہ لکھ سکا۔ میں سخت الجھنوں میں گرفتار تھا۔ میری رہائی کی خبر تو آپ نے اخباروں میں پڑھ لی ہوگی۔ "اُردو ادب" نمبر ۲ زیر ترتیب ہے۔ مہربانی فرما کر اس کے لئے کوئی طویل نظم ارسال فرمائیے۔ شکریہ

خاکسار

سعادت حسن منٹو

(ماہنامہ شاعر بمبئی دسمبر ۱۹۷۲ء

جلد ۴۴، شمارہ ۱۲)

نصیر انور کے نام

۳۱۔ لکشمی مینشن

لاہور

پیارے نصیر!

پرسوں کمرشل بلڈنگ گیا۔ شیخ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اتوار کو انہیں کھانے پر بلایا۔ اتفاق سے ڈاکٹر منیر بھی آ گئے۔ بہت دیر تک محفل جمی رہی۔ آخر میں تمہارا ذکرِ خیر آیا۔ میں اٹھا تو دیکھا کہ تمہارا خط ڈاکیہ پھینک رہا ہے۔ THINK OF THE DEVIL............

یہ کیا قصہ ہے بھئی۔ یہ آپریشن کیا باقی رہ گیا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ تم حسب عادت مذاق کر رہے ہو مگر دوبارہ خط پڑھا تو سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ ڈیرے کے پٹھان نے تمہارے جسم میں مزید جراحت کی ضرورت محسوس کی ہے اور اپنا دیسی ساخت کا پستول داغ دیا ہو۔ کہیں یہ مرد مجاہد چاند ماری کی عشق تو نہیں کر رہا تھا۔

تم نے خط لکھا مگر نہایت ہی مختصر اور وہ بھی شاعرانہ انداز میں۔ میری جان! گولی کھانا تو بے قافیہ شاعری بھی نہیں ہو سکتا۔ از راہ کرم فوراً تفصیلات سے آگاہ کرو۔ تمہارے خط سے صرف اتنا معلوم ہوا ہے اور وہ بھی کئی دو اور دو جوڑ کر چار بنانے سے کہ تم ڈیرے سے چند میل دور خدا معلوم کس مار پر سیر و تفریح فرما رہے تھے کہ کسی پٹھان نے اپنی سابقہ روایات کے تحت تم پر گولی مار دی۔ تمہاری جیبوں کا بوجھ ہلکا کیا اور چلتا بنا۔ زخمی حالت میں تم شاید بنوں پہنچے۔ وہاں وحید کے ہاں تم نے دو راتیں بسر کیں (دن کو شاید تم کہیں اور تھے) اس کے بعد تم راولپنڈی پہنچے۔ جہاں ملٹری ہسپتال میں تمہارے بازو کے زخمی حصے جدا کر دیئے گئے۔

میری جان! تمہارے جسم کا کون سا حصہ ہے جو زخمی نہیں ہے۔ بہتر تھا کہ سب کا سب کٹوا دیتے۔

ڈاکٹر منیر کو میں نے خط دکھایا اور اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ انہوں نے مجھے تسلی دی کہ خاص بات کچھ نہیں۔ سوائے اس کے کہ گولی لگی ہے۔ انشاء اللہ چند روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ دست

ڈاکٹروں کو بھول جانے کا انجام یہی ہوتا ہے۔

شمع پرویز صاحب اس حادثے کو پاکستان کی جنگی تیاریوں پر محمول کرتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ تم فوراً ہی مجھے اپنے تازہ ترین حالات سے ضرور مطلع کروگے۔

بجی تمہیں اکثر یاد کرتی ہے۔ شیام والی تصویر مل گئی تھی۔ شکریہ! اچھے ہو۔ کر تم فوراً میرے ساتھ ایک فوٹو کھنچوالو۔ مجھے تمہارا کوئی بھروسہ نہیں۔ معلوم نہیں کب توپ دم ہو جاؤ اور مجھے بغیر فوٹو کے "آفاق" میں تمہارے اوپر مضمون لکھنا پڑے۔

صفیہ اور اقبال تمہارا حال دریافت کرتی ہیں۔

تمہیں یہ سن کر افسوس ہو گا کہ شیخ سلیم کا چند روز ہوئے میو ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔

۶راگست ۱۹۵۱ء	تمہارا
"سویرا" لاہور ص ۵۲	سعادت

۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱

چند تصویر بتاں

قرۃ العین حیدر

بمبئی - ۳۱ - اکتوبر ۱۹۷۶ء

محترمی تسلیم

گرامی نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں آپ کے سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہوں کیوں کہ میری منٹو سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ان سے میری خط و کتابت رہی۔

۱۔ ادبی لحاظ سے منٹو مجھ سے تقریباً سترہ اٹھارہ برس سینئیر تھے۔

۲۔ میں انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کی کبھی ممبر نہیں تھی۔ مجھے اس انجمن سے خارج کئے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ منٹو کے متعلق مجھے علم نہیں۔

۳۔ میرے خیال میں منٹو کو نہ صرف اردو بلکہ برصغیر کے بہترین افسانہ نگاروں میں شمار کرنا چاہیئے۔

۴۔ منٹو کے متعلق مفصل معلومات آپ کو محترمہ عصمت چغتائی سے حاصل ہو سکتی ہیں جو ان کی بہت ہی قریبی دوست تھیں۔

ان کا پتہ یہ ہے۔ انڈس کورٹ۔ اے روڈ، چرچ گیٹ بمبئی۔

علاوہ ازیں منٹو پر پاکستان میں ممتاز شیریں اور حامد جلال نے بھی تحقیقی کام کیا تھا۔ ممتاز شیریں مرحومہ کی کتاب جس کا عنوان "نہ نوری نہ ناری" تھا۔ غالباً وہاں شایع ہو چکی ہے۔ آپ وہاں کسی شناسا کو خط لکھ کر معلوم کیجئے۔ راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، کرشن چندر وغیرہ تو منٹو کے دوست تھے، آپ سے آپ کی کتاب کے سلسلے میں تعاون کر سکتے ہیں۔

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ والسلام۔

خاکسار

قرۃ العین حیدر

ضیا عظیم آبادی

مکرمی۔ آداب عرض

خط ملا۔ میں ایک عرصہ سے سخت بیمار ہوں۔ فوری طور پر جملہ سوالات کے جواب نہ دے سکوں گا۔ ویسے کچھ تعمیل حکم کر رہا ہوں۔ بعد صحت ان شاء اللہ مزید خدمت کے لائق ہو سکوں گا۔

۱۔ ان کی پیدائش سمبرالہ ضلع امرتسر کی ہے۔ ان کے والد انتہائی تند مزاج تھے ....
ان کا گھرانہ کھاتا پیتا تھا لیکن وہ اپنے والد کی سخت گیر طبیعت سے گھبرا کر نکل کھڑے ہوئے تھے خاندانی جائیداد کچھ قابل ذکر نہ تھی۔ برائے نام تھی دوسروں کے قبضہ میں رہی۔ انہوں نے کبھی اُف نہ کیا (یا شائد نہ کر سکے۔ وجہ یوں کہ یتیم ہو گئے تھے اور دیگر اعزہ نے کمسن و بے بس سمجھ کر دبا دیا ہو) والدہ اُن کی بمبئی تک اُن کے ساتھ تھیں۔ وہیں اُن کا انتقال ہوا۔ تعلیم اُن کے گھرانے میں ابتدا سے رہی لیکن ادبی مذاق نہیں۔ (یہ میں منٹو کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ دہرا رہا ہوں)۔

۲۔ ان کے بھائی جو بیرسٹر تھے، ان کا پتہ مجھے نہیں معلوم دیگر اعزہ سے بھی ناواقف ہوں اور اُن کے پتہ پیش کرنے سے قاصر۔

۳۔ ان کی بیگم صفیہ معہ اپنی تین بچیوں کے لاہور میں تھیں۔ میکلوڈ روڈ پر۔ ان دنوں کہاں ہیں؛

کہہ نہیں سکتا۔!

۴۔ علیگڈھ میں ان کا قیام بہت مختصر رہا۔ یوں کہ ان کا تعلیمی سلسلہ زیادہ نہ تھا۔ یہ وہی عہد تھا جس میں سردار جعفری، مجاز وغیرہ وہاں زیر تعلیم تھے۔ ایک جگہ جعفری نے اس کا ذکر کیا بھی ہے۔

۵۔ جی ہاں باری مرحوم کی صحبت کا اثر ضرور اُن پر پڑا اور پھر علیگڈھ کے ماحول نے بھی سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ ہوسٹل کے اُس کمرے میں جہاں وہ مقیم تھے لینن کی تصویر میز پر رکھے رہتے تھے۔ ذہنی طور پر وہ ہمیشہ اشتراکیت سے متاثر رہے لیکن جب ترقی پسندوں نے رویہ بدلا تو وہ تمام تر اُن کے ہمنوا ہوسکے اس میں کچھ اُن کی آزاد طبیعت کا بھی دخل تھا اور پھر انانیت تو ان میں تھی ہی۔

۶۔ آخری عمر میں میرا ان کا ساتھ نہیں رہا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا سیاسی عقیدہ کیا تھا........

۷۔ میں نے عرض کیا کہ ترقی پسند حضرات نے اپنے دائرہ کو اتنا محدود کر لیا تھا کہ وہ آزاد منش فنکار کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور منٹو ان لوگوں میں نہیں تھے جو کسی کے اشارے پر ناچتے۔ پھر ذاتی طور پر بھی اُن کے ساتھ لوگوں کو کچھ زیادہ خلوص نہ تھا اور اُن کو ہر محاذ پر گرانے، ذلیل کرنے اور تنگ کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ فحش نگار کہہ کر تو اپنے خیال میں ہمیشہ ان کو بدنام کیا گیا۔ نقاد ان کی حیات میں بھی اور ان کے بعد بھی ان کو عظیم فنکار مانتے ہیں۔ مگر کیا کیا جائے کہ ذاتی عناد بہت سے مسائل میں انسان کو دھاندلی پر آمادہ کر دیتا ہے۔

۸۔ کہانیاں اور مضامین تو انھوں نے ہمیشہ بیچے۔ ادب و صحافت ہی تو ان کا ذریعہ معاش تھا۔ البتہ بمبئی سے لاہور پہنچنے پر اُن کی تنگ دستی بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ ضرورتاً نورجہاں سرورجہاں لکھنے لگے تھے اور جیسا دنیا کا قاعدہ ہے ویسا اُن کے ساتھ بھی برتا گیا۔ یعنی ضرورت مند سمجھ کر کم سے کم داموں پر انہیں اپنی تخلیقات فروخت کرنے پر مجبور کر دیا گیا اور ظاہر ہے کہ جو اس منزل پر پہنچ گیا ہو اس سے یاران طریقت کو فائدہ اٹھانے میں کیا پس و پیش ہو سکتا ہے۔ نام و نمائش کے دلدادہ وقتی ضرورت پوری کر کے اپنے نام سے بھی چیزیں لکھوا لیتے ہوں گے۔ اس کی تفصیل فراہم کرنا تو بہت مشکل ہے۔

۹۔ ممتاز شیریں جو کبھی بنگلور سے نیا دور نکالا کرتی تھیں، صمد شاہین کی بیگم انہوں نے ہمارا موپساں نامی ایک کتاب منٹو پر لکھنا شروع کی تھی معلوم نہیں وہ مکمل ہوئی یا نہیں۔ اِن دنوں وہ کراچی میں ہیں۔ اُن سے بذریعہ ماہنامہ افکار تعلق قائم کر کے معلوم کیجئے۔

۱۰۔ نقوش لاہور نے ضخیم منٹو نمبر نکالا تھا۔ اُسے تو شاید آپ نے ملاحظ فرمایا ہوگا۔ شاعر بمبئی کا منٹو نمبر بھی دستیاب ہو جائے تو دیکھئے اس میں میرا بھی ایک مضمون ہے 'منہ پھٹ'۔ اب رہا فی الحال کن حضرات کی طرف رجوع کرنا مفید ہوگا تو میں سمجھتا ہوں کہ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک اور پاکستان میں صہبا مدیر افکار، مدیر نقوش، کارکنان مکتبہ جدید لاہور وغیرہ وغیرہ۔

۱۱۔ منٹو نے عالمگیر کا روسی ادب نمبر مرتب کیا۔ ہفتہ وار مصور کو چار چاند لگائے اور اپنی بساط سے زیادہ کام کیا۔ وہ کاغذی سند کے اعتبار سے بہت آگے نہیں تھے لیکن مشاہدہ اور تجربہ نے ان کو بیحد بالغ کر دیا تھا۔ ان کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ انہیں ضرورتاً اپنے احباب سے رقم لینے میں تکلیف نہیں ہوتا تھا۔ بسا اوقات جان کر بعض لوگوں کا واجب الادا نہیں دیتے تھے۔ ضدی بیحد تھے۔ .... جب اُن کی جیب گرم ہوتی تھی خوب لُٹاتے تھے۔ عیاش طبع قطعی نہیں تھے بگر شراب کے شوقین تھے اور رزبان سے خوب لُطف لیتے تھے۔ ان میں ایک خاص بات یہ تھی کہ دوسروں کو چھیڑنے میں مزہ ملتا تھا۔ ہر بازی کھیل چکے تھے۔ اس لئے جملہ کھلاڑیوں کے تیور پہچانتے تھے۔ فلمستان بمبئی سے منسلک ہو کر بہت مطمئن ہو گئے تھے۔ ان کو کشمیر بہت عزیز تھا۔ کافی ذکر کرتے تھے۔

۱۲۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی زیادہ تر کہانیاں شاہکار ہیں۔ اس لئے کہ حشو و زوائد سے پاک ہیں اور جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں انتہائی مؤثر انداز میں کہہ جاتے ہیں۔ ویسے میں ہتک، ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو، اور گوپی چند پر جان چھڑکتا ہوں۔ ٹھنڈا گوشت بھی میری نظر میں عظیم افسانہ ہے۔
کوئی اور خدمت میرے لائق۔

ضیا عظیم آبادی
۱۵ جنوری سنہ ۱۹۶۸ء

لہ بابو گوپی ناتھ

کرشن چندر

محترمی ·

تسلیم !

آپ نے میرے فن اور میری ذات کے متعلق جس قابل قدر جذبے کا اظہار کیا ہے۔ اس کیلئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ آپ منٹو پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں میں آپ سے پورا تعاون کرنے کو تیار ہوں۔ سردست آپ میرا وہ کتابچہ (نئے ادب کے معیار، سیر پزدالا) مکتبہ جامعہ، بھنڈی بازار، بمبئی سے منگوا لیجئے۔ اس سے آپ کو اپنے بہت سے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔ اس کتابچہ کے مطالعے کے بعد جو سوال پھر بھی تشنہ رہتے ہیں۔ اُس کے لئے آپ مجھ سے اور دیگر ترقی پسند مصنفین سے رجوع کر سکتے ہیں۔ میں دعا گو ہوں کہ آپ اس اہم ادبی کام میں جلد سے جلد کامیاب ہوں۔

آپ کا مخلص

کرشن چندر

●

بیگم صفیہ منٹو

لاہور

۶۸-۴-۶

عزیزی برزخ صاحب !

آداب عرض۔ آپکے خط ملے کو کافی دن ہو گئے ہیں۔ لیکن جواب جلدی نہ دے سکی۔ اسکی معافی چاہتی ہوں۔ دراصل آپ نے مجھ سے اتنے زیادہ سوالات کئے ہوئے ہیں جو کہ میرے لئے

بہت مشکل ہے سب کا الگ الگ جواب دینا۔ دراصل مجھے زیادہ پڑھنے لکھنے کا شوق نہیں۔ اس لئے میرے لئے بہت مشکل ہے۔ دو چار باتوں کا جو مجھے پتہ ہے۔ شاید میں آپکو لکھ سکوں۔

مجھے پتہ ہے کہ آپ کو سعادت صاحب کے ساتھ عقیدت ہے اور آپ یہ سارا کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ مگر مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انکی لکھی ہوئی چیزوں سے مجھے آج تک کوئی فایدہ نہیں پہنچا۔ کتابیں پاکستان میں بھی سب چھپتی ہیں اور اسی طرح ہندوستان میں بھی چھپتی ہیں اور ہمیں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملتی۔ اسلئے میں اس لکھنے کو کیا سمجھوں۔ باقی صرف ہمارے لئے ایک چیز ضرور چھوڑ گئے ہیں وہ ہے نام اور عزت۔ بس اسکے لئے میں اُنکی بہت شکر گزار ہوں۔ مجھے پتہ ہے آپ میرا خط پڑھ کر نا امید ضرور ہوں گے لیکن میں مجبور ہوں، اگر مجھے انکے لکھے ہوئے سے کوئی آمدن ہوتی تو میں کہتی کہ میں بھی ضرور لکھوں۔ میرا لکھا ہوا کیا چیز ہے، انکے لکھے ہوئے کے آگے جب کہ انکی کوئی قدر نہیں تو میں کیوں لکھوں۔ مجھے بہت لوگ کہتے ہیں کہ آپ کچھ منٹو صاحب کے بارے میں لکھیں۔ لیکن میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں کچھ نہیں لکھ سکتی۔ اور یہی جو بات ہے میں تو کسی قابل بھی نہیں ہوں۔ بالکل جاہل عورت ہوں لیکن اسلئے خوش قسمت ہوں کہ ایسے ادیب کے ساتھ زندگی گزاری ہے اور اللہ کے فضل سے بہت اچھی زندگی گذری ہے ان کو میرے ساتھ میری بچیوں کے ساتھ اور بلکہ میرے سارے خاندان کے ساتھ بہت محبت تھی اور ہمارے دن بڑے اچھے گزرے ہیں۔ اُنکے ساتھ ہمیشہ ہر ایک نے ناانصافی کی ہے۔ ان کا انڈیا سے بھی آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن پارٹیشن ہونے سے چند مہینے پہلے بھی انہیں فلم استان (فلمستان) سٹوڈیو سے نوٹس مل گیا تھا۔ جس سے انکا بے انتہا دل ٹوٹتا تھا۔ بلکہ آپ یقین مانئے انہوں نے کافی دیر مجھ سے چھپائے رکھا تھا کہ مجھے نوٹس مل گیا ہے۔ کیونکہ انکو مسٹر مکرجی و مسٹر اشوک کمار وغیرہ پر بڑا ناز تھا۔ پھر وہ مجھے کیسے بتاتے کہ مجھے نوٹس مل گیا ہے۔ تب ہی سے انہوں نے اتنی شراب زیادہ کر دی جسکا نتیجہ پھر آخر میں انکی موت ہوا۔ میں پہلے آ گئی تھی اور یہ ۱۹۴۸ء میں جنوری میں آئے ہیں۔ یہ جو وہاں پیچھے بمبئی میں رہ گئے۔ اتنے عرصے میں اُنکی پینے کی کوئی حد نہیں تھی۔ پھر یہاں

آکر پھر پریشانیاں ہی پریشانیاں دیکھنی پڑیں۔ پھر آپ خود ہی سوچیئے کہ ایسی حالت میں پھر یہ یہاں کیا کام کر سکتے تھے۔ انکی صحت کافی کمزور ہو چکی ہوئی تھی۔ لیکن ایک کام کیا کہ خوب لکھا روز کا ایک افسانہ لکھا اور مرتے دم تک لکھتے ہی رہے اور مجھے کچھ پتہ نہیں۔ انکی کونسی کتاب میں کونسا افسانہ ہے لیکن سب لوگ کہتے ہیں کہ سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ بہت بہتر ہوگا کہ آپ پاکستان آکر خود انکی کتابیں خریدیں اور خود یہ سب کچھ کریں۔ میں تو اپنے میاں کی کتابیں نہیں خرید سکتی۔ کیونکہ مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ آپ میرا خط دیکھ کر بہت مایوس ہونگے لیکن میں آپکے لئے اور کیا کر سکتی ہوں۔ البتہ مجھے ایک چیز دستیاب ہو سکتی ہے۔ وہ میں آپکو اس خط کے ساتھ بھیج رہی ہوں اور وہ ہے انکا شجرہ خاندان بھیج رہی ہوں۔

اگر آپ کچھ باتیں پوچھنا چاہتے ہیں تو آغا خلش کاشمیری ہیں ہفتہ وار مصور کے ایڈیٹر ہیں وہ منٹو کے بہت دوست تھے اور عصمت چغتائی میری بڑی عزیز ترین سہیلی یا بہن کو لکھیے۔ اگر کچھ وہ بتا سکے تو انکا ایڈرس ہے۔ بلکہ خلش صاحب کو بھی عصمت کے ایڈرس پر خط ڈال لیں۔

باقی آپنے جو میرے اس مکان کا پوچھا ہوا ہے۔ وہ بھی ہمیں خریدنا پڑا تھا کیونکہ میرا اور میری بچیوں کا حصہ بڑا معمولی تھا۔ ہمارے ساتھ ہی آپا اقبال کا بھی حصہ تھا۔ اللہ کی مہربانی اور میرے بھائیوں کی مہربانی سے یہ ہم خرید سکے تھے۔ ورنہ یہ بھی نہ ملتا۔ یہاں کی سرکار ہمیں وظیفہ دے رہی ہے۔ کافی معقول وظیفہ 350 روپے اور باقی رقم میرے بھائی دیتے ہیں۔ میرا وقت اچھا کٹ رہا ہے۔ ساتھ میری والدہ بھی ہوتی ہیں۔ اللہ انکا سایہ میرے سر پر سلامت رکھے۔ اچھا اب خط بند کرتی ہوں۔ امید ہے شاید میرا خط کچھ آپکی مدرت (مدد) کر سکے۔ خدا حافظ۔ میری بچیاں آداب لکھواتی ہیں۔

آپکی بہن

صفیہ منٹو

بیگم صفیہ منٹو

لاہور

18-12-76

عزیزی برج پریمی خوش رہو۔

بعد دعا کہ بہت دن ہوئے آپکا خط ملا تھا۔ جلدی جواب نہ دینے کی میں آپسے (آپ سے) بڑی معافی چاہتی ہوں۔ دراصل خط جلدی نہ لکھنے کی وجہ میری والدہ کی طبیعت کی خرابی تھی۔ کافی بیمار رہی ہیں تو میری طبیعت پھر بڑی پریشان رہی ہے۔ شکر اللہ کا اب کچھ بہتر ہیں تو مجھے کچھ ہوش آئی ہے اور میں آپکی طرفسے (طرف سے) بہت شرمندہ ہوں اور دوسری بات بہت آنا جانا بھی رہا ہے۔ میری دو بہنیں ہیں ایک کراچی ہوتی ہے اور ایک راولپنڈی سو وہ دونوں بھی آئیں ہوئی تھیں اور میری دو بیٹیاں بھی کراچی اور پنڈی ہوتی ہیں۔ وہ بھی آئیں ہوئی تھیں۔ اس وجہ سے بھی میں جلدی خط نہ لکھ سکی۔ امید ہے آپ بڑی بہن سمجھ کر معاف کر دینگے اور میں آپکے پہلے خطوں کے بھی جواب نہ دینے کی معافی چاہتی ہوں۔ ویسے برج میں آپکو یہ بھی بتا دوں کہ میں خط لکھنے میں بھی میں اتنی ہوشیار نہیں زرہ (ذرا) محنت کر کے خط لکھنا پڑتا ہے۔ میں کوئی ادیبہ نہیں ہوں جو لکھنے کی مجھے عادت ہو۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے جو آپکو ان پر حیات اور کارنامے کے لکھنے پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ہے۔ میری طرفسے (طرف سے) اور اپنی تینوں بہنوں کی طرفسے (طرف سے) لاکھ لاکھ مبارک قبول کریں۔ اللہ آپکو زندگی میں بڑی کامیابیاں دے اور آپکے جو مقاصد ہیں خدا پورے کرے آپنے ہماری تصویر مانگی تھی سو پچھلے دنوں عصمت چغتائی آئیں ہوئی تھیں۔ انکے ہاتھ میں نے آپکو ایک تصویر بھیجی تھی۔ اپنی اور منٹو صاحب کی۔ میں آپکو عصمت کا پتہ لکھ دونگی۔ آپ اس سے منگوا لیں۔ اگر اُسنے ابھی تک نہ بھیجی ہو تو۔ باقی اب خطوں میں آپکو کیا اپنی سوانح حیات لکھوں۔ بس جو گزر گئی بڑی اچھی گزر گئی۔

باقی آپنے بچیوں کا پوچھا ہوا ہے۔ سو تینوں کی اللہ کے فضل سے شادیاں کر دی ہیں اور اللہ کے فضل سے تینوں اپنے اپنے گھروں میں بڑی خوش ہیں۔ ایک بڑی والی کراچی ہوتی ہے۔ مجلی (منجھلی) والی لاہور میں اور تیسری راولپنڈی میں اور دوسری بات انکے بڑے بھائی تین تھے۔ تینوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ ابھی ان کی بہنیں تین ہیں۔ دو بڑی سوتیلی ہیں اور ایک چھوٹی ان کی اپنی ماں میں سے۔ آپا، ناصرہ اقبال ــــ ہاں انہیں کا یہ ایک نام ہے۔ مجھے اُنکے سوتیلے پن کا کہنا پڑا ہے مگر وہ کہتے تھے کہ یہ نہیں ہونا چاہیئے۔ حامد جلال کی ماں بھی انکی بہن تھی مگر انکا انتقال ہو چکا ہوا ہے۔ میری سب سے چھوٹی بیٹی کی شادی حامد جلال کے بیٹے شاہد جلال سے ہوئی ہے۔ ہاں اللہ نذیر لدھیانوی اور رفیق غزنوی کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ سعادت صاحب کی کتابوں سے مجھے بالکل کچھ نہیں ملتا جسکا کہ مجھے بڑا دکھ ہے۔ میرا خاوند ادب کے لئے اتنا کر گئے ہیں۔ جس سے لوگ فاعدہ (فایدہ) اٹھا رہے ہیں سوائے ہمارے۔ یہ کتنا ظلم ہے۔

اچھا اب میں خط کو بند کرتی ہوں۔ پتہ نہیں میں کیا کچھ لکھ جاتی ہوں۔

آپکی دعاگو بہن

صفیہ

●

ابوسعید قریشی

کراچی

۲۵، جون ۱۹۷۴ء

مکرمی!

آپ کے خطوط مجھے مل گئے تھے۔ اُن دِنوں مصروفیات کے سبب آپ کے استفسارات کے جواب نہ دے سکا ــــ

آپ نے منٹو کے بارے میں جو سوال کئے ہیں اُن کے بارے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ منٹو سے میری ملاقات غالباً ۱۹۳۱ء کے اواخر یا ۳۲ء کے شروع میں ہوئی کالج کے پہلے یا دوسرے سال میں۔ اتنا تو مجھے معلوم ہے کہ اُس نے مسلم ہائی اسکول شریف پورہ میں ماسٹر محمد عمر صاحب سے تعلیم پائی۔ بالخصوص انگریزی پڑھی ۔......جب منٹو کے والد کا انتقال ہوا تو وہ ابھی کالج میں ہی تھا۔ اگر آپ نے میری کتاب کو غور سے پڑھا ہے تو اس میں ہمارے علی گڑھ جانے کا ذکر ہے اور یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔

یہ درست ہے کہ منٹو اپنے والد کی زندگی میں ایک بار بمبئی بھاگ گیا تھا۔ اس میں اُن کی تند مزاجی کا کتنا دخل تھا۔ اور وہ کیا واقعات تھے جن کی بنا پر ان کو بھاگنا پڑا۔ میں نے اس کے بارے میں جستجو نہیں کی۔ میں اُن کے والد سے نہیں ملا لیکن دارالاحمر کے کمرے میں اس کا ذکر میں نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے ان کی تصویر سے ہمیشہ ان کی مبہم موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔

......انجمن ترقی پسند سے اُن کا کبھی تعلق نہیں تھا۔ وہ پمفلٹ بازی کا دشمن تھا......

رہی فحش نگاری سو اُس کا تعلق بھی شاید اُسی جماعت سے تھا منٹو سے نہیں۔ بلکہ فحش نگاری کو اس کے پیش روؤں کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ مزدور کی ماں، بہن، بیوی، بیٹی اور استحصالی انقلاب کے رومانی پہلوؤں میں سے ایک خصوصیت تصور ہوتی تھی...... مذہبی عقاید منٹو کے یہ ہے کہ وہ سیدھا سادا مسلمان تھا۔ ہر چند کہ نماز روزے کا پابند نہیں تھا اور رجعت پسند روایات کے ترجمانوں کی ہنسی اڑاتا تھا۔ لیکن وہ مسلمان تھا اور میرے نزدیک مصلح ___ جس نے معاشرے کو ایک ایسی لعنت سے نجات دلانے کے لئے جہاد کیا۔ جس نے عورت کو جانوروں سے بدتر بنا کے رکھ دیا تھا اور اس کے وہ تمام حقوق چھین لئے تھے جو اسلام نے اس کو دیئے تھے۔

......رہے منٹو کے سیاسی عقاید سو اُس کا پاکستان آنا۔ اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ یہاں اس کو جو معاشرتی برائیاں نظر آئیں اس پر اُس نے بلا خوف لکھا ہے۔

ایک بات آپ کو اور بھی لکھ دوں کہ اس کے پاکستان آنے کا محرک فلم سٹار شیام تھا۔

جس نے اس سے یہ کہا یار تم پاکستان چلے جاؤ ایسا نہ ہو جنون کے دورے میں خود میں ہی نہیں مار ڈالوں"۔ مگر منٹو نے شیام کے بارے میں جو خاکہ "مرلی کی دھن" نام سے لکھا ہے وہ دوزخی کی طرح سیرت نگاری کا شاہکار ہے۔

مخلص

ابو سعید قریشی

●

اُوپندر ناتھ اشک

الہ آباد

۴-۶-۱۹۸۷ء

پیارے برج!

تمہارا ۲۱ مئی ۸۷ء کا عنایت نامہ اور "سعادت حسن منٹو — حیات اور کارنامے" تمہارا تحفہ ملا۔ ممنون ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔

میری عمر ۷۶ کی ہو گئی ہے۔ میرے ہاتھوں میں آرتھرائٹس ہے۔ آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی ہے اور مجھے ابھی پچاس برسوں سے لکھے جا رہے اپنے ناول "گرتی دیواریں" کا پانچواں اور آخری حصہ لکھنا ہے۔ دمے کا پرانا مریض ہوں۔ پچھلے پانچ برسوں میں کل پانچ سو صفحوں کا میٹر لکھ سکا ہوں اور مجھے ابھی ہزار ڈیڑھ ہزار صفحات اور لکھنے ہیں۔ یہ خط بھی میں سیدھے ٹائپسٹ (Typest) کو ڈکٹیٹ کروا رہا ہوں۔ ہاتھ سے لکھنا ہوتا اور اردو میں لکھنا ہوتا تو شاید میں تمہاری سب باتوں کا جواب نہ دے پاتا۔ امید کرتا ہوں کہ تم میری مجبوری سمجھ کر اپنے دل سے غصہ نکال دو گے۔ اور مجھے معاف کر دو گے۔

میں تمہاری کتاب میں سے کچھ صفحات پڑھ گیا ہوں۔ میں کچھ باتوں سے متفق نہیں ہوں۔

منٹو نے فسادوں پر جو کہانیاں لکھی ہیں۔ اُن میں سب سے اچھا تو "ٹوبہ ٹیک سنگھ" ہے اور پھر کھول دو اور شریفن۔ یہ تینوں فسادوں کی پوری ٹریجڈی کو پوری طرح اجاگر کر دیتی ہیں۔ "خوشیا" کے بارے میں مجھے تمہاری رائے سے اتفاق نہیں۔ لیکن یہ سب باتیں خطوں میں نہیں لکھی جا سکتیں۔ کبھی روبرو بیٹھو تو ہم لوگ تفصیل سے بات کر سکتے ہیں۔ میں منٹو کے دوستوں اور دشمنوں کی بہ نسبت اس کا کہیں بڑا مداح ہوں اور میں نے اس کی ساری اچھی کہانیاں نہ صرف پڑھی ہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ کئے گئے وعدے کے مطابق اپنے یہاں سے ہندی میں چھاپی بھی ہیں اور جتنا روپیہ اس سے وعدہ کیا تھا۔ صفیہ بھابی کو پہنچا بھی دیا تھا۔ منٹو بے مجھے دل میں چاہے پسند کرتا ہو۔ اوپر سے خاصا پریشان کرتا تھا۔ اس نے کبھی میری کسی کہانی کا ذکر نہیں کیا۔

میرے والد نے مجھے سکھایا تھا کہ اگر تمہیں اپنے دشمن کی چیز بھی اچھی لگتی ہے تو اس کی بھرپور داد دو۔ اس سے تمہیں ہی طاقت اور قوت ملے گی۔ میں اپنے باپ کے اس قول سے سو فیصدی متفق ہوں اور میں نے اپنے آپ کو اس کی تربیت دی ہے۔ کوئی اگر میری تعریف کرتا ہے تو ضروری نہیں کہ میں اس کی ردی چیز کی تعریف کروں۔ لیکن اگر کوئی مجھے گالی بھی دیتا ہے۔ اور اس کی چیزیں مجھے بہت اچھی لگتی ہے تو میں ضرور اس کی داد دیتا ہوں۔

اوپری طور سے دیکھنے پر مجھے اپنی اس عادت کا بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑا ہے۔ میں نے اپنے تمام ہم عمروں سے مقدار اور معیار میں بہتر لکھا ہے۔ دو سو کہانیاں (جن میں پندرہ بیس علاقائی ہی نہیں، آٹھ دس بدیسی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو گئیں۔) دس ناولیں (جن میں گرتی دیواریں اپنے ادھورے روپ میں ہی ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ روس، جرمنی، اور امریکہ میں اس پر تھیسس لکھے گئے) تیرہ مکمل ناٹک، پچاس یک بابی ڈرامے آٹھ ہندی کوتاؤں کے مجموعے اور مقالے ڈھیروں دوسری کتابیں ہندی اردو میں میرے کس ہم عمر نے اتنا لکھا ہے۔ لیکن نہ ہندی میں کسی نقاد نے مجھے میرا ڈیو دیا ہے نہ اردو میں۔

یوں جب میری عمر اب زیادہ نہیں رہی۔ میرے بعد دوسرے بھی لکھیں گے۔ تم بھی لکھنا۔

اور جو من آئے لکھنا۔ مجھے تو ابھی اپنے ناول کا پانچواں اور آخری حصہ اور اپنی ادبی سوانح چہرے: انیک ؔکے (جس کے چار حصے چھپ چکے ہیں اور پانچواں اگلے ورش (برس) چھپے گا) پانچ حصے اور لکھنے ہیں اور ساتھ ہی میں ہندی میں کوتایں (شاعری) بھی کرتا ہوں اور میرا نواں کویتا سنگرہ (شعری مجموعہ) تیار ہے۔

سو بھائی ان حالات میں جو ہو سکتا ہے وہ تو میں کر سکتا ہوں۔ جو نہیں ہو سکتا وہ نہیں کر سکتا۔ اسلئے تم مجھے معاف کرنا۔

محبت اور نیک خواہشات کے ساتھ　　　　　　تمہارا

اوپندر ناتھ اشک

پس نوشت

تمہاری کتاب سے معلوم ہوا کہ منٹو پاراشر براہمن تھا۔ میں نہیں جانتا اس کا گوت کیا تھا اور اس کے اجداد کس رشی سے متعلق تھے۔ میں بھی پاراشر براہمن اور بھاردواج گوتر کا ہوں۔

بارہا میں منٹو کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ جہاں تک عادتوں کا تعلق ہے منٹو میں اور مجھ میں یکساں ہیں۔ آپ منٹو کی لاکھ تعریف کیجیے، لیکن اگر اس کو آپ کی کہانی پسند نہیں تو وہ برملا کہہ دیتا تھا۔ میں بھی یہی کرتا ہوں۔ اس کے بچپن کے حالات اور میرے حالات بھی کافی ملتے ہیں۔ بہر حال ان سب کا ذکر میں نے اپنی کتاب منٹو: میرا دشمن میں بالتفصیل کیا ہے۔ منٹو خوب صورت اور نفاست پسند تھا اور مجھے اچھا لگتا تھا۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ وہ پریشان کرتا تھا اور ظاہر ہے مجھے اپنے بچاؤ میں کاروائی کرنی پڑتی تھی۔

میں نے یہ لکھا ہی ہے کہ اپنے زعم میں وہ مکرجی، اشوک اور واچا وغیرہ کو اپنا دوست سمجھتا تھا۔ جبکہ مالک لوگ مالک ہی رہتے ہیں۔ دوست نہیں ہوتے۔ صفیہ بھابی نے میری بات کی تصدیق کی ہے اور عصمت نے بھی۔

میں علی سردار جعفری کے فتوے سے متفق نہیں۔ علی سردار، کرشن کو ایشیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار

مانتا تھا اور کرشن 'من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو' کے مطابق اسے ایشیا کا سب سے بڑا شاعر کہتا تھا۔ سردار کے ہاں لفاظی ہے شاعری نہیں۔ شاعر تو وہ کہیں سے بھی اچھا نہیں اور ان ترقی پسندوں کی رائے کی کوئی قیمت نہیں جو حالات کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا ان لوگوں کو افسانے کی کوئی سمجھ بھی ہے۔

●

اوپندر ناتھ اشک

الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۱

۱۹ ر فروری ۸۸

پیارے برج!

سدا خوش، کامیاب و کامران رہو۔

تمہارا ۱۳ ر فروری ۸۸ کا خط ملا۔ میں بہت بیمار اور پریشان ہوں۔ اس کے علاوہ میرا رکا ہوا ناول شروع ہو گیا ہے۔ ۸۰ ویں میں قدم رکھ لیا ہے۔ اب نہیں لکھتا تو کیا اوپر پہنچ کر لکھوں گا۔ اسلئے عزیز میں تمہیں جواب نہیں دے سکتا۔ تم شوق سے مجھے خط لکھو لیکن میں مختصر ہی جواب دے سکتا ہوں۔

(۱) پھندنے جیسی منٹو کی کوئی دوسری کہانی میری نظر سے نہیں گزری

(۲) ABSURD تحریروں کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا مفہوم ہی سمجھ میں نہ آئے بلکہ یہ ہے کہ ان کی تکنیک لایعنی قسم کی ہو لیکن مفہوم نہایت گہرا ہو۔ مثال کے لئے ای اوٹیکو کے ناٹک CHAIRS یا LESSON یا نوبل پرائز ونر ناٹک کا ایکٹ کا مشہور ڈرامہ GOD OF WAITING FOR یا KILLENS یا J.D. SALINGIR کی کہانیاں یا اردو ہی میں انور سجاد کی پرندہ یا ماں بیٹا، انگوٹھیا (نام ہو سکتا ہے میں

بھول رہا ہوں) لیکن یہ تمام تخلیقات اپنی ادل بدل تکنیک کے باوجود گہرے معانی کی حامل ہیں۔ بلراج مینرا کی ایک بھی کہانی ایسی نہیں نہ پھندنے ہی ایسی ہے۔

میں نے EMPEROR'S NEW CLOTHES نہیں پڑھی۔ لیکن کامو کا ناٹک کیلی گلہ پڑھا ہے اور میں اسے دنیا کے پانچ بہترین ناٹکوں ہی سے مانتا ہوں۔ اس تکنیک کا تجربہ میں نے اپنی کہانی آکاش چاری میں کیا ہے۔ شب خوں کے آیندہ شمارے میں چھپے گی پڑھ لینا۔

منٹو نے اگر پاگل پن کی جھونک میں ایک کہانی "پھندنے" لکھ بھی دی ہو گی تو اس سے اسکی تمام شاندار کہانیاں کمتر نہیں ہو جائیں۔

بہر کیف مجھے جدیدیوں سے اختلاف ہے۔ آسان زبان اور سیدھی سادی تکنیک میں گہری بات کہی جائے۔ اسے میں فن کا کمال سمجھتا ہوں۔ اور اگر کہانی انسان کو خود شناسی کے راستے ایک ملی میٹر بھی آگے بڑھائے تو میں تخلیق کار کی محنت کو سپھل سمجھتا ہوں۔ تم ای اونیکو کے ڈرامے یا سیلنجر کے افسانے پڑھو تو ABSURD تخلیقات کے فن اور ان کے مقصد کو سمجھ جاؤ گے۔ اپنے یہاں کے جدیدیے محض فیشن میں لکھتے ہیں۔ انہیں اس فن کی یا اسکے مقصد کی کوئی سمجھ نہیں۔ میں نے اس ضمن میں بہت پڑھا ہے۔ لیکن مجھے سیدھی سادی تخلیق میں گہری سے گہری بات۔ کتنا زیادہ پسند ہے۔ یوں تو ABSURD تخلیق کاروں نے اس تکنیک کے ذریعے بھی گہری اور افادی باتیں کہی ہیں، جیسے ای او نیکو نے LESSON میں یا بریت نے اپنے ڈراموں میں یا کامو نے کیلی گلہ میں، لیکن عام طور پر یہ فن ART FOR ART SAKE کے تحت بھی آتا ہے۔ J. D. SALINGER کی سبھی کہانیاں اسی زمرے میں شمار کی جا سکتی ہے۔

میرے افسانوں کا مجموعہ "ٹیرس پر بیٹھی شام" چھپ گیا ہے۔ دوسری کتاب میری افسانہ نویسی کے چالیس برس بھی چھپ جائے بھجواؤنگا۔

خیر اندیش

اوپندر ناتھ اشک

پس نوشت

سلنجر کی کہانی A PERFECT DAY FOR BANANA FISH کہانی ہے لیکن بار بار پڑھنے کو من ہوتا ہے۔ پڑھ دیکھو۔ مقصد کچھ نہیں لیکن تم اسے بھول نہیں سکتے۔

●

سلام مچھلی شہری

اے/۱۷، پنڈارا روڈ

نئی دہلی۔ ۱

13-5-67

ڈیر مسٹر پریمی! پریم ہی پریم۔

مزاجِ مبارک۔۔ ؟

——— آپ کا یکم مئی کا خط میرے پہلے کوارٹر سے REDIRECT ہونے کے بعد ملا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ "سعادت حسن منٹو" پر ریسرچ کر رہے ہیں۔

منٹو سے میرے مراسم صرف شاعر اور افسانہ نگار کے ناطے رہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور بس۔ ان کی موت پر میں نے ایک مختصر سی نظم بھی لکھی تھی، جو اُن ہی دنوں کسی مشہور جریدے میں چھپی تھی۔ یاد نہیں آ رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

منٹو اور ان کے فن کے متعلق میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ بے وقوفی کی حد تک مخلص نہیں تھے۔ وہ ایک ہوش مند مے خوار تھے (اختر شیرانی، مجاز اور کسی حد تک میراجی بڑے معصوم بادہ خوار تھے)۔ ان کی زندگی میں لا اُبالی پن نہیں تھا۔ وہ لباس رہن سہن اور گھریلو زندگی میں بہت نفاست پسند تھے۔ گفتگو میں اُن کا اپنا مخصوص لہجہ ہوتا تھا۔ اپنے انداز میں وہ اپنے مخالفوں کا جواب دینا بھی خوب جانتے تھے۔ بلکہ ان باتوں کے باوجود، وہ آخری دور

میں شراب ہی سے ہارے بھی۔

نشاط کو نشہ، عورت، عیاش مرد، آئیڈیل غنڈے، دردِ مے کشی اور تخیلی بغاوت اُن کے محبوب موضوعات تھے لیکن اپنے افسانوں کے ذریعہ انہوں نے ایک ایسے ڈاکٹر کا فرض بھی ادا کیا جو مرض کو اُبھار کر اور قدرے SHOCK دینے کے بعد ہی، اپنے ڈھنگ سے زُود اثر علاج کی کوشش کرتا ہے۔ اس اعتبار سے انہوں نے ایک خاص دور میں ایک رول ضرور ادا کیا مگر میری ناچیز رائے میں صرف یہی خصوصیت اُن کو جاوداں بنا سکے گی۔

اور کیا عرض کروں۔

نیاز کیش

سلام مچھلی شہری

●

سردار دیوان سنگھ مفتون

DEHRADUN

(INDIA)

FEB. 7. 1968

مکرمی!

آپ کا خط ملا۔

مرحوم منٹو میرے مخلص اور گہرے دوست تھے اور جب وہ دہلی میں تھے تو قریب قریب ہر روز ہی وہ مرے ہاں تشریف لاتے۔ اگر وہ دوپہر کو آتے تو بیر پیتے اور رات کو آتے تو میرے ساتھ برانڈی پیتے۔ زیادہ شراب نوشی ہی اُن کو ختم کرنے کا باعث ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ میری طرح ایک پیگ سے زیادہ نہ پئیں مگر وہ کنٹرول میں نہ رہ سکتے تھے۔ آپ کے سوالات کے یہ جوابات ہیں۔

(۱) مجھے اُن کے خاندان اور بزرگوں کا کچھ علم نہیں۔

(۲) اُن کی بیوی غالباً اپنی ماں کے ہاں لاہور میں رہتی ہیں۔

(۳) منٹو مذہباً مسلمان تھے مگر میں نے اُن سے مذہب کے متعلق بھی کوئی بات نہیں سنی کیونکہ وہ ایسے ہی مسلمان تھے جیسے میں سکھ ہوں۔ خیالات کے اعتبار سے وہ نیم کمیونسٹ تھے۔

(۴) منٹو کے فن کے متعلق میری رائے ہے کہ وہ پیدائشی طور پر افسانہ نویس اور مضمون نگار تھے۔

(۵) اُن کو فحش نگار نہیں مانتا۔ وہ جذبات کی تصویر اُتارنے والوں میں سے تھے۔ اس میں برہنگی بھی شامل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ فحش نویسی کے ایک مقدمہ میں، میں اُن کی طرف سے صفائی کا گواہ بھی تھا۔

(۶) ریڈیو میں ملازمت کا سلسلہ غالباً ۱۹۲۶ء کے قریب تھا۔ جب وہ کشمیری دروازہ کی فصیل کے قریب حسن بلڈنگ میں رہتے تھے۔

(۷) میں اُن کو صحافی نہیں مانتا۔ کیونکہ اُن کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور ایک صحافی کے لئے سیاست سے دلچسپی کا ہونا ضروری ہے۔.......

میں گرمیوں میں سری نگر آؤنگا تو آپ کو اطلاع دونگا۔ میں نے آپ کا نام اور پتہ نوٹ کر لیا ہے۔

نیاز مند

دیوان سنگھ مفتون

●

مجروح سلطانپوری

بمبئی

۲۲، اکتوبر ۷۶ء

مکرمی سلام و رحمۃ

آپکا ۲۲ اکتوبر کا لکھا ہوا خط ڈڈ لیٹر آفس ہوتا ہوا کل ۲۱ اکتوبر کو ملا۔ یہ سزا ہمیں اس لئے ملی کہ خط کا پتہ اردو میں لکھا گیا تھا جو شاید تسلیم شدہ اور ملکی زبان نہیں ہے۔ زہر کسی قسم کا ہو زہر ہی کی طرح کام کرتا ہے۔ بجانے ہمارے ارباب حکومت اور ابنائے وطن یہ موٹی سی بات کب سمجھینگے۔

۱۹۴۵ء میں جب میں صرف چار سال کا شاعر تھا یا پنچواں سال شروع ہوا تھا، بمبئی آیا انہیں دنوں صرف ایک بار منٹو صاحب سے ملاقات یوں ہوئی کہ میں خود اُنکے درِ دولت پر سلام کرنے حاضر ہوا تھا۔ ملے اور کہا کچھ شعر سنائیے۔ میں نے ایک غزل سنائی۔ فرمایا غزل کی شاعری کو میں پسند نہیں کرتا۔ میں اُن سے بہت چھوٹا تھا۔ کچھ اس لئے اور کچھ اس لئے کہ کم علمی کے باعث خود اعتمادی کی کمی تھی، چپ ہو رہا ورنہ آج یہی بات اگر مجھ سے کہتے تو میں ان سے ضرور کہتا کہ "محترم آپ نے یہ کہہ کر نہ تو علم شعر و سخن اظہار کیا ہے نہ ذوق سخن ہی کا" الغرض ان سے میری ملاقات کا ذخیرہ صرف اتنا سا ہے۔

والسلام

مجروح سلطانپوری

نصیر النور

کراچی

ڈیر پریمی

نمستے، میں بڑے حادثات سے گزرا ہوں۔ اس لئے جواب دینے کی مہلت نہ ملی۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

"سویرا" کی دو جلدیں ارسال خدمت ہیں۔ جی تو چاہتا تھا کہ دیگر رسائل میں اپنی مطبوعات بھی بھیجوں لیکن موقع نہیں ملا۔ اب جو کچھ بھی ہے حاضر ہے۔

"سویرا" میں میرے مضمون سے پہلے حنیف رائے نے ایک مضمون کی صورت میں جھک ماری تھی۔ عصمت چغتائی نے اس کی خوب خبر لی تھی بلکہ اسے استرے سے مونڈ ڈالا تھا۔ عصمت کی وہ تحریر میرے پاس نہیں۔ ہو سکے تو بمبئی لکھ کر عصمت سے وہ مضمون منگوا لیں۔ ورنہ اسکی تاریخِ اشاعت معلوم کر کے کسی نہ کسی لائبریری سے حاصل کر لیں۔ وہ مضمون آپ کے لئے بڑا کار آمد ہو گا۔

ایک اور ضروری بات واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ منٹو پاگل پن کے علاج کے سلسلے میں مینٹل ہوسپٹل میں داخل نہیں ہوا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ لاہور میں الکوہل (شراب) چھڑانے کا علاج مینٹل ہوسپٹل میں ہوتا ہے۔ سو وہ شراب چھوڑنے کے لئے وہاں داخل ہوا تھا۔

میری زیرِ طبع کتاب "موجِ سراب" قریب قریب مکمل ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی پبلشر کو دوں اگرچہ اس کا اشتہار "نیا ادارہ" نے چھاپ دیا تھا۔ اب اگر زندگی نے وفا کی اور مالی حالت اس قابل ہوئی تو یہ کتابیں میں خود شایع کروں گا۔

آپ پیارے لوگ جنت میں رہتے ہیں اور میں اپنے وطن سے دور دوزخ میں پڑا ہوا ہوں۔ خدا کرے کہ ہم سب کبھی ایک ہی خوشگوار فضا میں اطمینان و سکون کا سانس لیں۔ کشمیر کے ہر ذرے کو میرا سلام کہیں۔

آپ کا

نصیر انور

19.9.76ء

احمد ندیم قاسمی

۲۸ ستمبر ۱۹۸۹ء

محترمی پریمی صاحب

نادم ہوں کہ خط لکھنے میں تاخیر ہوگئی۔ آپ کو مطلع کرنا تھا کہ آپ کا مقالہ ''سعادت حسن منٹو اور روسی ادب'' فنون کے آئندہ شمارے میں شامل ہے۔ یہ شمارہ اکتوبر کے آخر تک آجائے گا۔ ایک پرچہ نذر کروں گا ان شاء اللہ۔ ویسے آپ کی کتاب سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے اگر آپ نے بھجوائی ہے تو مجھ تک نہیں پہنچ سکی۔ کہیں راستے ہی میں غتربود ہوگئی ہے اور مجھے یہ کتاب پڑھنے کا بے حد اشتیاق ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بندوبست کیا جائے۔ منٹو بڑا تخلیق کار تو تھا ہی مگر وہ میرا دوست تھا۔ نہ ہم ''ہمنوالہ'' تھے نہ ''ہمپیالہ''۔ مگر یہ قرب بڑا ہی سرشار کن تھا۔ میرے نام منٹو کے خطوط تو آپ نے دیکھے ہوں گے۔ وہ تو میں نے کتابی صورت میں چھاپ دیئے تھے۔

.... ۱۹۴۸ء کے بعد منٹو مجھے کیسے لکھتے جبکہ وہ بھی لاہور آچکے تھے اور میں بھی پشاور سے لاہور آچکا تھا۔ البتہ جب میں ۱۹۴۸ء میں پشاور ریڈیو سے منسلک تھا تو منٹو میرے ہاں دو راتیں مہمان ٹھہرے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے شام کو وہسکی کی خواہش کی۔ میں نے بندوبست کردیا۔ اُن دنوں اچھی وہسکی پچیس ساٹھ روپے فی بوتل آجاتی تھی اور منٹو جب تک زندہ رہے یہی رٹ لگائے رکھی کہ یار احمد ندیم قاسمی (وہ مجھے پورے نام سے پکارتے تھے) یہ تمہارے ساٹھ روپے دینے ہیں۔ تم ہماری طرح پینے میں حصہ دار ہوتے تو اور بات تھی۔ لیکن یہ تم پر خواہ مخواہ کا بوجھ پڑ گیا۔ میں ضرور ادا کروں گا یہ روپے اور میں بار بار کہتا کہ منٹو صاحب کیوں کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہیں۔ مگر وہ یہ کہنے سے باز نہ آتے۔ یہ الگ بات کہ ان کے پاس تو آخری دنوں میں پانچ دس روپے تک نہ ہوتے تھے ساٹھ کہاں سے لاتے اور میں کیوں لیتا!

آپ کا

احمد ندیم قاسمی

عبدالقادر سروری

مسٹر برج کشن ایمہ

کل ۳۰ رمئی کو شعبہ اردو میں مسز سردیلف روسی سفارت خانے کے متعمد دوم کی بیوی ۲ بجے آرہی ہیں۔ انھوں نے سعادت حسن منٹو پر کام کیا ہے۔ آپ ضرور آئیے۔ ان سے ملیئے۔ چھٹی لینا پڑے تو آدھے دن کی چھٹی لے لیجیے۔ وہ پرسوں شائید جارہی ہیں۔ ایسا موقع نہیں ملے گا۔

عبدالقادر سروری
۲۹-۳-۶۸ء

●

عبدالقادر سروری

مکرمی!

آپ کا تار واثق کی کامیابی کے بارے میں رات میں ملا۔ کرم فرمائی کا شکریہ۔ نکہت کا نتیجہ کیوں شائع نہیں ہوا، پتہ نہیں۔ بہر حال میں ۶ مارچ کو یہاں سرینگر کے لئے انشاءاللہ روانہ ہوں گا۔ ۹ کو جموں پہنچوں گا۔ ۹، اور ۱۰ کو جموں میں قیام کروں گا۔ ۱۱ کی صبح بس سے سرینگر روانہ ہوں گا۔ نکہت کی ٹانگ میں فراکچر ہو گیا ہے۔ وہ دو مہینے سے بستر پر پڑی ہے۔

میرا خط آپ کو ملا ہوگا۔ آپ کا کام خدا کرے اطمینان بخش چل رہا ہو۔ جب کبھی کتب خانہ جانے کا اتفاق ہوتا ہے تلاش کرتا ہوں۔ منٹو کی ایک کتاب مجھے یہاں ملی جو کتب خانہ آصفیہ میں ہے اس کا عنوان 'جنازے' ہے اور یہ منٹو کے ڈرامائی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں یہ مضامین ہیں:- چنگیز کی موت، تیمور کی موت، قلاپطرہ کی موت، نپولین کی موت، بابر کی موت، شاہجہان کی موت ٹیپو کی موت، راسپوٹیس کی موت۔

'ہمایوں' شمارہ جنوری ۱۹۳۸ء میں ان کا ایک افسانہ 'نیا قانون' ملا۔ مجھے یہاں ایک کلرک نے بتایا کہ 'نگار' اور دوسرے رسالوں میں کئی مضامین منٹو کے بارے میں ہیں۔ میں نے ان سے طے کیا ہے کہ اگر آپ کو ضرورت ہو تو ایک فہرست ان مضامین کی منگوالیں گے۔ ....

آصفیہ میں مزید کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے:۔
تلخ ترش اور شیریں'۔ خالی بوتلیں (افسانے)'۔ زہر ہلاہل (کہانیوں ڈراموں اور مضامین کا مجموعہ)'۔ سرکنڈوں کے پیچھے (افسانے)'۔ بیس غیر مطبوعہ کہانیاں'۔ عصمت چغتائی (سوانح گنجے فرشتے'۔ نورجہاں سرورجہاں' یزید'۔ پھانسی (ترجمہ وکٹر ہیوگو)'۔ ویرا (ترجمہ آسکر وائیلڈ)، سب بخیریت ہیں۔ آپ کی خیر و عافیت کا متمنی۔

مخلص

عبدالقادر سروری

علاؤالدین مظہر

مکتبہ جدید

پرنٹرز، پبلشرز، بک سیلرز۔

محترم برج پریمی جی۔ آداب و تسلیمات!

آپ کا ملفوف ملا۔ آپ نے منٹو مرحوم کے ساتھ جس عقیدت کا اظہار فرمایا ہے لائق تحسین ہے۔ خدا آپ کے ارادوں میں برکت دے۔ 'اردو ادب' کو شائع ہوئے عرصہ دراز گزر چکا ہے۔ صرف دو شمارے منظر عام پر آسکے۔ بعد ازاں بند کر دینا پڑا۔ بقول آپ کے منٹو پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے گو تشنگی باقی ہے لیکن آپ سے میری گذارش ہے کہ 'نقوش' کا منٹو نمبر اور کراچی سے 'نقش' بھی نکالا گیا تھا۔ اگرچہ دونوں آپ دیکھ چکے ہوں گے پھر بھی ابو سعید قریشی کی کتاب 'منٹو' اور ممتاز شیریں نے اپنے تنقیدی مضامین 'معیار' میں 'منٹو کا تغیر اور ارتقا' اور دوسرا 'منٹو کی فنی تکمیل' کے عنوان سے لکھے تھے۔ یہ دونوں کتابیں بھی آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ ان سے کافی مدد مل سکتی ہے۔ ہو سکے تو 'نقوش' کے مدیر صاحب سے براہ راست رجوع فرمائیں۔ ان سے بھی کافی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں اور جن حضرات کے پتے طلب فرمائے ہیں۔ اُن سے دریافت ہو سکتے ہیں۔

ایک مضمون محترمہ عصمت نے اور کرشن چندر نے بھی لکھا ہے۔ یہ بھی مطالعہ کے لئے ضروری ہے۔ یہ مرحوم کے قریبی دوست اور آشنا ہیں۔ پھر آپ کو ان پر لکھنے کے لئے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔

اُمید ہے آپ میری گذارش پر ضرور توجہ فرمائیں گے۔ آداب!

آپ کا خادم
علاؤ الدین مظہر

●

امریک آنند
پگڈنڈی امرتسر

۲۴/۲

جناب من!

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ شکریہ!

۱۔ منٹو کی بیوی کا پتہ معلوم نہیں ہے۔

۲۔ مکان وغیرہ وہاں بالکل نہیں ہے بلکہ وہ گلی بھی صاف کر دی گئی ہے۔ .... وہاں بالکل رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا ہے! اس میں کوئی شک نہیں کہ منٹو بہت بڑا فن کار تھا۔

.... پگڈنڈی کا ایک شمارہ ڈاک میں علیحدہ بھیج دیا گیا ہے۔

مخلص
امریک آنند

●

منٹو اور کرشن چندر

اُردو کے مختصر افسانے کی جو جیوت منشی پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے ہاتھوں جلی تھی۔ وہ سلطان حیدر جوش، نیاز فتحپوری، سدرشن، مجنوں گورکھپوری، علی عباس حسینی وغیرہ کے ذریعے سے "انگارے گروپ" کے فنکاروں تک پہنچی۔ افسانے میں وطنیت کا جذبہ بیدار ہوا۔ رومان کے تانے بانے سے بنی ہوئی پراسرار اور طلسمی فضا آہستہ آہستہ کم ہونے لگی اور ایسی محبت کی عکاسی کی جانے لگی جہاں سماج ایک منفی رول ادا کرتا ہے اور محبت کرنیوالے دلوں میں ایک دیوار تعمیر کرتا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں نے یورپی افسانہ نگاری کے دوش بدوش چلنے کی کوشش کی۔ یورپی افسانوں کے ترجمے ہوئے اور اردو کے مختصر افسانے میں موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے ایک تنوع پیدا ہوا۔ کرداری نگاری، منظر نگاری، پلاٹ کی ساخت، انسانی زندگی کے نفسیاتی پہلو سب ایک بچے تلے انداز میں منظر عام پر آنے لگے۔ حتیٰ کہ اپنے عصری رجحانات سے متاثر ہوتا ہوا مختصر اردو افسانہ مشرق اور مغرب کے حسین تصورات اور ذہنی شعور کے امتزاج کے ساتھ آگے بڑھا اور ۱۹۳۰ء اور اس کے آس پاس اردو نثری ادب کا سب سے زیادہ مقبول شعبہ بن کر ابھر آیا۔

مختصر اردو افسانے کا دوسرا دور ۱۹۳۰ء کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں یورپ پر ایک بحرانی کیفیت طاری تھی۔ اکثر ممالک دوسری جنگ عظیم کے لئے پر تولنے لگے تھے۔ ہندوستان میں بھی آزادی حاصل کرنے کے لئے روحیں بے قرار تھیں۔ گاندھی جی کی قیادت مسلم ہو چکی تھی اور انہوں نے سامراج سے عوام کے حقوق منوانے کے لئے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی تھی اور سارے ملک میں آگ لگ گئی تھی۔ مختصر اردو افسانہ ان سے دامن نہ بچا سکا۔ تخیل پرستی کو چھوڑ کر افسانہ ہماری سماجی، سیاسی اور نفسیاتی زندگی کا ترجمان بن گیا اور اس کا سب سے اولین روپ "انگارے" میں سامنے آیا۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا لیکن اس کے بعض افسانے ۱۹۳۰ء میں ہی "ہمایوں" اور دوسرے رسالوں میں چھپ چکے تھے۔ "انگارے" نے منشی پریم چند اور یلدرم کی جلائی ہوئی قندیل میں اپنا خونِ جگر ڈال دیا اور ایک نیا ادبی رجحان پیش کیا۔ گھسے پٹے موضوعات سے تعمیر کی ہوئی مختصر افسانے کی عمارت پر نیا رنگ چڑھا دیا۔ ہیئت میں نئے تجربے ہوئے اور مواد کے لئے عام لوگوں کی زندگی کو ٹٹولا گیا۔ انداز تحریر سرفروشانہ تھا اور سماج پر پہلی بار تیکھے طنز نظر آنے لگے۔ ڈاکٹر رشید جہاں، سجاد ظہیر احمد علی، محمود الظفر ــــــ انگارے گروپ کے ادیب تھے۔ ان میں سے بعض نوجوان انگریزی ادب سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے نئے اور باغیانہ رجحانات کو اپنے ادب میں داخل کیا اور یہی رجحانات بعد میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد بن گئے۔ ان لوگوں کے موضوعات جنس، مذہب، سماج وغیرہ کے مختلف پہلو تھے۔

بیسویں صدی کے اسی دہے کے آخر میں چند نئے چہرے نظر آنے لگے۔ ان میں سے خاص طور پر سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ بالکل نئے تھے۔ ان کے پاس نئی باتیں تھیں۔ بات کرنے کا نیا انداز تھا۔ حتیٰ کہ ۱۹۵۵ء تک یہ لوگ اردو افسانے کی تکون کہلائے جانے لگے اور جب اس تکون کے پہلے زاویے سعادت حسن منٹو کا انتقال ہوا تو اس تکون کی تثلیث بکھر گئی۔ ان لوگوں کے افسانوں نے اس زمانے میں ایک دھوم مچا دی اور ان کی تقلید میں افسانے لکھے جانے لگے لیکن کوئی ان کی ہمسری نہ کر سکا۔

بیدی نے کرشن اور منٹو کے مقابلے میں بہت کم لکھا لیکن ان کی فنی عظمت برقرار رہی۔ اس پورے دور میں جو جولانی کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو کے قلم نے دکھائی' اس کی تاب کوئی نہ لاسکا اور افسانہ نگاروں کی پوری نسل ان سے متاثر ہوئی۔ کرشن چندر لفظوں کے ایسے جادوگر نکلے کہ جن کے سحر نے ان کے دوستوں اور دشمنوں کو بھی دم بخود کر دیا۔ منٹو کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ ان کے پاس کہانی کہنے کا گُر تھا جو قاری کو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور جب تک کہانی ختم نہیں ہوتی کہانی کا سحر نہیں ٹوٹتا اور کہانی ختم ہونے پر بھی اس کا خمار باقی رہتا ہے۔

بیدی کے مقابلے میں منٹو اور کرشن چندر میں کافی مماثلت نظر آتی ہے۔ دونوں بلا کے زود نویس تھے۔ ایک ہی نشست میں کہانی لکھنا دونوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ دونوں کا اسٹائل منفرد ہے۔ اس لحاظ سے ان کو صاحب طرز کہا جائے تو بے جا نہیں۔ دونوں نے نثر کے مختلف شعبوں میں قلم چلایا دونوں نے افسانے' ڈرامے' مضامین' خاکے' انشایئے' فلمی کہانیاں اور مکالمے لکھے۔ ہاں کرشن چندر نے ایک قدم آگے بڑھ کر ناول نگاری کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوایا لیکن منٹو ایسا نہ کر سکے۔ کرشن چندر نے لگ بھگ دو درجن ناول لکھے۔ منٹو زندگی میں صرف ڈیڑھ ناول لکھ سکے۔ کرشن چندر نے ۴۱-۱۹۴۰ء کے آس پاس جب اپنا پہلا ناول "شکست" شایع کیا تو منٹو کا دل بھی للچایا تھا لیکن وہ چونکہ طبیعتاً عجلت پسند تھے اور ناول کا فن زیادہ فرصت کا متقاضی ہے لہذا منٹو ہزار کوششوں کے بعد بھی "بغیر عنوان کے" اور "تکلیف" کے آدھے مسودے کے بعد کوئی بھرپور اور جامع ناول نہ لکھ سکے۔ یہ دونوں ناول بھی پھیکے' بے جان اور غیر دلچسپ ثابت ہوئے اور منٹو کو زندگی میں اس بات کا افسوس رہا' کرشن چندر کے مقابلے میں منٹو کی یہ سب سے بڑی کوتاہی تھی۔ منٹو صرف ۴۲ سال کی عمر میں چل بسے۔ کون جانے وہ اس ناکامی کی تلافی کر سکتے۔ کرشن چندر نے "شکست" سے لیکر "دوسری برف باری تک" درجنوں ناول لکھے اور اپنی سحر طراز نثر اور موضوعات کی رنگارنگی سے نئے نئے پھول کھلاتے رہے۔

منٹو اور کرشن چندر تقریباً ہم عمر تھے۔ منٹو ان سے صرف دو سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔ دونوں پنجاب میں پیدا ہوئے تھے اور اپنے ادبی سفر کا آغاز یہیں سے کیا تھا۔ دونوں جذباتی طور پر کشمیر سے

وابستگی رکھتے تھے۔ منٹو کشمیری الاصل تھے۔ لہذا کشمیر ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ کرشن چندر تھے تو پنجابی لیکن زندگی کا سب سے قیمتی وقت پونچھ کی وادیوں میں گزار چکے تھے۔ اس لئے کشمیر ان کا وطن ثانی تھا۔ یہی جذباتی وابستگی تھی جس کی وجہ سے دونوں فنکاروں نے کشمیر سے متعلق مضامین اور افسانے لکھے۔ لیکن چونکہ کرشن چندر نے اپنے بچپن اور جوانی کا خاصا حصہ پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموش ملکوتی فضا میں گذارا تھا اسلیئے ان کی اکثر کہانیوں اور افسانوں میں یہی سناٹے، حسن و رنگ کی یہی قوس و قزح جھرنوں اور نالوں کا یہی ساز پس منظر کے طور پر ملتا ہے۔ منٹو صرف بٹوت تک چلے آئے تھے اور یہاں دو تین ماہ تک چیڑھ کی زندگی بخش ہواؤں سے اپنے پھیپھڑوں کے مرض کا علاج کرتے رہے۔ انہوں نے کشمیر کو کھل کر نہیں دیکھا۔ ان کے یہاں صرف بٹوت کا حسن ہے لہذا اگر ایک طرف کرشن چندر کے یہاں کشمیر کی کہانیاں "زندگی کے موڑ پر" "شکست" اور "طوفان کی کلیاں" ہیں۔ تو دوسری طرف منٹو کے یہاں "مصری کی ڈلی"، "لالٹین" "ایک خط" "بیگو" "ٹیٹوال کا کتا" اور "آخری سیلوٹ" جیسی کہانیاں ہیں۔

اپنی طالب علمی کے دوران کرشن چندر اور منٹو دونوں سرخ انقلاب کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ منٹو نے اس رعایت سے اپنے کمرے کا نام "دار الاحمر" رکھا تھا جہاں وہ اپنے ہم خیال دوستوں کے ساتھ سرخ انقلاب کے سپنے بنا کرتے تھے۔ اس کمرے میں سب سے بڑی قابل توجہ چیز سردار بھگت سنگھ کی بڑی تصویر تھی جسے منٹو پرستش کی حد تک چاہتے تھے۔ اسی زمانے میں خود کو انقلابی کہلوانا پسند کرتے تھے۔ وکٹر ہیوگو کی کتاب کا ترجمہ "اسیر سرگزشت" اور آسکر وائلڈ کے ناول "ویرا" کا ترجمہ کر چکے تھے۔ "ویرا" روس کے دہشت پسندوں سے متعلق تھا۔ امرتسر کی پولیس چوکنا ہو گئی اور منٹو کو ان کے ساتھیوں سمیت گرفتار کرنے پر تل گئی لیکن پھر ایک رشتہ دار کی مداخلت سے یہ بلا ٹل گئی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت کرشن چندر پر بھی گزری۔ وہ ابھی ایف۔ اے کے ہی طالب علم تھے کہ بھگت سنگھ کی تحریک سے متاثر ہوئے حتیٰ کہ کالج سے بھاگ کر بھگت سنگھ کے گروپ میں شامل ہوئے اور پولیس نے انہیں گرفتار کر کے لاہور کے قلعے میں نظر بند کر دیا جہاں وہ دو ماہ رہے۔ کرشن چندر تعلیم سے فارغ ہو کر انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔

مضامین لکھتے رہے اور ایم این رائے کے گروپ میں شامل ہو کر اپنے سینے میں ہندوستان کو آزاد کرانے کی تمنا پالتے رہے۔ لیکن بعد میں روس کی اشتراکی تحریک سے متاثر ہو کر اسی فلسفے کو اپنا جزو ایمان بنا لیا۔ منٹو بھی بھگت سنگھ کے اثرات سے آگے بڑھ کر اپنے دوست اور رہنما اور اشتراکی ادیب باری (علیگ) کے توسط سے اشتراکیت کی طرف جھک گئے۔ مفکر، کامریڈ، سعادت حسن منٹو اور وٹنم کے فرضی ناموں سے اشتراکی خیالات کی ترویج کرتے رہے۔ رسالوں کے روسی ادب نمبر مرتب کئے، گورکی، طالسطائی، چیخوف، چریکوف، وغیرہ کے مضامین اور افسانے اردو میں منتقل کئے۔ غالباً وہ اردو کے پہلے ادیب ہیں جنہوں نے روسی افسانوں کو اردو کا جامہ پہنایا۔ روسی خیالات سے متاثر ہو کر افسانوں کا پہلا مجموعہ "آتش پارے" شایع کیا۔ ان کا پہلا افسانہ **تماشہ** بھی ان کے انقلابی ذہن کی عکاسی کرتا ہے جس میں انہوں نے ۱۹۱۹ء کے مارشل لاء کے ہنگامے کو اپنا موضوع بنا لیا ہے۔

منٹو کی یہ ساری تخلیقات ان کی اٹھان کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ کرشن چندر کے پیشرو تھے۔ کرشن چندر نے سب سے پہلا افسانہ "یرقان" ۱۹۳۶ء میں لکھا۔ اس وقت تک منٹو کے چار مجموعے شایع ہو چکے تھے۔ "ایک اسیر کی سرگزشت" (۱۹۳۳ء) "ویرا" (۱۹۳۴ء) روسی افسانے (۱۹۳۴ء) اور "آتش پارے" (۱۹۳۴ء) فرق صرف اتنا ہے کہ منٹو ترجموں کے راستے افسانوں کی دنیا میں آگئے اور کرشن چندر براہ راست۔

سعادت حسن منٹو کو طبع زاد افسانوں کی حدود میں داخل ہونے کے لئے مقابلتاً زیادہ سفر طے کرنا پڑا لیکن کرشن چندر آتے ہی اپنا سکہ جمانے میں کامیاب ہوئے۔ اسکی سب سے بڑی وجہ ابتداء میں موضوعات کے تنوع سے زیادہ ان کی رومانیت اور دل کی تہوں میں اترنے والی ان کی شاعرانہ نثر تھی۔ حتیٰ کہ منٹو جیسا ازلی خودسر اور خوددار فنکار بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور ان کا استقبال کیا۔ اپنے دوست احمد ندیم قاسمی کو فروری ۳۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:۔

"کرشن چندر صاحب خوب لکھتے ہیں۔ "ہمایوں" "ادبی دنیا" وغیرہ میں ان کے افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔"

اور کرشن چندر نے چند برس میں جب اپنی جگہ بنائی تو منٹو ان کے مداح بن گئے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوی مجموعے "بگولے" (۱۹۴۱ء) کا دیباچہ جب کرشن چندر نے لکھا تو منٹو نے اس کی تعریف یوں کی:۔

"کرشن نے جو آپکے افسانوں کے مجموعے کا دیباچہ لکھا ہے، میں نے پڑھا ہے، مختصر ہے لیکن بہت اچھا ہے۔ کرشن اب دیباچہ نگاری میں بھی کافی مہارت حاصل کر گیا ہے۔"

کرشن چندر بھی، حالانکہ ان کا اسلوب اور ان کے موضوعات منٹو سے مختلف تھے، منٹو سے بہت مرعوب ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں انہوں نے منٹو کے افسانے "شوشو" کو انگریزی میں منتقل کیا اور کافی عرصہ تک اسکی چرچا ہوتی رہی۔ اس زمانے میں منٹو کے چند اور افسانے "مصور" میں شایع ہوئے۔ "خوشیا" "دیوالی کے دیئے" وغیرہ۔ کرشن چندر نے نہ صرف ان کی تعریف کی بلکہ منٹو کو توصیفی خطوط بھی لکھے۔ اس کا ذکر کرشن چندر نے یوں کیا ہے:۔

"منٹو سے ملنے سے پہلے میں نے منٹو کے افسانے پڑھے تھے۔ یہ افسانے اتنے ٹیڑھے، اتنے نکیلے اور اتنے عجیب و غریب انداز میں لکھے گئے تھے کہ قائل ہونا پڑا۔ .... اور میں نے منٹو کو ان کے بارے میں توصیفی خطوط لکھے۔"

کرشن چندر نے "نئے زاویے" مرتب کی اور منٹو سے شرکت کے لئے کہا تو منٹو نے اپنی کہانی "ہتک" بھیج دی۔ کرشن چندر کے مطابق یہ اردو کی بہترین کہانی ہے۔ کرشن چندر لکھتے ہیں:۔

"ہتک کی ہیروئن کی ٹکر کا کردار مجھے کہیں نظر نہیں آتا۔ ایک ایک کر کے منٹو نے موجودہ سماجی نظام کے اندر بسنے والی طوائف کی زندگی کے چھلکے اتار کر الگ کر دیئے ہیں۔ اسی طرح سے کہ اس افسانے میں نہ صرف طوائف کا جسم بلکہ اس کی روح بھی ننگی نظر آتی ہے۔"

"ہتک پڑھ کر طوائفیت سے نفرت نہیں ہوتی۔ سوگندھی اور اس کی زندگی پر رحم نہیں آتا لیکن سوگندھی کی معصومیت اور اس کے عورت پنے پر اور اسلیئے زندگی اور اس کی چاہت اور اس کی تخلیق پر اعتقاد پیدا ہو جاتا ہے اور یہی سچے اور لا فانی ادب کا جوہر عظیم ہے۔"

منٹو اور کرشن چندر پہلی بار ۱۹۴۱ء میں ملے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب منٹو "مصور" سے علیحدہ ہو کر آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کے لئے دہلی آئے تھے اور کرشن چندر اس سے پہلے ہی ریڈیو میں تھے۔ اس وقت منٹو کی دھاک جم چکی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اور دوسرے لمحے منٹو "کرشن چندر ایم۔ اے" اور کرشن "منٹو منٹو" کہتے ہوئے ایک دوسرے کی باہنوں میں تھے۔ پورے پندرہ سال کے بعد جب موت نے منٹو کا قلم چھین لیا تو کرشن چندر نے محسوس کیا جیسے وہ خود مر چکے ہوں۔ منٹو سے زندگی بھر بے انصافی ہوتی رہی۔ کرشن چندر نے اپنے آنسوؤں سے اس بے انصافی کیخلاف آواز بلند کی۔ اپنے مضمون "خالی بوتل بھرا ہوا دل" میں لکھتے ہیں:۔

"منٹو ایک بہت بُری گالی تھا۔ اس کا کوئی دوست ایسا نہیں جسے اس نے گالی نہ دی ہو......... بظاہر وہ ترقی پسندوں سے خوش نہ تھا نہ غیر ترقی پسندوں سے، نہ پاکستان سے اور نہ ہندوستان سے نہ انکل سام سے نہ روس سے۔ جانے اس کی مضطرب بیقرار، بے چین روح کیا چاہتی تھی۔ اس کی زبان بے حد تلخ تھی۔ انداز بیان نکیلا، خاردار اور نشتر کی طرح تیز اور بے رحم۔ لیکن آپ اس کی گالی کو، اسکی تلخ کلامی کو، اس کے تیز نکیلے خاردار الفاظ کو ذرا کھرچ کر دیکھیئے تو اندر سے زندگی کا میٹھا میٹھا رس ٹپکنے لگے گا۔ اس کی نفرت میں محبت تھی، عریانی میں ستر پوشی......... زندگی نے منٹو سے انصاف نہیں کیا لیکن تاریخ ضرور اس سے انصاف کریگی۔ آج

جب وہ ہم میں نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے موت کی شہتیر کو اپنے
شانے پر محسوس کیا ہے۔ آج ہم میں سے ہر ایک کی زندگی کا ایک حصہ
مر گیا جو کبھی واپس نہ آسکے گا۔"

دہلی میں کرشن چندر اور منٹو کا ڈیڑھ سال تک ساتھ رہا۔ یہاں دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔ یہ دوستی نہ صرف ان کو ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے ساز گار ثابت ہوئی بلکہ ادبی لحاظ سے بھی اس کی کافی اہمیت ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی تقلید میں بے شمار افسانے اور ریڈیائی ڈرامے لکھے۔ منٹو نے اسی زمانے میں "جرنلسٹ" "جیب کترا" "نیلی رگیں" جیسے مشہور ڈرامے لکھے اور کرشن چندر کا شہرہ آفاق ڈرامہ "سرائے کے باہر" انہی دنوں تخلیق ہوا یہ ڈرامہ بعد میں فلمایا بھی گیا۔ ان ڈراموں کی بڑی تاریخی حیثیت بھی ہے۔ کیونکہ پہلی بار ریڈیائی ڈرامے تخلیق ہوئے اور اردو ادب میں ماڈرن ڈراموں کی نہ صرف طرح پڑی بلکہ انہیں فروغ بھی حاصل ہوا۔ اسی زمانے میں منٹو اور کرشن چندر نے مل کر "بنجارہ" نام کی ایک فلمی کہانی بھی لکھی جو دو فنکاروں کی مشترکہ کوششوں کا ایک نیا تجربہ تھا۔ ڈیڑھ سال کے بعد منٹو ریڈیو کی نوکری سے مستعفی ہو کر واپس بمبئی چلے آئے اور نہ صرف "مصور" کی ادارت از سر نو سنبھالی بلکہ فلمی دنیا میں بھی اپنے قدم جمائے۔ کرشن چندر نے تھوڑے عرصے کے بعد ریڈیو کی ملازمت کو خیر باد کہا اور پروڈیوسر ڈبلیو۔ زیڈ احمد کی دعوت پر پونا چلے آئے جہاں پہلے ہی جوش ملیح آبادی اور ساغر نظامی ملازم تھے۔ لیکن منٹو نے قیام ہندوستان کے دوران جیسی کامیابی فلمی دنیا میں حاصل کی وہ کرشن چندر کو حاصل نہ ہو سکی۔ آخر وہ بھی بمبئی چلے آئے۔

منٹو اور کرشن چندر دونوں کی زندگی میں بہت سی باتیں مماثل نظر آتی ہیں لیکن دونوں کے راستے جدا ہیں۔ منٹو نے جیسا کہ پہلے ہی ذکر ہوا۔ ابتدا میں انقلابی اور اشتراکی نظریات کو اپنا جزو ایمان بنا لیا تھا اور اپنے قلم سے ان نظریات کی ترویج کرنے میں بڑا کام کیا لیکن بعد میں وہ اس تحریک سے دور ہوتے گئے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں جیسا کہ بعض ناقدین نے ظاہر کیا ہے کہ وہ رجعت پسند تھے۔ انہوں نے بقول کرشن چندر زندگی کے مشاہدے میں اپنے آپ کو ایک مومی شمع کی طرح پگھلا دیا اور زندگی کے زہر کو

گھول کر پی لیا اور پھر اس کے ذائقے کو اس کے رنگ کو کھول کھول کر بیان کیا۔ منٹو نے انسانی سماج میں رِستے ہوئے ناسوروں پر نشتر رکھ دیئے ہیں۔ وہ مسخ شدہ کرداروں کے سب سے بڑے ترجمان ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ معروضی طور پر ان کے موضوعات محدود تھے لیکن جس طرح انہوں نے ان موضوعات کو کمال فنکاری سے برتا ہے اردو کے سارے افسانوی ادب میں شاید ہی کوئی ان کی ہمسری کر سکے۔ منٹو نے واقعہ نگاری کے بجائے آدمی کی فطرت کو اپنی تخلیق کا محور بنا لیا اور یہی افسانے ساتویں دہائی سے ایک نئے انداز سے سامنے آنے لگے۔ منٹو کفایت الفاظ کے فنکار ہیں۔ وہ الفاظ اور تشبیہات کی بیسا کھیاں تلاش نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے اسلوب کے ذریعے موضوع کو اس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے ضمیر کی جڑیں ہل اٹھتی ہیں۔

اس کے برعکس کرشن چندر کے پاس موضوعات کا تنوع ہے۔ انہوں نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر واقع ہوئے بیشتر مظالم کیخلاف جہاد کیا۔ ان کے یہاں امن، اشتراکیت، تہذیب اور کلچر کی بقا، بہتر زندگی کے لئے جدوجہد، انسان دوستی، زندگی کے روشن پہلو، حسن اور نور کا ہالہ ملتا ہے، کوریا کی جنگ ہو یا چین کی جارحیت، امریکہ کی روزن برگ ہو یا شیڈرک کی موت، کالو بھنگی کی تلاش ہو یا بنگال کا قحط، اجنتا کی غاروں کا طلسم ہو یا تلنگانہ کی طبقاتی جنگ، بمبئی کی ایکٹریس ہو یا زرگاؤں کی رانی ہو کرشن چندر کا قلم برابر چلتا رہا ہے بے تکان ظلم کی دھجیاں اڑاتا ہوا اور آنے والی صبح کا نور اور رنگ کا چھڑکاؤ کرتا ہوا پلکوں میں نئے سپنے جگاتا ہوا۔ کرشن چندر نے مختصر افسانے بھی لکھے ہیں اور طویل مختصر افسانے بھی — تجریدی کہانیاں بھی اور علامتی افسانے بھی، ناول بھی اور رپورتاژ بھی — ان کے فن میں موضوعات اور تجربات کا ایک ایسا رنگ محل ملتا ہے جو کسی اور فنکار کے یہاں شاذ ہی نظر آتا ہے۔

کرشن چندر کے یہاں دوسری خصوصیت ان کا طرزِ تحریر ہے۔ یہاں وہ منٹو سے بالکل مختلف اور متضاد ہیں۔ سردار جعفری نے ان کی رومانی حقیقت نگاری کو سیلابِ حسن کا نام دیا ہے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ الفاظ کا اسراف افسانے میں ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور آجکل اسے عیب سمجھا

جاتا ہے لیکن کرشن چندر الفاظ کے ایسے جادوگر ہیں جسکے سحر سے ساری تحریر حریری پردوں میں لپٹی ہوئی ایک نورانی قندیل بن جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کرشن چندر کا شاعرانہ انداز بیان بعض اوقات الھر تا ہے اور افسانے کو افسانہ نہیں رہنے دیتا لیکن کرشن چندر کے فن میں الفاظ کی اس قوس قزح سے جو تصویریں بنتی ہیں وہ افسانے میں اثر آفرینی پیدا کرتی ہیں۔ دل کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور مواد اور موضوع کو پیوست کر کے ایک بنا دیتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے ۱۹۴۱ء کے آس پاس کرشن چندر کو ایک خط میں اردو افسانے کا شہنشاہ کہا تھا اور منٹو کو افسانے کا بادشاہ ۔ میں یہ کہونگا کہ دونوں اپنی اپنی مملکت کے شہنشاہ تھے۔ کرشن چندر اور منٹو ایسے فنکار تھے جن کا فن لٹی ہوئی انسانیت کا ترجمان ہے۔ انہوں نے اپنے کارناموں سے ہندوستان کے مختلف طبقوں کی جو ترجمانی کی اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اور اردو فکشن کا کوئی بھی طالب علم ان کے فن کو آنکھوں سے لگائے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔

منٹو اور شاعرِ کشمیر مہجور

مہجور کشمیری زبان کے عہد ساز شاعر ہیں۔ انہوں نے کشمیری شاعری کی غنائیہ روایات کو ایک نئی جہت دیکر نئی منزلوں سے آشنا کیا۔ مہجور کی ابتدائی شاعری میں موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے روایت کی چھاپ ہے۔ لیکن وہ بہت جلد اس دور کی شاعری کی ان دیکھی دنیاؤں سے زینہ بہ زینہ اس دنیا میں اترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور ان کے یہاں ان کے گرد و پیش کی دنیا مچلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ 'پرچھائیوں' کا تعاقب کرنے کے بجائے 'انسانوں' کی دنیا میں خاک چھانتے ہوئے نظر آتے ہیں، روایت کے حدود میں رہکر بھی ایک نئے شعری مزاج کا تجربہ کرتے ہیں اور اپنے عہد کے تقاضوں کو شعر کی زبان دیکر ایک مجتہدانہ رول ادا کرتے ہیں۔ مہجور گل اور بلبل کے عشق اور حسن میں انسانی زندگی کی تب و تاب کا فسوں جگاتے ہیں اور اپنی قوم کی نسل در نسل غلامی، ان کے احساس کمتری، ان کی ناداری اور افلاس اور جاگیردارانہ نظام کے داؤ پر چڑھی ہوئی ان کی آرزومندیوں کو انہی استعاروں میں ڈھال کر اپنے تنفس کے شعلوں سے سلگا دیتے ہیں۔ ایک تند، واضح اور نوکیلی آواز کشمیر کے در و دیوار میں لہراتی ہے اور جاگیرشاہی نظام کے ایوانوں کو ہلا دیتی ہے۔ مہجور کی یہ آواز اس تحریک

کو قوت اور حرارت بخشتی ہے جو صدیوں کی غلامی کے خلاف کشمیر میں بلند ہوئی تھی ——— لیکن مہجور نعرہ باز نہیں تھے۔ ان کی آواز میں آگ ہے لیکن وہ فن کے حُسن اور اس کی خوشبو کا سودا نہیں کرتے۔ وہ مثالیت اور رمزیت کے حُسن سے اپنے اشعار میں نئی معنویت پیدا کرتے ہیں۔ وہ غم اور غصے کو شعور اور فن کی خراد پر چڑھا کر کھری بات کہنے کے قایل ہیں۔ یہ مہجور کا شاعرانہ اعجاز تھا کہ وہ عوام کے دِل کی دھڑکنوں کی آواز بن گئے اور انہیں اپنی حیات میں ہی بقائے دوام حاصل ہوا۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہے کے آس پاس مہجور کی دو نظمیں "پوشے متہ جانانو" (اے میرے پھولوں کے شہزادے) اور گریسی کور (دہقان دوشیزہ) انگریزی ترجمے کے توسط سے مہاکوی ٹیگور تک پہنچیں۔ ان نظموں کے سحر نے مہاکوی کو موہ لیا۔ لفظوں میں چھپے ہوئے قوس قزح کے رنگ، جنگلی ہرنوں کی مست خرامی، نیلی جھیلوں کے گہرے سائے اور برہ کی آگ میں جھلسی ہوئی برہن کی پتھروں کو پگھلا دینے والی لے ——— اور پھر انسان کی ازل تا اَبد محبت کی فطری خواہش ——— مہاکوی کو دُور پہاڑوں کی پنہایوں میں چھپے ہوئے ایک غیر معروف شاعر کی آواز کے رس میں قدرت کی مہانتا، روح کی آسودگی اور ازلی حُسن کے تقدس کا احساس ہوا تھا، جس کا وہ خود عاشق تھا۔ اسی احساس نے اُسے مہجور کو "کشمیر کا ورڈس ورتھ" کہلوایا ——— مہاکوی ٹیگور کے اس تاثر میں مہجور کی پہلی شناخت کا احساس ہوتا ہے ——— اس کے بعد آہستہ آہستہ مہجور کے جینیس کا احساس کشمیر کے پڑھے لکھے لوگوں کے دِلوں میں جاگ اٹھا۔ یہ مہجور کی کشمیری شاعری کا نئے سِر آغاز تھا! برسوں بیت گئے۔ مہجور کی شاعری جغرافیائی حصاروں کو توڑ کر پورے برصغیر کو اپنی خوشبو سے معطر کرنے لگی۔ ان گیتوں میں نئے کشمیر کے ان خوابوں کی تفسیر تھی جنہیں مہجور نے احساس اور شعور کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ ایک نئی آواز تھی جس میں کتنی ہی نا آسودگیوں کی تپش تھی۔ کتنے ہی زخموں کی ٹیسیں تھیں اور غم اور ملال اور غصے کی آنچ تھی۔ اس نظام کے خلاف جس نے کشمیریوں کے ارمانوں کو خاکستر کیا تھا اور انہیں نسل در نسل غلامی کا طوق پہنایا تھا۔ حتیٰ کہ پاکستان میں رہنے والا ایک نامور معتوب افسانہ نگار، جسے شاعری کے شعبے سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس آواز کی حدت سے پگھل گیا۔ یہ حسن

شخص ایک اور کشمیری تھا ـــــ سعادت حسن منٹو! جسے شاعر کشمیر مہجور کو ساری عمر نہ دیکھنے کی محرومی نے اظہار ملال پر مجبور کیا تھا۔

"کشمیر میں نے نہیں دیکھا ہے لیکن کشمیری دیکھے ہیں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ میں نے مہجور کو نہیں دیکھا ہے........"

منٹو کی سب سے بڑی کمزوری کشمیر تھا۔ اسے زندگی بھر یہ احساس تڑپاتا رہا کہ اس نے کبھی کھلی آنکھ سے اپنا آبائی وطن کشمیر نہیں دیکھا تھا۔ وہ صرف ایک بار بٹوت تک ہو آیا تھا۔ جب اسے دق کا مریض قرار دے کر علی گڑھ یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا۔ کشمیر سے اس کی دلچسپی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ کشمیری الانسل تھا۔ کوئی پانچ پشت پہلے ان کے جد امجد خواجہ رحمت اللہ سکھوں کی عملداری میں اپنے دوسرے بہت سے اہل وطن کی طرح کشمیر سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ ان کے پوتے خواجہ جمال الدین کچھ عرصہ کے بعد امرتسر چلے آئے تھے۔ اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ لیکن وہ منٹو ذات کو بھول نہیں سکے جو ان کے کشمیری پن پر دال تھا۔ منٹو ـــــ ڈیڑھ سیر کا بٹہ[1] ـــــ اس لئے کشمیر کے تعلق سے جب بھی کوئی بات ہوتی تو منٹو کہتے تھے ـــــ

"میں کشمیری ہوں ـــــ ایک ہاتو"

"میں بھی کشمیری ہوں، مجھے کشمیریوں سے بہت محبت ہے"

"میں کشمیری ہوں، بہت عرصہ ہوا ہمارے آباواجداد
کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آئے"

یہی سبب ہے کہ کشمیر کا ذکر آتے ہی منٹو جذباتی ہو جاتے تھے۔ اس سرزمین کے ساتھ یہی تعلق انہیں "بیگو" "ایک خط" "مصری کی ڈلی" "لالٹین" جیسی کہانیوں کے بعد "ٹیٹوال کا کتا" اور "آخری سیلوٹ" جیسی کہانیاں لکھواتا ہے۔

ذکر ہو چکا ہے کہ منٹو کے بزرگ سکھ عہد میں سکھوں کے مظالم سے تنگ آکر ترک وطن پر آمادہ ہوئے تھے۔ منٹو اس واقعے کو بھول نہیں سکے تھے۔ اس کے تحت الشعور میں یہ بات محفوظ تھی کہ

[1] کشمیری میں منٹ ڈیڑھ سیر وزن کے باٹ کو کہتے ہیں اس لئے ڈیڑھ سیر کا باٹ بھی منٹ کہلاتا تھا۔

مہجور نے ایسا نہیں کیا تھا بلکہ ظلم و ستم کو برداشت کیا تھا اور اس کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ مہجور کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے منٹو رقم طراز ہیں:-

"مجھے ندامت ہے کہ میرے آبا و اجداد نے ہجرت کی، جور و ستم سہنا بڑی بات ہے۔ لیکن ہجرت بہت بڑا مزا ہے۔ مہجور نے ظلم و ستم سہے۔ اس نے سب سے بڑی اذیت جو ذہنی خصوصیت ہے، برداشت کی مگر وہ ڈٹا رہا۔ ہجرت کا خیال تک بھی اس کے دماغ میں نہ آیا۔ وہ وہیں رہا جہاں کا وہ تھا....."

(شاعر کشمیر ۔ مہجور کاشمیری)

تقسیم، منٹو کے لئے ایک بہت بڑا المیہ تھا۔ انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کی مصنوعی تقسیم کو دل سے کبھی قبول نہیں کیا۔ ان کا ایمان تھا کہ مذہب اور سیاست کے نام پر کھینچی ہوئی کوئی لکیر دلوں کا بٹوارہ نہیں کر سکتی۔ لکھتے ہیں:-

"اب اس خطہ زمین کو نئے نام نے کیا بنا دیا تھا۔ اس کا مجھے علم نہیں تھا۔ اپنی حکومت کیا ہوتی ہے۔ اس کی تصویر بھی کوشش کے باوجود میرے ذہن میں نہیں آتی تھی" (گنجے فرشتے)

اس لئے جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تعلقات کشیدہ ہوئے۔ تو منٹو بے چین ہو اٹھے اس دور کی بعض کہانیوں میں منٹو نے اپنا غم انڈیل دیا ہے۔ ان کے پس پشت ایک انسان دوست افسانہ نگار کا درد اور ملال ملتا ہے —

"سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان"

(گنجے فرشتے)

اس لئے جب تقسیم ملک کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیاں تناؤ بڑھتا ہی گیا تو منٹو اپنے جذبات پر پہرہ نہ بٹھا سکے، وہ شاعر کشمیر مہجور کو یاد کرنے لگے۔ انہیں یقین تھا کہ مہجور کے نغمے

زخموں پر پھاہا رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے نغموں کا رس نفرت اور کدورت کے زہر پر تریاق رکھ دیتا ــــــ لکھتے ہیں:-

"کاش مہجور زندہ ہوتا!

اگر وہ زندہ ہوتا تو میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر گراہم کی ضرورت پیش نہ آتی وہ اپنے قلندرانہ انداز میں جواہر لال نہرو اور خواجہ ناظم الدین کو (یہ بھی کشمیری ہیں) سمجھا دیتا کہ دیکھو انسان کا خون پانی سے ارزاں نہیں ہے۔ کشمیری خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو ہو ہر حالت میں کشمیری ہے۔

تم جواہر لال ہو ــــــ یہ ناظم الدین ہے۔ دونوں کشمیری ہو۔ حالانکہ تم کشمیر کے باشندے نہیں ہو لیکن تمہاری روح کشمیری ہے۔ تم گوگجہ اور بھتہ (شلغم اور چاول) کو ایسے دسترخوان سے کبھی نکال نہیں سکتے۔ پھر تم کیوں لڑتے ہو۔ شلغم اور بھات کی قسم کھاؤ ــــــ کیا تم ایک دوسرے کے گریباں میں ہاتھ ڈال سکتے ہو۔

(شاعر کشمیر ــــ مہجور کاشمیری)

یہ مضمون منٹو نے ۱۹ نومبر ۱۹۵۲ء کو لکھا تھا۔

مہجور اور منٹو میں بظاہر کوئی مماثلت نہیں۔ ان میں مماثلت کی تلاش دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔ لیکن اس بات میں کوئی باک نہیں کہ دونوں کے یہاں آزادئ وطن کی آرزو ہے دونوں کے یہاں جبر اور ظلم کے خلاف بغاوت کی آگ ہے۔ دونوں کے یہاں انسان دوستی اور فرقہ وارانہ اخوت اور بھائی چارے کا پیغام ہے۔ دونوں مذہب کے نام پہ ہوئے مظالم کی قلعی کھول دیتے ہیں اور سب سے بڑھ کر دونوں کا وطن کشمیر ہے

آزادی کے بعد مہجور کا لہجہ کچھ ناقدانہ ہو جاتا ہے۔ وہ "آزادی" "لالولالو ہا گل لالہ" "پوشہ نولو" وغیرہ نظموں میں طنز آمیز لہجہ اختیار کرتا ہے اور منٹو پاکستان جاکر آنکھیں ملتے ہوئے رہ جاتا ہے اور "چچا سام کے نام خطوط" کی سبزریں اپنی تمام بصارت کے ساتھ اپنے غم اور ملال کا اظہار کرتا ہے۔ اس کا لہجہ بے حد زہرناک ہو جاتا ہے اور اپنے شعور کی تمام بالیدگیوں کے ساتھ اُس نظام پر وار کرتا ہے۔ جو مغربی سامراج کی کٹھ پتلی بن چکا ہے۔

منٹو کے یہاں رومان نہیں ملتا۔ زندگی کے تلخ حقایق ملتے ہیں۔ لیکن مہجور کے کلام میں جو "رومانیت" انہیں نظر آئی تھی اس سے محظوظ ہوئے تھے۔ اس لئے کہ مہجور کے ہجر میں انہیں وصل کا حظ ملاتھا۔ اپنے اسی مضمون میں لکھتے ہیں :۔

"ہجر ہماری رومانوی شاعری کا ایک اہم جزو ہے۔ معلوم نہیں یہ کیا بلا ہے۔ کیونکہ اس سے مجھے آج تک واسطہ نہیں پڑا۔ لیکن مہجور کے کلام کا ترجمہ پڑھنے کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا ہجر ہی اس کا وصال تھا ——"

منٹو نے مہجور مکمل طور سے مطالعہ نہیں کیا تھا۔ ان کا مطالعہ ناقص ترجموں کے توسط سے نامکمل مطالعہ تھا۔ اگر انہیں مہجور کی حقیقی (GENUINE) شاعری کا راست یا اچھے ترجموں کے ذریعے مطالعہ ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ اختصار پسند سعادت حسن منٹو اپنے مخصوص اور منفرد اسلوب میں اپنے مخصوص استعاروں کی تمام صباحتیں اور تمام دوشیزگیاں نچھاور کرتا ۔●

منٹو اور ہندوستانی فلم — ایک تفصیلی مطالعہ

منٹو بچپن سے ہی ہنگامہ پسند تھے۔ کبھی کبھی ایسی حرکتیں کرتے تھے کہ لوگ انگشت بدنداں رہ جاتے۔ انہی حرکتوں کے باعث وہ بچپن کے ساتھیوں میں "ٹامی" کہلاتے تھے۔ بچپن سے ہی بمبئی ان کے خوابوں کا مرکز تھا۔ لاہور میں تشفی نہ پا کر ان کی بڑی خواہش تھی کہ وہ بمبئی جاکر فلمی دنیا میں کسی نہ کسی طرح گھس جائیں۔ یہ تمنا دیوانگی کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ اس خواہش کی تکمیل کے لئے ایک بار وہ بچپن میں گھر سے بھاگ کر بمبئی چلے بھی گئے تھے۔ لیکن یہ فرار ان کی تکمیلِ آرزو نہ بن سکا۔ احمد ندیم قاسمی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> "فلمی دنیا میں قدم رکھنے کی خواہش کالج کے ہر طالب علم کے دل میں ہوتی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے یہی جنون میرے سر پر بھی سوار تھا۔ چنانچہ میں نے اس جنون کو ٹھنڈا کرنے کے لئے بہت سے جتن کئے اور انجام کار تھک ہار کر بیٹھ گیا"

(منٹو کے خطوط ص ۱۶۱)

اسٹیج اور اداکاری سے دلچسپی کے باعث منٹو نے دوستوں کی اعانت کے ساتھ ایک ڈرامیٹک کلب کھولا۔ خیال یہ تھا کہ آغا حشر کے ایک ڈرامے کو اسٹیج کریں لیکن کلب شروع ہوئے ابھی چند دن ہی ہوئے تھے کہ ان کے سخت گیر والد نے دھاوا بول دیا اور ان کے سب ہارمونیم، طبلے اور دوسرا ساز و سامان توڑ پھوڑ دیا اور ان کی یہ تمنا بھی تشنہ رہ گئی۔ یہ دراصل اظہار کی تمنا تھی جو راہ پانا چاہ رہی تھی۔

دیوانگی کی حد تک بڑھا ہوا منٹو کا یہ شوق انہیں لاہور کی صحافتی زندگی سے علیحدہ کر کے ان کے شہر نگاراں بمبئی لے گیا۔ یہ ۱۹۳۶ء کے اواخر کی بات ہے۔ بمبئی پہنچتے ہی وہ اُس زمانہ کے مشہور فلمی رسالہ ہفت روزہ مصور کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ اس پرچے کے صفحات کے توسط سے منٹو نے اپنی بیباک تحریروں سے فلمی صحافت کا ایک نیا باب لکھا اور اپنے نئے منصب کی دھاک بٹھا دی۔ ہفت روزہ "مصور" بمبئی کی فلمی صنعت کے لئے مشعل راہ ثابت ہوا۔ مصور، منٹو کی فلمی زندگی کا پہلا پتھر تھا۔ یہ اسی رسالے کے طفیل تھا کہ وہ مشہور صحافی اور فلم نقاد بابوراؤ پٹیل سے متعارف ہوئے۔ ان کے توسط سے انہیں سب سے پہلے "پربھات فلم کمپنی" میں رسائی حاصل ہوئی۔ اس ادارے میں اولاً انہوں نے ایک فلمی کہانی کے خلاصے کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اس کامیابی نے ان کے لئے آگے بڑھنے کے دروازے کھول دیئے اور وہ اس دور کی مشہور فلم کمپنی "امپیریل" میں منشی کی حیثیت سے بھرتی ہوئے اور ان کو مکالمہ نویسی کا کام تفویض ہوا۔ امپیریل فلم کمپنی میں سعادت حسن منٹو کو اپنی خداداد صلاحیتیں ظاہر کرنے کا موقعہ ملا جس نے ان کے لئے ترقی کی راہیں استوار کریں۔ گو منٹو نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا تھا لیکن ابھی ان کی کمپنی اس معمولی منشی کے نام سے اپنی فلم کی کہانی کو مشتہر کرنے کے لئے تیار نہیں تھی یہی سبب ہے کہ ان کی اولین فلمی کہانی ایک نامور مصنف کے نام سے مشتہر ہوئی۔ لیکن اب یہ صورتِ حال منٹو جیسے خود سر کے لئے ایک چیلنج تھا۔ اس لئے ان کے دوست اور لاہور کے مشہور صحافی مظفر حسین شمیم سامنے آئے اور امپیریل فلم کمپنی کے مالک خان بہادر اردشیر ایرانی سے ان کی سفارش کی۔ اس کا ذکر وہ اپنے مضمون "منٹو مر گیا، منٹو زندہ باد" میں یوں کرتے ہیں:

میں نے صرف فلم سازی میں منٹو کی اہمیت پر چند جملے اسے

(اردشیر ایرانی) سے کہے۔ میری یہ گفتگو سن کر اردشیر کہنے لگے کہ منشی منٹو اچھا ڈائیلاگ لکھتا ہے۔ لیکن انڈسٹری میں یہ نیا آدمی ہے۔ ہم اسٹوری پر اس کا نام کیسے دے سکتے ہیں۔ یہ بزنس (BUSINESS) کا معاملہ ہے۔ ہم مجبور ہیں۔ میں نے کہا اس میں مجبوری کی کوئی بات نہیں۔ کل جو نئے تھے وہ آج پرانے ہو چکے ہیں اور جو آج نئے ہیں وہ کل پرانے ہو جائیں گے۔ دنیا کا کارخانہ یونہی چلتا ہے۔ تم منٹو کا اسٹوری بناؤ سکسس ہوگا۔"

یہ منٹو کی کامیاب فلمی زندگی کا پہلا پڑاؤ تھا۔ اس کے بعد وہ بمبئی کی فلمی زندگی کے ساتھ تقریباً گیارہ برس وابستہ رہے۔[1] اس دور میں انہوں نے کئی فلم کمپنیوں کے ساتھ مختلف حیثیتوں میں کام کیا۔ ان میں خاص طور پر امپیریل فلم کمپنی، فلم سٹی، سروج مووی ٹون، ہندوستان سنے ٹون، بمبئی ٹاکیز اور فلمستان قابل ذکر ہیں۔ یہاں انہوں نے بے شمار فلمی کہانیاں، منظر نامے، مکالمے وغیرہ لکھے حتیٰ کہ اپنی ایک فلم آٹھ دن میں ایک پاگل فوجی فلایٹ لفٹننٹ کرپا رام کا رول بھی کیا۔ منٹو کی اہم فلمیں کسان کنیا، مجھے پاپی کہو، کیچڑ (MUD) چل چل رے نوجوان، نوکر، بیگم، شکاری، آٹھ دن، گھمنڈ، مرزا غالب وغیرہ ہیں (یہاں ہم پاکستان میں بنی فلموں سے بحث نہیں کریں گے) ہندوستان میں ان کی آخری فلم مرزا غالب تھی، جو ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد ہدایت کار سہراب مودی نے فلمائی۔ ان کامیاب فلموں کے علاوہ جو فلمی کہانیاں منٹو نے اس دوران لکھیں ان میں تو بڑا کہ میں بڑا، اسٹیل، بنجارہ، پڑوسن، دھرم پتنی (ترجمہ) قابل ذکر ہیں۔

فلم کی دنیا میں منٹو نے بہت سے پاپڑ بیلے۔ خداداد صلاحیت کے مالک تھے ہی۔ اپنے مشاہدے اور مطالعے سے انہوں نے فلم کی تکنیک کے سلسلے میں کئی دلچسپ تجربے کئے۔ ان کی زبردست خواہش تھی کہ فلم کا وسیلہ جاہل لوگوں کے ہاتھ میں نہ رہے اور اس میں با صلاحیت لوگ شامل ہوں اس لئے انہوں نے ہمیشہ کوشش کی کہ پڑھے لکھے اور باصلاحیت لوگ سامنے آجائیں۔

---

[1] تفصیل کے لئے راقم الحروف کا مضمون منٹو اور نگار خانے ملاحظہ ہو۔

ان کی اس خواہش کا اظہار ان کے خطوط میں برابر ملتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کو لکھتے ہیں :۔

(۱) آپ اپنی اسٹوری جلد از جلد مکمل کر کے بھیجئے۔ ان دنوں امپیریل فلم کمپنی میں ایک دو اسٹوریوں کی ضرورت ہے۔ حال ہی میں میں نے شانتی نکیتن کے پروفیسر ضیاء الدین کی اسٹوری امپیریل میں منظور کرائی ہے۔ اس سے امپیریل ہندوستان میں پہلا رنگین فلم بنائے گی۔ جلدی کیجئے تاکہ وقت گزر نہ جائے۔

(منٹو کے خطوط ص ۴۳)

(۲) ایک فلم کمپنی کے ساتھ سودا طے ہو گیا ہے۔ کل سے میں اس کے مکالمے لکھنے میں مصروف ہو جاؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے گیت آپ لکھیں۔

(منٹو کے خطوط ص ۶۸)

(۳) کرشن چندر صاحب سے کہئے کہ وہ فلم کے لئے کوئی -OUT STANDING چیز لکھیں۔

(منٹو کے خطوط ص ۱۱۴)

(۴) کیا راجندر سنگھ بیدی کوئی فلمی افسانہ نہیں لکھ سکتے؟ دیہاتی افسانوں کی آج کل بہت ضرورت ہے۔

(منٹو کے خطوط ص ۱۱۳)

ذکر ہو چکا ہے کہ منٹو فلم کی دنیا کے ارباب اختیار سے ذہنی مناسبت نہیں رکھتے تھے۔ اس دنیا میں چند روز کے تجربے سے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ اندھیر نگری ہے۔ اس کا اظہار انہوں نے اس زمانے میں کیا جب وہ ابھی براہ راست فلم کمپنیوں میں کسی بڑے منصب پر نہیں تھے۔ بے باکی اور بے رحمی سے حقایق کو بے نقاب کرنا منٹو کی جبلی سرشت تھی۔ اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے :۔

"دنیا وہ نہیں جو ہم اور آپ سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہے ہیں۔ اگر آپ کو کبھی اسٹڈیو کے سیاسیات مطالعہ کرنے کا موقع ملے تو آپ چکرا جائیں۔ فلم کمپنیوں میں ان لوگوں کا زیادہ اثر ہے جن کے خیالات بوڑھے اور پست یا افتادہ ہیں۔ جو جاہل مطلق ہیں اور وہ لوگ جو اپنے سینوں میں فن صحیحہ کی پرورش کرتے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول الذکر فلم کے عواقب اور عواطف سے آشنا ہیں اور آخر الذکر کی نگاہوں سے یہ چیزیں پوشیدہ ہیں اور پوشیدہ رکھی جاتی ہیں کیوں؟ ــــــ اس لئے کہ وہ ان بوڑھوں کی جگہ پر قابض نہ ہو جائیں"

(منٹو کے خطوط ص ۱۴۱)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منٹو فلم انڈسٹری کے ارباب اختیار کے خلوص کو سمجھ گئے تھے جو فن کے تئیں ان کے یہاں پایا جاتا تھا۔ ان کو معلوم ہوا تھا کہ یہ صرف دولت پیدا کرنے والا اللہ دین کا چراغ بنی ہے اور فن نام کی کسی چیز کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ غور کریں کہ آج پچاس سال گزرنے کے بعد بھی ہندوستان کی فلم انڈسٹری کی یہی افسوسناک صورت حال ہے۔ یہ منٹو کا اعجاز تھا کہ وہ اپنی کم سنی اور ناتجربہ کاری کے باوصف کس طرح فلمی دنیا کے جگمگاتے ہوئے ایوانوں میں داخل ہوتے اور وہاں کے اندرون کو سمجھ لیا۔ لیکن وہ ایک خاموش تماشائی نہیں رہ سکتے تھے کہ یہ منٹو کے مزاج کے منافی تھا اس لئے کہ وہ جس مٹی کے بنے ہوئے تھے اس کے ہر ذرے میں بغاوت لکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے مستقبل کو خطرے میں ڈال کر انہوں نے اس گلیمر کی دنیا کے ہر انداز کو بے نقاب کیا۔

منٹو فلمی دنیا میں داخل ہو کر صرف اپنی تقدیر سنوارنے میں مصروف نہیں رہے۔ بلکہ انہوں نے ایک نظر پیدا کرلی۔ وہ بار بار اپنے احباب کو فلمی دنیا کے تمام داؤ پیچ سمجھاتے رہے۔ انہوں نے دوسرے لوگوں کی طرح اس معاملے کو پیشہ ورانہ راز (TRADE SECRET) نہیں سمجھا۔ بلکہ اسے صلائے عام بنادیا۔ وہ اپنے احباب کو مشورہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فلم کی تکنیک کے بارے میں باریک رموز سمجھاتے

ہیں۔ اس سے ان کے مشاہدے اور مطالعے کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے خطوط سے یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں جن میں ایک ماہرانہ آہنگ ہے ایک سلجھے ہوئے نقاد کی جراحی بھی ملتی ہے:۔

(۱) آپ کی اسٹوری میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ فلمی نہیں۔ وہ فلمی کس طرح نہیں؟ اس سوال کے جواب کے لئے کئی صفحات درکار ہیں۔ .... فلمی افسانہ نگاری کو سمجھنے کے لئے اسٹوڈیو بہترین استاد ہے۔ آپ پردے پر فلموں کو بغور دیکھ کر کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر بھی سینما ہال میں چند ضروری نکتوں پر روشنی ڈالنے والا موجود ہونا چاہیئے۔

(ص ۲۵)

(۲) مارگریو کی کتاب کا ضرور مطالعہ کیجئے اور اگر ہو سکے تو روسی ڈائریکٹر "پدوکن" کی کتاب فلم تکنیک پڑھ ڈالیئے۔ آپ کو اس میں TEMPO کے متعلق بہت مفید باتیں معلوم ہوں گی۔

(ص ۳۰)

(۳) اسٹوری لکھتے وقت یہ امر ضرور پیش نظر رکھیئے گا کہ جو کچھ آپ کہنا چاہیں وہ آپ اپنے کریکٹروں کے ذریعے سے ESTABLISH کراتے چلے جائیں مثلاً آپ لکھتے ہیں فضل بڑا ظالم تھا۔ تو یہ چیز اسکرین پر دکھانے کے لئے ایک INCIDENT کی ضرورت ہے۔ فقط ڈائیلاگ سے کام نہیں چل سکتا۔ سٹوری SMOOTH اور وقائع و مناظر سے بھری ہوئی ہو۔ قدم قدم پر ایک GRIP ہو۔

(ص ۱۵)

(۴) فارس بہت طویل نہ ہو۔ جو آپ نے اپنے خط میں لکھ کر بھیجا ہے
وہ دو ہزار فٹ سلولائیڈ پر پھیلے گا۔ میں صرف پانچ چھ سو فٹ
میں اس فارس کو ختم کر دینا چاہتا ہوں اور پھر آپ نے انگریزی
اور فارسی کے جو لفظ استعمال کیے ہیں۔ وہ حقیقت سے
بہت دور معلوم ہوتے ہیں۔

(ص ۷۰)

(۵) آپ مندرجہ ذیل مصنفوں میں سے کسی ایک کی کتاب فلم کیلئے
منتخب کر سکتے ہیں :-
انتون چیخوف، طالسطائی، میکسم گورکی، تورگنیف، دوستوسکی،
اندرلیف، میری کوریلی، وکٹر ہیوگو، گستاؤ فلابیر، ایمل زولا، پیرلوئی،
ڈکنز۔"

(ص ۲۸)

اس زمانے میں منٹو ریاضت کی حد تک خود کام کرتے رہے۔ انہوں نے کیچڑ (مڈ) کے نام سے ایک کہانی مکمل کر لی یہ کہانی ان کے اپنے مشہور افسانے "نیا قانون" سے ملتی جلتی تھی اور نیا قانون کے نتھو کو ایک نئے انداز سے اس فلم میں پیش کرنے کی سعی کی گئی تھی۔ منٹو نے کہا تھا "اگر یہ اسٹوری فلمائی گئی اور ڈائریکشن اس چیز کو برقرار رکھ سکی جو میرے سینے میں ہے تو میرا خیال ہے کہ آپ میرے مڈ میں سارا ہندوستان دیکھ لیں گے" لیکن منٹو کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو منٹو کو یہ دیکھ کر دھچکہ لگا کہ یہ وہ کہانی نہیں تھی جو انہوں نے بُن لی تھی وہ حد درجہ بددل ہو گئے اور وہ ساری محنت رائیگاں ہو گئی۔ منٹو نے اپنے کرداروں کو اپنی تمام خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ پیش کیا تھا لیکن فلم میں جو کردار فلمائے گئے تھے وہ کسی اور دنیا کے باسی معلوم ہوتے تھے۔

فلمی زندگی کے دوران منٹو اس صنعت کے نشیب و فراز سے واقف ہو گئے تھے اور جن شبہات

نے انہیں ابتدا میں گھیرا تھا وہ آہستہ آہستہ واضح ہو گئے روزی روٹی کا مسئلہ تھا اُس حد تک وہ انڈسٹری کے ساتھ رہے لیکن دخل اندازی ترک کر دی۔ خود لکھتے ہیں۔

(۱) "میں سروج کمپنی میں چلا آیا ہوں مگر اس کے نظام کی اصلاح میرے بس کی بات نہیں۔ جب تک اس کمپنی کا مالک ہی اپنی اصلاح کا خیال نہ کرے۔"

(منٹو کے خطوط ص ۳۶)

(۲) "میں نے فلم کی پروڈکشن میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا ہے۔"

(ص ۷۵)

منٹو کو افسوس رہا کہ ان کی بیشتر کہانیاں جو انہوں نے محنت سے لکھی تھیں فلم کے ناخداؤں کے باعث برباد ہو گئیں اور وہ چیز سامنے نہ آئی جس کا خواب انہوں نے دیکھا تھا۔

فلم سعادت حسن منٹو کے ذہن پر اس قدر حاوی ہے کہ ان کی اکثر کہانیاں اسی ماحول کی پروردہ ہیں۔ ان کے یہاں مثال کے طور پر بینکاراتی، بسم اللہ، پراسرار لڑکی، مس مالا، سنتر پینچ، میرا نام رادھا ہے، جانکی پیرن، ممی، ایک بھائی ایک واعظ، ہارتا چلا گیا، میرٹھ کی قینچی وغیرہ ایسی لاتعداد کہانیاں ہیں جن کا تعلق فلم انڈسٹری کے ساتھ کسی نہ کسی پہلو سے ہے۔ ان کے پلاٹ، واقعات، کردار فلمی دنیا سے ماخوذ ہیں۔ ان میں خود منٹو کی حیثیت بھی ایک کردار کی سی ہے اور بعض جگہوں پر منٹو کی شمولیت بالکل شعوری ہے۔ ان کے اپنے کردار کے بغیر بعض ایسی کہانیاں بے رنگ رہ جائیں گی، واقعات کی ایسی بنت اور کرداروں کی ایسی پیشکش ان کہانیوں کو جان دار اور دلچسپ بناتی ہے۔ ان کہانیوں کے مطالعے سے بھی فلمی دنیا کے شب و روز کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ ان کا مطالعہ باعث طوالت ہوگا لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ایسی کہانیاں منٹو کے اس تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہیں جو انہوں نے فلمی دنیا میں حاصل کیا تھا۔ اس لئے یہ تخیلی کہانیاں نہیں بلکہ ان کی بنیاد ٹھوس حقایق پر ہے۔

منٹو کی دو تصانیف "گنجے فرشتے" اور "لاؤڈ اسپیکر" ان کی معاصر فلمی زندگی کا آئینہ ہیں۔ یہ اپنی قسم کے منفرد خاکوں کے مجموعے ہیں۔ جن میں علاوہ بعض غیر فلمی لوگوں کے اداکار اشوک کمار، شیام، نسیم بانو، نرگس، وی ایچ ڈیسائی (کامیڈین) بالو راؤ پٹیل، نینا، ملکہ ترنم نور جہاں، نواب کشمیری، ستارہ، کلدیپ کور، انور کمال پاشا، پارو دیوی، رفیق غزنوی وغیرہ پر بھرپور شخصی خاکے ملتے ہیں۔ منٹو کے یہ خاکے نہ صرف خاکہ نگاری کے شعبے میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں بلکہ فلمی دنیا کے شب و روز کی تمام خوبصورتیاں اور بدصورتیاں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ منٹو کی اس آرٹ گیلری میں متذکرہ بالا فلمی شخصیات کے ساتھ ساتھ شوکت حسین رضوی، شوبھنا سمرتھ، ثریا، سہگل، خورشید، ممتاز شانتی، گیتا نظامی، نظامی، مرزا مشرف، نواب، پی این اروڑہ، نذیر، کے آصف، الناصر، محسن عبداللہ، شانتا رام، ڈبلیو زیڈ احمد، سینہ پردھان، منتوشی، شاہد لطیف، ایس مکرجی، پران، زمولہ، نگار سلطانہ، سہراب مودی، جدن بائی، سیٹھ ویاس اور ایسے ہی بیسوں اداکار، اداکارائیں، ہدایت کار، موسیقار، فلمساز، مسخرے، ادیب اور شاعر اپنی تمام عریانیوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ یہاں گناہ اور ثواب کی عجیب و غریب داستانیں سامنے آجاتی ہیں۔ منٹو صرف روزنوں سے نہیں جھانکتے۔ ان لوگوں کے درمیان میں بیٹھ کر ان کی سائیکی کو سمجھتے ہیں اور یوں پیش کرتے ہیں کہ ان کا اندر باہر سامنے آجاتا ہے :-

(۱) "میک اپ اتارنے کے بعد اس نے چہرے پر مختلف روغنیات
ملے اور ہاتھ دھو کر قرآن اٹھایا اور تلاوت شروع کر دی۔
میری بیوی بے حد متاثر ہوئی۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا
نسیم! قسم تم تو ہم لوگوں سے کہیں اچھی ہو"

(پری چہرہ نسیم)

(۲) "شیام صرف بوتل اور عورت کا ہی رسیا نہیں تھا۔ زندگی میں
جتنی نعمتیں موجود ہیں وہ ان سب کا عاشق تھا۔ اچھی کتاب سے بھی

وہ اسی طرح پیار کرتا تھا جس طرح ایک اچھی عورت سے کرتا تھا۔"

(مُرلی کی دُھن)

۳) "وہ اونچے استھان پر کسی کو بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن جو زمین پر گرا ہوگا اس کو اٹھانے کے لئے وہ کئی کوس چل کے آئے گا۔ اس کو اونچا کرنے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگادے گا اور جب وہ افتادہ شخص اس کی مدد سے اور اپنی محنت سے بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا تو وہ اسے گرانے کی کوشش کرے گا۔"

(بابوراؤ پٹیل)

۴) "جدن بائی کبھی مصالحت کی طرف جھک جاتی۔ اشوک تم اور بے بی (نرگس) دونوں پر دنیا مرتی ہے۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ تمہیں ایک ساتھ پیش کروں تا کہ قتل عام ہو اور ہم سب خوب فایدہ اٹھایں۔

(نرگس)

۵) اشوک جتنا اچھا کردار کا ہے اتنا ہی اچھا ہدایت کار بھی ہے۔ اس کا علم مجھے "آٹھ دن" کی شوٹنگ کے دوران میں ہوا۔ معمولی سے معمولی منظر پر بھی وہ بہت محنت کرتا تھا۔ شوٹنگ سے ایک روز پہلے وہ مجھ سے نظر ثانی کیا ہوا سین لیتا اور غسل خانے میں بیٹھ کر گھنٹوں اس کی نوک پلک پر غور کرتا رہتا ــــــ یہ عجیب بات ہے کہ باتھ روم کے علاوہ اور کسی جگہ وہ پوری توجہ سے فکر طلب امور پر غور نہیں کر سکتا۔

(اشوک کمار)

(۲) "رفیق کو عورت میں شرافت بہت بری طرح کھلتی ہے۔ معلوم نہیں
کیوں۔ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کا واسطہ چونکہ شروع ہی سے ایک
ایسے طبقے کی عورتوں سے پڑا تھا فحش کلامی اور جگت بازی جن کا اوڑھنا
بچھونا ہوتی ہے۔ جو سستے اور بازاری قسم کے مذاق کرتی ہیں۔ اور ایسے
ہی ہنسی ٹھٹھے کی دوسروں سے توقع کرتی ہیں۔ اس لئے رفیق کے لئے
شریف خواتین میں کوئی کشش نہیں تھی۔ اس کی جسمانی حسیات کو
بیوی پنا بیدار نہیں کر سکتا تھا۔"

(رفیق غزنوی)

ان خاکوں سے قطع نظر معاصر ہندوستانی فلموں اور صنعت فلم سازی پر منٹو نے کئی گراں قدر مضامین لکھے ہیں جو ملک کے مختلف رسایل میں شایع ہو چکے ہیں۔ ان مضامین میں منٹو ایک منجھے ہوئے فلمی نقاد کی حیثیت سے ابھرتے ہیں۔ ان میں ان کے نظریات کی عکاسی واضح طور پر ہوتی ہے۔ ایسا ایک مضمون "ہندوستانی صنعت فلم سازی پر ایک نظر" ہے یہ معلوماتی اور تنقیدی مضمون ان کے مضامین کے مجموعے میں شامل ہے۔ اس میں ۱۹۱۳ء سے جب ڈی۔ جی۔ پھالکے نے ہندوستان کی پہلی فلم بنائی تھی۔ منٹو کے زمانے تک فلم انڈسٹری کے نشیب و فراز کا ایک تجزیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔

منٹو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہندوستان کو بلند معیاری فلموں کی ضرورت ہے جن کو بین الاقوامی مقابلے میں رکھا جا سکے۔ منٹو نے فلم انڈسٹری سے وابستہ ایسے قلم کاروں کو ہدف ملامت بنایا ہے جو دوسروں کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں پیش کرتے ہیں۔ منٹو کا یہ خیال صرف اس وقت ہی نہیں بلکہ آج بھی صحیح ہے کہ ہماری فلموں میں ہندوستانیت امریکی لباس میں نظر آتی ہے اور کبھی امریکہ دھوتی کرتے میں نظر آتا ہے جو مضحکہ خیز ہے۔ ہندوستانی فلم سازی کو اس درجہ ذلت تک پہنچانے میں منٹو کے مطابق سب سے بڑا ہاتھ فلمی صحافی کا ہے۔ منٹو لکھتے ہیں:۔

"دراصل ہر شخص کساد بازاری کے اس زمانے میں کسی نہ کسی حیلے سے

اپنی روزی کمانا چاہتا ہے اور جب فلمی دنیا میں فلمی خداؤں کے آگے سر
جھکانے سے چاندی کے سکے مل جاتے ہیں تو کورنشوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔"

(منٹو کے مضامین ص ۱۱۶)

منٹو نے اس بات کو جان لیا تھا کہ فلم ہی ہندوستانی ذہن کو بیدار کرنے کا ایک طاقتور وسیلہ ہے۔ لہٰذا اس کو سنوارنے اور صحت مند لائینوں پر لگانے کی ضرورت ہے اس سلسلے میں وہ اولاً فلم پروڈوسروں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں کہ وہ فلم کا مقصد محض تفریح خیال کرتے ہیں اور باقی پہلو نظر انداز کرتے ہیں۔ وہ تیسرے درجے کی فلم بناکر صرف اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈال دیا جائے اور اپنی تجوریاں بھری جائیں۔

منٹو نے فلم کی تکنیک سے بھی بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک ہندوستانی فلم کا سب سے بڑا نقص اس کی بے جا طوالت ہے۔ وہ ہمیشہ اختصار کے قایل رہے ہیں۔ فلم کی طوالت کے باعث اس کے مکالمے طویل ہوں گے۔ واقعات اور حادثات طویل ہوں گے۔ طویل سیٹ ہوں گے۔ اس لئے موقعہ بے موقعہ گیت اور ناچ ہوں گے۔ بقول منٹو اس سے فلم کی رفتار میں "لنگڑاپن" پیدا ہوتا ہے۔ منٹو فلم میں کاسٹ کے بارے میں بھی اظہار خیال کرتے ہیں۔ وہ ناموں کے بجائے ستارہ شناسی پر زور دیتے ہیں۔ وہ فلموں کی تشکیل میں ہدایت کار کے رول پر خاص زور دیتے ہیں۔ ان کے مطابق ہدایت کار کے لئے ایک خاص اسٹایل کی ضرورت ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ہدایت کار کا اپنا مخصوص آہنگ اور اسٹایل نہ ہو تو فلم متحرک تصویر کے بجائے یک آہنگ فیتے بن جائیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں روزانہ سینکڑوں فلموں کی نمائش ہوتی ہے مگر مقام تاسف ہے کہ ان میں بہت کم فلم، فلم ہوتے ہیں۔ دراصل جو ڈائریکٹر یہ فلم تیار کرتے ہیں تخیل سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ وہ اسٹوری کو سامنے رکھ کر صرف کلوز اپ، مڈ شاٹ، لانگ شاٹ میں کیمرہ رکھنے کا حکم دینا جانتے ہیں اور بس وہ کیمرے کو ہیروئن کے چہرے کے

قریب بار بار لے آتے ہیں۔ مگر ان کو کلوز اپ کی اہمیت قطعی طور معلوم نہیں ہوتی۔ ایسے ڈائریکٹر ان نام نہاد ادیبوں کے مترادف ہیں جو بے ربط عبارت لکھتے ہیں اور جنہیں الفاظ کی نشست و برخواست کا کوئی سلیقہ نہیں ہوتا۔"

(منٹو کے مضامین ص ۱۶۴-۱۶۵)

اس سلسلے میں منٹو ہالی وڈ کے ارلنسٹ کیوبش، ڈی، ڈبلیو گرفتھ، ایرک خال مسٹراہسم اور ہندوستانی ہدایت کاروں میں دیوکی بوس اور شانتارام کے کارناموں کی تعریف کرتے ہیں اور ان لوگوں کے اسٹائل اور آہنگ کے سلسلے میں رطب اللسان ہیں۔

منٹو اداکاری کے فن پر خاص طور پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ وہ اداکاری میں کردار نگاری کے فن کو مصوری، سنگ تراشی، شاعری، افسانہ نگاری اور موسیقی کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس میں ریاض اور لگن کے عنصر کا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔ یہ کام ہر ایرے غیرے کا نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک مخصوص ذہن اور جسم کی ضرورت ہے، فلموں میں ہیرو، ہیروین اور ولن کی تثلیث کی بڑی اہمیت ہے اور اس تثلیث میں وہ انسانی خوبیوں اور خامیوں پر زور دیتے ہیں۔ وہ ایسے کردار چاہتے ہیں جو صرف فرشتے یا شیطان نہ ہوں بلکہ دونوں ہوں اور ایسے ہوں جن کا تعلق اس زمین کے ساتھ ہو۔

منٹو کا یہ مضمون صنعت فلم سازی کے ایسے پہلو سامنے لاتا ہے جن کی صداقت میں آج اتنے سال گزرنے کے بعد بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ تکنیک کے اسرار و رموز بتا کر منٹو عملی تنقید کا ایک اچھا نمونہ اپنے دوسرے مضمون "زندگی" میں پیش کرتے ہیں۔ منٹو کا یہ تجزیاتی مطالعہ اس سلسلے میں ایک قابل قدر مضمون ہے۔

منٹو کے فلمی مضامین میں ان کا ایک مزاحیہ مضمون "میں فلم کیوں نہیں دیکھتا" بھی ہے۔ برس ہا برس کے تجربے نے منٹو کے سامنے گلیمر کی اس دنیا کے راز کھول دیئے تھے۔ ایک منشی سے لیکر کہانی کار تک اور ایک زمانے میں فلمستان کے آقاؤں میں سے ایک کی حیثیت سے منٹو نے اس نگری کو خوب

خوب دیکھا تھا۔ ان کا ذہن زرخیز اور شاداب تھا۔ ان کی نظر گہری اور مشاہدہ غضب کا تھا۔ وہ کہتے تھے۔

"اگر کوئی صاحب میرے ساتھ وعدہ کریں کہ وہ میرے دماغ میں سے
خیالات نکال کر ایک بوتل میں ڈال دیں گے تو منٹو آج مرنے کو تیار
ہے۔ منٹو، منٹو کے لئے زندہ نہیں ہے"

لیکن وہ جلد ہی بددل ہو گئے جب ان کی فلمیں مسخ ہونے لگیں۔ ان کو نااہل قرار دیا گیا یا ان کی فلمیں رد کر دی گئیں۔ لکھتے ہیں:

(۱) اسکرین کے لئے ایک اسٹوری لکھی ہے۔ "جو قیادت" پر ایک زہریلا
طنز ہے۔ امید ہے کہ یہاں کی کوئی فلم کمپنی اسے خریدے گی۔ اس کا
مکالمہ میں نہیں لکھ سکا اور نہ میں لکھوں گا۔ اس لئے کہ ڈائریکٹر اس کو عام
طور پر مسخ کر دیا کرتے ہیں۔"

(منٹو کے خطوط ص ۷۸)

(۲) میں نے فلم کی پروڈکشن سے دلچسپی لینا چھوڑ دیا ہے۔ ڈائریکٹر صاحب
کو میرا مکالمہ پسند نہیں آیا۔ وہ کہتے ہیں جو کچھ تم لکھتے ہو میری سمجھ سے
بالاتر ہے۔ اب وہ ایک ایسے مکالمہ نویس سے اس اسٹوری کا مکالمہ
لکھوا رہے ہیں جس کا لکھا ہوا ان کی سمجھ میں آجاتا ہے۔

(منٹو کے خطوط ص ۷۵)

(۳) آپ کو یہ سن کر افسوس ہوگا کہ لالہ جی فلم نہیں بنا رہے ہیں۔ جنگ کی وجہ
سے میں نے کہانی ہزار کے بجائے پانچ سو میں ان کے پاس بیچ دی ہے۔

(منٹو کے خطوط ص ۱۸۶)

اس بددلی اور گھٹن کا ردعمل "میں فلم کیوں نہیں دیکھتا" میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہاں منٹو کا قلم زہر بھی اگلتا ہے اور بے رحم نکتہ چینی بھی کرتا ہے۔ اس مضمون میں فلم کے بہت سے تاریک گوشے بے نقاب

ہو جاتے ہیں۔ اپنے فلمی شوق کا ذکر کرتے ہوئے منٹو لکھتے ہیں۔

"کوئی زمانہ تھا میرے کمرے کی زینت صرف ایکٹر اور ایکٹرسوں کی تصویریں ہوا کرتی تھیں۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ ان تصویروں کے فریم میں خود اپنے ہاتھ سے بنایا کرتا تھا۔ لیکن آج میرے کمرے میں آپ کو صرف ڈاسن کے کارٹون آویزاں نظر آئیں گے۔ جو بندروں کی نفسیات کی تصویر کشی کا ماہر ہے۔ آپ سوچیئے اتنا بڑا انقلاب کیسے برپا ہوا؟

{ میں فلم کیوں نہیں دیکھتا
تلخ، ترش اور شیریں ص ۵۳ }

اس کے بعد منٹو اپنا خاص لہجہ اختیار کرتا ہے اور مزاحیہ انداز میں اس تصنع اور بناوٹ کی دنیا کو پیش کرتا ہے جہاں اول سے آخر تک صرف فریب ہے جہاں زندگی کی کوئی رمق نہیں۔ چند مثالیں :-

(۱) وادئ کشمیر میں برف باری ہو رہی ہے۔ لیکن بہت سے مزدور کاغذ کے بنے ہوئے سردوں پر اوپر سے صابن کی ہوائیاں اور کاغذ کے ننھے ننھے ٹکڑے منتشر کر رہے ہیں۔

(۲) گا کوئی رہا ہے، لب کسی کے ہل رہے ہیں، لکڑی کا ٹیلی فون میز پر دھرا ہے۔ پاس ہی ایک آدمی گھنٹی لیے کھڑا ہے۔ وہ بجاتا ہے تو ہیرو صاحب جھٹ ریسیور اٹھاتے ہیں۔۔۔۔۔ ہیروئن گیسو بریدہ ہے لیکن پردے پر دیکھو تو کسی زلف دراز تیل کا اشتہار ہے۔۔۔۔۔ گھونسہ چلتا ہے۔ لگتا لگاتا کسی کے بھی نہیں لیکن دو تین آدمی چت ہو کر رہ جاتے ہیں۔

(۳) یقین مانیئے یہ بناوٹیں دیکھ دیکھ کر میرا دل کھٹا ہو گیا اور انگریزی ضرب المثل کے اونٹ کی کمر اس آخری تنکے نے توڑ دی جب میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے بنے ہوئے فلم کو ہال میں تماشائیوں کے ساتھ

دیکھا اور ہیروین کی مصنوعی پلکوں سے پھیلتے ہوئے گلسرین آنسوؤں
نے مجھے ایک سے زیادہ بار رلایا۔

(میں فلم کیوں نہیں دیکھتا)

منٹو نے فلم کو ادب سے کمتر درجے کی چیز نہیں سمجھا تھا۔ انہوں نے بہت خلوص سے اس وسیلے کے ذریعے خدمت کرنا چاہی تھی اور کسی حد تک وہ اس میں کامیاب ہوئے بھی مصور اور کارواں کی ادارت کے دوران انہوں نے ایسا مواد شائع کیا جس سے فلموں میں صفائی اور سلیقہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی خود انہوں نے بہتر سے بہتر کہانیاں لکھیں۔ لیکن ہمیشہ فلمسازوں اور ارباب اختیار کی نااہلیت کے باعث مسخ ہوئیں پھر بھی تقسیم ملک کے بعد اس وقت تک جب انہوں نے پاکستان کی ہجرت اختیار نہیں کی وہ فلم انڈسٹری کے ساتھ منسلک تھے۔ لیکن جب ان کے دوست اداکار اشوک کمار نے ان کی کہانی رکھ لی اور اس کے بجائے کمال امروہی کی محل اور عصمت چغتائی کی "ضدی" فلمانا شروع کی۔ تو ان کی انا کو ایک زبردست دھچکہ لگا اور وہ پاکستان جانے کے لئے پر تولنے لگے، جہاں لاہور کے ایک فلم ساز مسٹر بی گڈوانی انہیں معقول معاوضہ دیکر بلا رہے تھے۔ بیگم صفیہ منٹو مرحومہ ترک وطن کے بارے میں کچھ مختلف خیالات کا اظہار کرتی ہیں ——

"ان کے ساتھ ہمیشہ ہر ایک نے ناانصافی کی ہے۔ ان کے انڈیا سے ابھی آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن پارٹیشن ہونے سے چند مہینے پہلے ہی انہیں فلمستان سٹوڈیو سے نوٹس مل گیا تھا۔ جس سے ان کا بے انتہا دل ٹوٹا تھا۔ لیکن یقین مانیئے انہوں نے کافی دیر مجھ سے چھپائے رکھا کہ مجھے نوٹس مل گیا ہے۔ کیونکہ ان کو مسٹر مکرجی اور مسٹر اشوک کمار وغیرہ پر ناز تھا۔ پھر وہ مجھے کیسے بتاتے کہ مجھے نوٹس مل گیا ہے۔"

(بیگم صفیہ منٹو مرحومہ کا خط راقم السطور کے نام)

اس کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور ہندوستانی فلم سازی کے ساتھ ان کا رشتہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ یہ صرف قیاس نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ اگر منٹو ہندوستان میں رہتے اور حالات انہیں ترکِ وطن پر مجبور نہ کرتے تو نئے حالات میں ان کا شاداب ذہن نئے طرز کی فلمیں لکھ کر فلمی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ۔

منٹو کی پہلی فلم (اسکرپٹ کا خلاصہ)

میرے افسانے کا آغاز کیچڑ سے ہوتا ہے جس میں ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے پرتھوی۔ یہ اس افسانے کا ہیرو ہے۔ یہ لڑکا کیچڑ میں پیدا ہوتا ہے اور کیچڑ ہی میں پھلتا پھولتا ہے۔ افسانے میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ اُسے بچپن میں کیچڑ سے بے حد اُلفت تھی۔ یہ لڑکا بڑا ہو کر بھی کیچڑ ہی سے اپنی روزی کماتا ہے یعنی گارے سے اینٹیں بناتا ہے۔ اس مختصر تمہید کے بعد ہم تصویر کے دوسرے رُخ کی طرف پلٹتے ہیں۔ اور دکھاتے ہیں کہ ان اینٹوں سے بنے ہوئے مکان میں بھٹے کا مالک رام داس رہتا ہے۔ بہت امیر ہے سنگار ہاتھوں سے اُس نے یہ دولت سمیٹی تھی۔ اُس کی ایک اکلوتی لڑکی ہے سوشیلا نام، وہ ناز و نعمت میں پلی ہے۔ اُس نے آج تک غم کی شکل نہیں دیکھی وہ غربت کے نام سے بھی نا آشنا ہے ایک روز وہ اپنے کمرے میں نئی نوکرانی کو دیکھتی ہے جو بیحد غلیظ ہے عورت کو میلے کچیلے چیتھڑوں میں ملبوس دیکھ کر اُسے ترس نہیں آتا بلکہ اُسے حیرت ہوتی ہے چنانچہ اسی حیرت کا ذکر وہ اپنے باپ سے کرتی ہے "پتاجی! یہ بندری کہاں سے آ گئی"۔ اُس کا باپ یہ سمجھا ہے کہ شاید آس پاس کے درختوں سے سچ مچ کوئی بندری چلی آئی ہے مگر بعد میں جب اُس کو اصلی بات کا علم ہوتا ہے تو اُس کو

بڑا مزا آتا ہے۔ سب ہنستے ہیں۔ اُس کا باپ کہتا ہے "بیٹا تو نے ابھی تک غریب دیکھے ہی نہیں کسی روز میرے ساتھ چلنا میں تمہیں بہت سے بندروں کا تماشا دکھاؤں گا" اُس کی مراد اُن مزدوروں سے تھی جو اُس کے بھٹے میں اینٹیں بناتے تھے۔

اِدھر یہ باتیں ہو رہی تھیں اُدھر بھٹے میں مزدور امیر آدمیوں کی نقل اُتار رہے تھے۔ امیر اُن کو بندر سمجھتے تھے اور وہ اُن کو بندر یقین کرتے تھے۔

رام داس اپنی بیٹی سوشیلا کو تماشا دکھانے کے لئے مزدوروں کی بستی میں لاتا ہے۔ وہ خود کام کی نگرانی کے لئے چلا جاتا ہے اور سوشیلا تماشا دیکھنے کے لئے چلتی ہے مگر خود تماشا بن جاتی ہے۔ گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں شہر کی اس بھڑکیلی تیتری کو دیکھ کر جمع ہو جاتی ہیں اور اُس کا خوب مضحکہ اُڑاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوشیلا کو وہاں سے بھاگنا پڑتا ہے۔ اس بھاگ دوڑ میں اُس کی ٹکر پرتھوی کے دوست نتھو سے ہوتی ہے۔ وہ گر پڑتی ہے۔ اس کو نتھو اٹھاتا ہے مگر وہ اس مدد کو قبول نہیں کرتی نتھو منکسر المزاج نہیں وہ اُس کو دھکا دے دیتا ہے۔ دُور سے پرتھوی یہ سمجھتا ہے کہ اُس کے دوست نے سوشیلا سے ناجائز چھیڑ چھاڑ کی ہے وہ آگے بڑھتا ہے اور بغیر پوچھے گچھے اُس کے مُنہ پر ایک تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ سوشیلا سے معافی مانگتا ہے اور اُس کو زمین پر سے اٹھانا چاہتا ہے کہ وہ شور مچانا شروع کر دیتی ہے۔ اُس کا باپ آتا ہے اور بے چارے پرتھوی کو بہت سخت سست باتیں سننا پڑتی ہیں۔ اُس کی تنخواہ بھی کاٹ لی جاتی ہے اور پٹتا بھی جاتا ہے نتھو یہ سب کچھ دیکھتا اور ہنستا ہے اور کرو اپنی ہمدردی کا اظہار۔ پرتھوی کو یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے چنانچہ اُس نے اِس کا اظہار بھی کیا۔

جیسا کہ اسٹوری کے TREND سے ظاہر ہے۔ پرتھوی اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اب ہم درمیان میں یہ دکھلاتے ہیں کہ شہر میں وبا پھیلتی ہے لوگ سینکڑوں کی تعداد میں مرنا شروع ہوتے ہیں۔ سوشیلا بھی پلیگ کا شکار ہوتی ہے اور مردہ سمجھ کر ایک کھائی میں پھینک دی جاتی ہے۔ گاؤں والے جو ہر قسم کی بیماریوں سے محفوظ ہوتے ہیں شہر میں رضاکاروں کی حیثیت سے آتے

ہیں۔ پرتھوی کی نظر اتفاق سے کھائی میں سوشیلا پر پڑتی ہے وہ اُسے گھر اٹھا کر لے جاتا ہے اور اپنی ماں کو اُس کی تیمارداری پر مقرر کر دیتا ہے۔ اُس کا جھونپڑا چھوٹا سا ہے۔ وہ گھر میں نہیں سوتا باہر رہتا ہے۔

نتھو کو جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ رام داس کی لڑکی کو اپنے گھر میں اٹھا کر لے آیا ہے تو وہ بہت بگڑتا ہے اُسے سرمایہ داروں سے قطعاً ہمدردی نہیں۔ اُس کا یہ نظریہ ہے کہ ہر سرمایہ دار کی لڑکی یا لڑکا سانپ کا بچہ ہوتا ہے۔ وہ پرتھوی سے کہتا ہے کہ وہ اُس کو گھر سے باہر نکال دے مگر پرتھوی نہیں مانتا۔ باتوں باتوں میں جب نتھو کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس چھوکری کی محبت میں گرفتار ہے تو اُس کو سخت صدمہ پہنچتا ہے وہ اپنے دوست کو ایسی لڑکی سے محبت کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس لئے کہ وہ گاؤں کی کسی لڑکی کے حقوق چھین رہا ہے۔ وہ کیوں نہ اُس لڑکی سے محبت کرے جو اُس کے گاؤں کی ہو۔ نتھو اُس کو غاصب کہتا ہے اور خدا معلوم اور کیا کیا کچھ کہتا ہے۔ باتوں باتوں میں نتھو بہت گرم ہو جاتا ہے۔ وہ سارے گاؤں کو جمع کر لیتا ہے اور پرتھوی کے دل کا راز فاش کر دیتا ہے۔ سارا گاؤں جمع ہو جاتا ہے۔ اور اس بات کا تہیہ کر لیتا ہے کہ لڑکی کو نکال باہر کیا جائے۔

دوسری طرف لڑکی کو ہوش آتا ہے اور وہ اپنے آپ کو غلیظ جھونپڑے میں دیکھ کر وہاں سے بھاگ اٹھتی ہے۔ باہر ہجوم جمع ہے۔ پرتھوی ان لوگوں کو روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کی کوئی پیش نہیں چلتی۔ جب وہ لڑکی باہر نکلتی ہے تو ایک لونڈا اس کے منہ پر کیچڑ تھوپ دیتا ہے۔ سوشیلا بہت بگڑتی ہے اُس کی سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا بات ہے وہ برا بھلا کہتی ہوتی ایک گاؤں والے سے پوچھتی ہے مجھے یہاں کون لایا؟ اس کے جواب میں وہ آدمی پرتھوی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو آنکھیں جھکائے کھڑا ہے۔ سوشیلا اُس کو کوستی اور ڈانٹتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

گھر پہنچ کر اُس کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا باپ مر چکا ہے اور وہ ساری جائیداد کی واحد مالکہ ہے۔ اپنی نوکرانی سے جو گاؤں کی رہنے والی ہے اُسے معلوم ہوتا ہے کہ پرتھوی ہی نے اس کی جان بچائی تھی حقیقت کا انکشاف اُس کے دل میں پرتھوی کی بڑی عزت پیدا کر دیتا ہے۔ اُس کے دل میں محبت کی چنگاری بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ تہیہ کر لیتی ہے کہ اپنا سارا روپیہ پرتھوی کے حوالے کر دے گی

کہ وہ گاؤں کی حالت بہتر کرسکے۔

ادھر پرتھوی اس دھن میں ہے کہ روپیہ پیدا کرے۔ وہ چاہتا ہے کہ دولت حاصل کرکے سوشیلا کا مقابلہ کرے۔ وہ کھُردرے ہاتھوں اور خالی جیبوں کے ساتھ سوشیلا سے محبت کرنے کا قائل نہیں وہ یہ جانتا ہے کہ نازونعمت میں پلی ہوئی لڑکی کے دل میں وہ اس حالت میں کبھی محبت پیدا نہیں کرسکتا۔ وہ انتقام بھی لینا چاہتا ہے اور محبت بھی کرنا چاہتا ہے۔ اسی دھن میں اسے ایک روز کیچڑ میں سے سونا مل جاتا ہے۔ اب وہ امیر ہے۔ اُس کے پاس دولت ہے وہ اپنے خیال کے مطابق بڑے شاندار اور بھڑکیلے کپڑے پہن کر سوشیلا سے ملنے جاتا ہے مگر اُس کو سخت ناامیدی کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ سوشیلا اُس کو اس حالت میں دیکھ کر اُس سے کہیں زیادہ پریشان ہوتی ہے۔ وہ مزدور پرتھوی کو دیکھنا چاہتی تھی مگر اُسے ایک دولت مند پرتھوی نظر آتا ہے۔ وہ اپنی ساری دولت پرتھوی کو نذر کرنا چاہتی تھی مگر پرتھوی کی جھولی پہلے ہی سے دولت سے بھری ہوئی تھی۔ دونوں کو سخت ناامیدی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

میں یہاں تک لکھ چکا ہوں۔ اس کے بعد میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں سے ناامید ہوکر پرتھوی روپے کو پھینک دینا چاہے مگر وہ ایسا نہ کرسکے۔ اس کو کسی انسیڈنٹ INCIDENT کے ذریعے سے دولت کی اہمیت معلوم ہو۔ وہ کمبل کو چھوڑنا چاہے مگر کمبل اسے نہ چھوڑے اور چند الجھنوں میں پھنس کر روپیہ کا غلام ہوجائے عیش و عشرت میں پڑجائے۔ غیرارادی طور پر کیچڑ کو بھول جائے مگر بالآخر اُسے پھر کیچڑ ہی کی طرف لوٹنا پڑے۔

اسٹوری کا بقایا حصہ سوچنے کے دوران میں نتھو کا کیریکٹر ہرگز نہ بھولئے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ جیسا ہے ویسا ہی رہے اُس کے نظریے میں کوئی فرق نہ آئے اور وہ آخر میں شاندار طریقے پر موت کا مقابلہ کرتے ہوئے مرجائے۔

آخری سین وہی ہو جو آغاز میں ہے یعنی پرتھوی اور سوشیلا ایک جھگڑے میں جارہے ہوں اور اُن کے بچہ پیدا ہو۔

بشکریہ جناب احمد ندیم قاسمی

منٹو بحیثیت ترجمہ کار

سعادت حسن منٹو نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اخبار 'مساوات' کی کالم نگاری سے کیا۔ یہ اخبار امرتسر کے ایک صاحب غازی عبدالرحمان نے جاری کیا تھا اور اس کی ادارت کے فرائض حاجی لق لق اور باری (علیگ) کر رہے تھے۔ اس سے پہلے سعادت حسن منٹو تکیوں اور قبرستانوں میں گھوما کرتے تھے۔ انہیں چرس اور شراب سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جوئے بازی اور آوارہ گردی کے بھی حد سے زیادہ شکار ہو چکے تھے۔ اسی زمانے میں ان کی ملاقات مشہور اشتراکی ادیب باری (علیگ) سے ہوئی جنہوں نے ان کے آوارہ جنون کی تہذیب کی۔ باری صاحب کی دوربین نگاہوں نے منٹو کے ذہنی اضطرار کو پہچان لیا اور انہیں صحافت کی طرف مائل کیا۔ چنانچہ اب باری صاحب کے اخبار 'مساوات' کے دفتر میں محفلیں جمنے لگیں۔ منٹو کو آوارہ گردی اور جوئے بازی سے نفرت ہو گئی اور اب وہ کبھی کبھی باری صاحب کے ایما پر چھوٹی موٹی خبروں کا ترجمہ کرنے لگے اور اس کے ساتھ ہی اخبار 'مساوات' میں فلمی خبروں کا کالم لکھنے لگے۔ باری صاحب نے نوجوان منٹو میں تخلیقی صلاحیت پا کر ان کو لکھنے پڑھنے کی طرف مائل کیا۔

چنانچہ وہ ترجموں کی طرف راغب ہوئے۔

منٹو کا ایک نمایندہ ترجمہ "دست بریدہ بھوت" تھا[1]۔ یہ انگریزی کے مشہور ادیب سر آرتھر کانن ڈائل کے ایک افسانے کا ترجمہ تھا اور منٹو کے لئے اپنی قسم کا انوکھا تجربہ تھا۔ باری صاحب کی تحریک پر منٹو نے تیرتھ رام فیروزپوری کے ترجموں کا مطالعہ ترک کیا۔ اور وکٹر ہیوگو، آسکر وائلڈ اور دوسرے مغربی مصنفین کا مطالعہ شروع کیا۔ باری صاحب کا جزو ایمان اشتراکیت کا فلسفہ تھا۔ لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ ان کے حلقۂ اثر میں آنے والے لوگ اشتراکیت کے فلسفہ کو اپنائیں اور اس کی اشاعت کریں۔ چنانچہ ان کی ترغیب پر منٹو نے فرانس کے مشہور انقلاب پسند ادیب وکٹر ہیوگو کی شہرۂ آفاق تصنیف 'LAST DAYS OF A CONDEMNED' کا ترجمہ شروع کیا۔ یہ کتاب باری صاحب کی نظر میں ایک گرم کتاب تھی۔ منٹو کو اس کا ترجمہ کرتے وقت بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں کہ اس طرح کا کوئی تجربہ انہیں اس سے پہلے نہیں تھا۔ آخر لغت کی مدد سے چند دنوں میں ساری کتاب کا ترجمہ کر لیا۔ باری نے مترجم کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے اس اولین کارنامے کی نوک پلک سنواری۔ یہ کتاب یعقوب حسن مالک اردو بک سٹال نے تیس ۳۰ روپے کے عوض خرید کر شایع کر دی۔ کتاب کا نام "پھانسی۔ ایک اسیر کی سرگذشت"[2] تھا۔ مترجم نے اس کتاب کا انتساب مجرم کی معصوم بیٹی میری کے نام کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۳ء میں شایع ہوئی۔ کتاب کے مقدمے میں منٹو اہلِ نظر کو کتاب پڑھنے کی دعوت یوں دیتے ہیں :-

"کتاب کا اندازِ تحریر پڑھنے والوں کے دماغ سے گذر کر ان کے دل پر منقش ہو جاتا ہے۔ کتاب فی الحقیقت ایک بین الملی داستان ہے۔ قانون دان طبقہ اور فطرت انسانی سے دلچسپی لینے والے حضرات کو چاہیئے کہ وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔"[2]

اس کتاب کے ترجمے کا مقصد منٹو کے نزدیک وکٹر ہیوگو کے تنسیخ سزائے موت کے نظریے کو پیش کرنا اور وطنی ادبیات کی خدمت کرنا تھا۔ منٹو نے اس کا اعتراف کتاب کے مقدمے میں کیا ہے۔

---

[1] یہ ترجمہ ماہنامہ ہمایوں لاہور اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شایع ہوا تھا۔ [2] مقدمہ ایک اسیر کی سرگذشت۔

وکٹر ہیوگو کے نظریئے سے قطع نظر منٹو کا یہ اظہار قابل غور ہے کہ وہ وطنی ادبیات کی توسیع میں ترجمہ کاری کو اہم قرار دیتے ہیں کیوں کہ ترجمہ سے زبان کی قوت اظہار بڑھ جاتی ہے۔

ترجمہ کاری بذات خود ایک فن ہے۔ اس کے لئے اپنی زبان کے علاوہ اس زبان میں بھی خاصی مہارت کا ہونا لازمی ہے جس کا ترجمہ کرنا مطلوب ہو۔ یہ صحیح ہے کہ ایک مترجم کے لئے لغت ایک کارآمد ہتھیار ہے لیکن اچھا ترجمہ محض لغت کی بیساکھیوں کا مرہون منت نہیں ہوتا۔ ایک منجھا ہوا مترجم محض لفظی معنوں پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس روح کو ترجمے میں پھونکتا ہے جو اصل مصنف کی تحریروں میں موجود ہو۔ لغت کی مدد سے کیا ہوا ترجمہ نہ صرف اپنی اصل سے ہٹ جاتا ہے بلکہ اس میں ایک روکھاپن پیدا ہو جاتا ہے۔ سرور صاحب نے بجا کہا ہے کہ ترجمے کی اہمیت کسی طرح بھی تخلیق سے کم نہیں کیوں کہ اس میں تخلیق کو از سرنو پانا ہوتا ہے[1]۔ منٹو ایک پختہ کار اور پیشہ ور مترجم نہیں تھے لیکن پھر بھی ان کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ وہ روسی افسانوں کو اردو میں منتقل کرنے والے اولین مترجمین میں سے تھے۔ انہوں نے روسی، فرانسیسی اور دوسری مغربی زبانوں کے ادب کا خاصا حصہ بھی اردو میں ترجمہ کیا۔

"ایک اسیر کی سرگذشت" حقیقی معنوں میں منٹو کا وہ پہلا ترجمہ تھا جس نے ان کو اردو کی ادبی دنیا میں متعارف کرایا۔ اس ترجمہ میں زبان و بیان کی بہت سی خامیاں ہیں پھر بھی منٹو کی اس کاوش کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ترجمہ بقول منٹو پندرہ دن کے اندر مکمل ہوا۔ اس سے پہلے منٹو، وکٹر ہیوگو کو درسی کتابوں کی طرح پڑھ چکے تھے۔ اور ہیوگو کے کارناموں اور ان کے تحریری مزاج کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ اس ترجمہ کے بعد باری صاحب کی یہ خواہش تھی کہ منٹو ہیوگو کے ایک اور شاہکار لیس میزربل[2] کا ترجمہ کریں لیکن کتاب کی ضخامت کو دیکھ کر انہیں ایسا کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

---

(1) ترجمہ کا فن اور روایت مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس ص ۵۳۔

(2) LES MISERABLE

'اسیر کی سرگذشت' کی اشاعت سے منٹو کی حوصلہ افزائی ہوئی اور ان کی طبیعت دوسری کتابوں کے ترجموں کی طرف مائل ہوئی۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے آسکر وائیلڈ کے اشتراکی خیالات پر استوار ڈراما 'ویرا' کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ یہ آسکر وائیلڈ کا ضبط شدہ ڈراما تھا اور روس کے دہشت پسندوں اور نراجیوں کے بارے میں تھا جو ہر طرح سے مسلح ہو کر زار شاہی کے خلاف کوئی بھی کارروائی کرنے کے لئے چوکس تھے۔ اس ڈرامے کا کینوس ۱۷۹۵ کا روس ہے یہ چار ایکٹوں پر مبنی ایک ٹریجڈی ہے۔ اس بار ترجمہ کرنے میں منٹو کو زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ترجمہ منٹو نے اپنے گہرے دوست حسن عباس کے ساتھ مل کر کیا۔[1] کتاب پر دونوں کے نام مترجمین کی حیثیت سے درج ہیں۔ اس ترجمے کو بھی حسب معمول اصلاح کے لئے باری (علیگ) کے سپرد کیا گیا لیکن منٹو ان کی اصلاح سے مطمئن نہ ہوئے کیوں کہ اس اصلاح کے بعد بھی زبان کی بعض خامیاں باقی رہ گئیں۔ اس کا ذکر منٹو اپنے مضمون 'اختر شیرانی سے ملاقاتیں' میں کرتے ہیں:-

"مصیبت یہ تھی کہ وہ (باری صاحب) میری تحریروں میں بہت کم کانٹ چھانٹ کرتے تھے۔ زبان کی کئی غلطیاں رہ جاتی تھیں جب کوئی ان کی طرف اشارہ کرتا تو مجھے بہت ہی کوفت ہوتی۔"[2]

اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ باری صاحب اب منٹو کے ترجموں سے مطمئن ہو گئے تھے۔ اور نہایت ہی رواداری میں مسودے پر نظر ثانی کرتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منٹو اب زبان و بیان کے بارے میں زیادہ محتاط ہو گئے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے کارناموں پر کوئی انگلی نہ اٹھائے اس خیال سے انہوں نے فیصلہ کیا کہ باری صاحب کے بجائے کسی دوسرے اہل زبان سے نظر ثانی کروالیں۔ ان دنوں مشہور شاعر رومان اختر شیرانی امرتسر آئے ہوئے تھے۔ منٹو اپنے ایک دوست کے توسط سے اختر صاحب کے ساتھ متعارف ہوئے۔ انہوں نے زبان کی غلطیاں درست کر دیں اور ترجمے کی بے حد تعریف کی۔ یہ کتاب ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کی اشاعت کا

---

[1] گنجے فرشتے از سعادت حسن منٹو ص ۱۰۲؛ [2] گنجے فرشتے از سعادت حسن منٹو ص ۶۷

اہتمام بڑے طمطراق سے ہوا۔ چنانچہ لوگوں کی توجہ مبذول کروانے کے لئے قدآدم اشتہار شایع کئے گئے جو امرتسر کی دیواروں پر چسپاں کئے گئے۔ اشتہار کی جلی سرخیاں یوں تھیں :-

"مستبد اور جابر حکمرانوں کا عبرت ناک انجام روس کے گلی کوچوں میں صدائے انتقام زاریت کے تابوت میں آخری کیل"

یہ ڈراما چونکہ روس کے دہشت پسندوں سے متعلق تھا اور اس کی پبلسٹی بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ لہذا کتاب کی ضبطی اور مترجمین کی گرفتاری کا خدشہ پیدا ہوا منٹو اور ان کے لنگوٹیے یار حسن عباس کے لئے یہ ایک بڑا دلچسپ تجربہ تھا۔ وہ وطن عزیز کے لئے قید و بند کی صعوبتوں کو جھیلنا بڑی قربانی سمجھتے تھے مگر ان کے ارمان پورے نہ ہوئے نہ کتاب ہی ضبط ہوئی اور نہ ہی ان کی گرفتاری عمل میں لائی گئی۔ البتہ ان کے مرشد امرتسر کی ادیب باری غایب ہو گئے۔

"ویرا" منٹو کے انقلابی اور باغیانہ جذبات سے گہری مطابقت رکھتی تھی۔ یہ ترجمہ "اسیر کی سرگذشت" سے بہتر ہے لیکن ناقص کتابت اور طباعت کی وجہ سے یہ کتاب مدتوں منٹو کے گھر میں مقفل پڑی رہی۔ کتاب کی اشاعت کے کافی دن بعد پولیس نے پوچھ گچھ شروع کر دی تھی لیکن منٹو کے ایک رشتہ دار کی مداخلت سے یہ بلا ٹل گئی۔ اس کتاب کی اشاعت اور پولیس کی چھان بین کا ذکر کرتے ہوئے منٹو کے دوست ابو سعید قریشی یوں رقم طراز ہیں :-

"اگر پولیس نے بچوں کے اس کھیل کا اپنی روایتی تن دہی سے تعاقب کیا ہوتا تو منٹو میں بھگت سنگھ بننے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں" [1]

"ویرا" کے ساتھ ہی ۱۹۳۴ء میں منٹو کی "روسی افسانے" شایع ہوئی۔ اس میں روس کے مشہور مصنفین کے افسانوں کا اردو روپ ملتا ہے۔ اس کتاب میں اناتیسٹ لیو طالسطائی، چیخوف، میکسم گورکی، سلوگب اور چیریکوف کے روسی افسانوں کے علاوہ وکٹر ہیوگو کا افسانہ "ماہی گیر" اور خود منٹو کا پہلا طبع زاد افسانہ "تماشا" شامل ہے۔ اس مجموعے کے اکثر افسانے پہلے ہی

---

[1] منٹو ص ۱۴۱۔

مشہور ادبی ماہنامہ ہمایوں لاہور میں شائع ہو چکے تھے۔ روسی افسانے منٹو کے اس رجحان کے آئینہ دار ہیں جو ابتدائی زمانہ میں ان کے غور و فکر پر حاوی تھا اور جس کی وجہ سے انہوں نے انقلابی ادب کو اردو جامہ پہنانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ دوسری بات جو اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتی ہے یہ ہے کہ اب ان کے ترجمے بہتر درجہ کے ہیں اور ان خامیوں سے بہت حد تک پاک ہیں جو ان کے یہاں ابتدا میں ملتی ہیں۔ روسی افسانے کے ترجمے میں تسلسل زور بیان، حسن ترتیب اور روانی ملتی ہے اور پیوند کاری کا احساس نہیں ہو پاتا جو ایک اچھے ترجمے کا خاصہ ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ ہمارے مکان کی دوسری منزل میں زری کا کارخانہ تھا جس میں بہت لڑکیاں ملازم تھیں۔ ان لڑکیوں میں سولہ برس کی دوشیزہ ٹینا نامی تھی جو ہمارے سامنے والی دیوار کی چھوٹی کھڑکی کے پاس ہر روز آتی اور سلاخوں کے ساتھ اپنا گلاب ایسا چہرہ لگا کر سریلی آواز میں پکارتی۔ مظلوم قیدیو! مجھے تھوڑے سے بسکٹ دو۔

(مزدور کی شکست)

۲۔ پہلے پہل تو اس اداس راگ میں کوئی شامل نہ ہوتا اور وہ راگ ہماری زندان نما کوٹھری کی چھت کے نیچے شمع کی لو کی طرح لرزتا رہتا مگر تھوڑی دیر کے بعد اس گانے والے کے ساتھ ہم میں سے ایک اور شامل ہو جاتا اور وہ غمگین و ہم آہنگ آواز میں ہماری قبر نما کوٹھری کی کثیف فضا میں تیرتی نظر آتیں۔ (مزدور کی شکست)

۳۔ لیکن تم جادوگر ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم جادوگر ہو۔ تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ یہ سب حرکتیں تمہاری تھیں۔ لیکن دیکھو۔ اب ایسی حرکت نہ کرنا بغیر بجلی کے گھر میں سخت اندھیرا ہو جاتا ہے اور کارخانہ بند کرنے سے مجھے بسکٹ نہیں ملتے۔

(جادوگر)

سنہ ۱۹۴۶ء میں منٹو کا ایک اور مجموعہ گورکی کے افسانے کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں مقدمہ کے علاوہ گورکی کے چار افسانوں کا ترجمہ شامل ہے۔ کتاب کا اہم ترین مضمون اس کا

مقدمہ ہے جو منٹو کا لکھا ہوا ہے اور گورکی کی شخصیت اور فکر و فن پر ایک جامع تبصرہ ہے — منٹو نے مقدمے میں اس کتاب کے آٹھ افسانوں کی نشان دہی کی ہے۔ لیکن کتاب میں صرف چار افسانوں کے ترجمے شامل ہیں۔ کتاب کے سرورق پر منٹو کا نام مترجم کی حیثیت سے درج ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ترجمے منٹو نے نہیں کئے ہیں۔ بلکہ ان کی حیثیت صرف ایک مرتب کی ہے۔ دوسری باتوں کے علاوہ اس ضمن میں خود منٹو کے مقدمے میں یہ عبارت ملتی ہے :-

"ہم اپنے محترم دوست شاہد لطیف، مسٹر شہاب الدین شمسی اور بالخصوص ہندوستان کے نامور ادیب اور فاضل مترجم میاں منصور احمد مرحوم کے ممنون احسان ہیں۔ جنہوں نے ہماری درخواست پر گورکی کے افکار کو اپنے مخصوص انداز میں لباس پہنایا۔" [1]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں شامل چار افسانوں میں سے تین افسانے منٹو نے نہیں بلکہ دوسرے لوگوں نے اردو میں منتقل کئے۔ چوتھا افسانہ "چھبیس ۲۶ مزدور اور ایک دوشیزہ" کے عنوان سے ملتا ہے۔ یہی افسانہ "روسی افسانے" میں مزدور کی شکست کے عنوان سے بھی شامل ہے یہ افسانہ دراصل گورکی کے مشہور افسانے "TWENTY SIX MEN AND A GIRL" کا ترجمہ ہے دونوں ترجموں میں زبان و بیان کا فرق ہے لیکن اسلوب واضح طور پر ایک ہے۔ دراصل مزدور کی شکست منٹو کے اولین ترجموں میں سے ایک ہے۔ جب کہ یہ افسانہ کئی برسوں کے بعد مناسب ترمیم اور حسن بیان کے ساتھ تیار کیا گیا ہے۔ اصل زبان کے متن کو ترجمے کی زبان میں اس سلیقے سے ڈھالا گیا ہے کہ اصل متن کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ منٹو نے کوشش کی ہے کہ مصنف کے لہجے اور طرز ادا کو اس ترجمے میں ڈھال دیا جائے اور نئی بندشوں اور نئے الفاظ سے بیان کی چستی اور سلاست پیدا ہو سکے۔

منٹو کے ترجموں کا وسیع حصہ ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ ایسے مضامین کی نشان دہی کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے جو انہوں نے مختلف فرضی ناموں سے تخلیق کئے یا جن کو انہوں نے اردو میں منتقل کیا۔ ہمایوں لاہور کے فرانسیسی ادب نمبر روسی ادب نمبر عالمگیر

---

[1] گورکی کے افسانے ص ۳۷-۳۸

لاہور اور دوسرے ادبی رسائل میں ان کے جو مختلف ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے آہستہ آہستہ اس فن میں بڑی مہارت اور مشاقی پیدا کر لی تھی منٹو نے مغربی شاعری کے بعض اچھے نمونوں کو بھی اردو کا لباس پہنایا ہے۔ کسی دوسری زبان کی شاعری کو اپنی زبان میں منتقل کرنا ایک مشکل کام ہے اور نثر کے مقابل میں ایسا کرتے ہوئے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک مترجم کو کئی ہفت خوان طے کرنا پڑتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اُسے موزون اور مناسب الفاظ کی تلاش رہتی ہے بلکہ اسے ان شعری تجربوں تک رسائی حاصل کرنا پڑتی ہے جن سے شاعر خود گذرا ہو۔ اور پھر ان کو بڑے سلیقے کے ساتھ ان الفاظ میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ اس کا کام صرف اس بات پر ختم نہیں ہوتا کہ وہ شاعر کے خیال کو اپنی زبان میں مؤثر طریقے سے بیان کرے بلکہ یہ کہ وہ اس مجموعی تاثر کا لحاظ بھی کرے جو شاعر کے کلام سے پیدا ہوتا ہے اور اسے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچا دے۔ منٹو نے اپنے متعدد ترجموں میں اس اصول کو سامنے رکھا ہے اور ایک اچھے ترجمہ کار کی حیثیت سے اپنے منصب سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کی ہے۔ وکٹر ہیوگو کی نظموں کا ترجمہ کرتے ہوئے انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

> "ہیوگو کے اشعار طرز ادا کی دل آویزیوں اور موسیقی کی گوناگوں کیفیتوں کا مخزن ہیں..... الفاظ میں وہ لوچ اور ترنم ہے کہ روح بے اختیار وجد کرنے لگتی ہے۔ اس کے اشعار پڑھتے وقت قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ صفحۂ قرطاس سے اچھل کر اس کے دل میں اتر گئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرتے وقت اصل زبان کا لطف بڑی حد تک جاتا رہتا ہے مگر راقم نے مقدور بھر اردو میں اصل کا اچھا نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔" [1]

منٹو نے مغربی شاعری کے جن نمونوں کو اردو میں منتقل کیا ہے ان میں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ان سے منٹو کی ترجمہ کاری کے فن پر روشنی پڑتی ہے:-

---

[1] ماہنامہ ہمایوں ستمبر ۱۹۳۵ء ص ۷۱۶

میں محافظ ہوں تیرا کسی سے نہ ڈر لا پھر سو جا

فرشتے تیری بند پلکوں پر بوسوں کا مینہ برساتے ہیں

میں یہاں موجود ہوں کہ مبادا کوئی برا یا درد انگیز خواب تجھے مغموم کر دے۔

تیرا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیکھ کر طوفان گذر جاتا ہے۔ بادل چھٹ جاتے ہیں، ستارے نیلی قبا میں چمکتے ہیں، سنجیدہ رات، خوشگوار صبح میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تجھ سے پیار کرنے کے لئے۔

(لوری — وکٹر ہیوگو)

○

ہم تمہیں کہاں لے چلیں، تیسریں؟

اجنبیوں کے کھیتوں میں

اپنے وطن کے مرغزاروں میں

یا جہاں آتشیں پھول کھلتے ہیں

یا سپید کلیاں لہلہاتی ہیں

ہم آج ارضِ محبت میں ہیں (ایک گیت — گوئٹے)

○

میں تیرا بوسہ تو لے لوں سچے عاشق

مگر ڈر ہے کہیں چاند سازش نہ کرے

ننھے تارے بھی ہمیں دیکھ رہے ہیں

کہیں ان میں سے کوئی ٹوٹ کر نیلگوں سمندر میں نہ گر پڑے

اور سب راز کہہ دے (لب سے انکار — میکوف)

○

ایوانِ قدرت پر دھندلی روشنی نمودار ہوئی

نسیمِ سحری نئی تازگی سے اٹھکھیلیاں کرنے لگی

قدرت کی نیند ہلکی اور بے قرار ہو گئی
سورج نمودار ہوا — رات کا آخری خواب پرواز کر گیا
رات بیدار ہوئی — آنکھیں ملتی ہوئی
اور مسکرادی (طلوع — میکوف)

○

تیری سنہری آنکھوں کی چمک پیاری ہے مجھے
جس نے میرے خیالات کی تاریک دنیا کو منور کر دیا۔
تبسم جو تیرے ہونٹوں پر کھیلتا ہے پیارا ہے مجھے
جس نے مجھے شراب کی طرح آگ لگادی
میری شب سیاہ کے دامن کو تار تار کر دیا

(پیاری ہے مجھے — ویلیری بروسوف)

اب نثر کے ترجمے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"جب عورتیں میری لاابالیانہ طرزِ زندگی سے گھبرا کر مجھ سے علیحدہ ہو جائیں تو میں بجائے توہین کے مسرت محسوس کیا کرتا تھا میں عورت سے بالکل ناواقف ہوں اور اس کے ناز و ادا سے محض بے خبر محبت بھری نگاہوں کا مجھے تجربہ ہی نہیں۔ اُن کے غمزوں کی حقیقت مجھ سے ہمیشہ پوشیدہ رہی ہے اور اب شائد احساس عدل کے اطمینان کے صلے میں مقدر نے مسرت کا بے بہا خزانہ میرے سپرد کر دیا ہے جیسے ان افراد کے احساس سے کوئی نسبت نہیں جو عورت کی محبت کو مسخ کرتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ میں دیکھتا ہوں کہ مستقبل میں میرے لئے اس سے بڑھ چڑھ کر نعمتیں اور مسرتیں موجود ہیں"[1] (سنگتراش کا روزنامچہ از الیگزینڈر کپرن)

---

[1]. ماہنامہ شاہکار لاہور اکتوبر ۱۹۳۵ء ص ۴۴

مندرجہ بالا اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سعادت حسن منٹو نے ترجمہ کاری کے فن کو بھی بڑی سنجیدگی سے اپنایا تھا اور بڑی لگن محبت اور ریاضت سے اس شعبے میں قلم چلایا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اپنے محدود وسائل کے باوجود انہوں نے میکسم گورکی، لیو طالسطائی، چیخوف، الیگزنیڈر کپرن، گوئٹے، وکٹر ہیوگو، آرتھر کانن ڈائل، ویری بروسوف، طوماسکی، پال ورلین، ترگنیف، آسکر وائلڈ، چریکوف اور دوسرے بیسوں فن کاروں کو اُردو کے قالب میں ڈھالا اور اُردو ادب کی توسیع میں قابل قدر کارنامہ انجام دیا۔ اُردو ادب کے ذخیرے میں جب بھی متراجم کی افادیت کا ذکر ہوگا سعادت حسن منٹو کی انتھک کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

منٹو اور فرانسیسی ادب

منٹو کے پورے ذہنی رویے کا مطالعہ بڑا دلچسپ اور حیرت زاء ہے۔ بہ ظاہر ان کی تعلیمی استعداد اس زمانے کے انٹرمیڈیٹ تک تھی۔ جس کی سند وہ کئی بار امتحان میں ناکام ہونے کے باوصف بھی حاصل نہ کر سکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی علمی استعداد کچھ کم نہیں تھی۔ ان کی مختلف تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے عالمی ادبیات کا مطالعہ کیا تھا اور وہ خصوصی طور پر روسی اور فرانسیسی زبانوں کے ادب سے متاثر تھے۔ روسی ادبیات سے دلچسپی ان کی ذہنی افتاد کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ لیکن فرانسیسی ادب سے بھی ان کی دلچسپی کچھ کم نہیں تھی۔ جس زمانے میں ان کے مرشد باری (علیگ) انہیں آوارہ گردی سے ہٹا کر صحافت کی ڈگر کی طرف کھینچ رہے تھے۔ اسی زمانے میں انہوں نے سب سے پہلے منٹو کو فرانس کے مشہور شاعر اور ڈرامانگار وکٹر ہیوگو کی تصنیف LAST DAYS OF A CONDEMNED کو اردو میں ترجمہ کرنے کیلئے دیا تھا۔ یہ بقول باری صاحب ایک گرم کتاب تھی۔ باری اشتراکی تھے اور انہوں نے اپنے زعم میں فرانس کے ایک انقلاب پسند مصنف کے ایک انقلابی تصور کو اردو میں منتقل کرنے کا کام منٹو کے سپرد کر دیا تھا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی ترجمہ منٹو کے تخلیقی سفر کا ایک بڑا ہی اہم پڑاؤ ثابت ہوا۔ منٹو نے

یہ ترجمہ ۱۹۳۳ء کے آس پاس ہاتھ میں لیا تھا اور انہوں نے لغت کی مدد سے پندرہ دن کے اندر اندر پوری کتاب کو اردو میں منتقل کیا تھا۔ یہ کتاب "پھانسی ــــــ ایک اسیر کی سرگزشت" کے عنوان سے ۱۹۳۳ء میں شایع ہوئی۔ منٹو نے خود مقدمے میں اہل نظر کو ان الفاظ میں اس کتاب کی طرف متوجہ کیا ہے:-

> "کتاب کا اندازِ تحریر پڑھنے والوں کے دماغ سے گزر کر ان کے دل پر منقش ہو جاتا ہے۔ کتاب فی الحقیقت ایک بین الاملی داستان ہے۔ قانون دان طبقہ اور فطرت انسانی سے دلچسپی لینے والے حضرات کو چاہیئے کہ وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔"

اس کتاب میں ہیوگو کے سزائے موت کی تنسیخ کا نظریہ ملتا ہے۔ ہیوگو نے خود اس کتاب کی تحریر کا مقصد اس نظریے کو پیش کرنا اور وطنی ادبیات کی خدمت کرنا بتایا تھا۔ غلام باری کے مطابق ہیوگو دنیا کا سب سے بڑا ناول نگار تھا۔ اس لئے ان کے مشورے سے سعادت حسن منٹو نے ہیوگو کی یہ تصنیف درسی کتاب کی طرح پڑھی اور اس کا ترجمہ کیا۔ یعقوب حسن مالک اردو بک سٹال لاہور نے اس کتاب کو شایع کیا تھا۔ کتاب کے چھپتے ہی منٹو صاحب کتاب ہو گئے تھے۔ وہ باری صاحب کے کہنے پر ہیوگو کی دوسری شہرہ آفاق تصنیف LEE MISERABLE (لی میزابل) کا ترجمہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کی ضخامت کے پیش نظر یہ کام ممکن نہ ہو سکا۔ لیکن اس کے بعد مسلسل طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ منٹو واضح طور پر فرانسیسی ادبیات سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ان کے طبع زاد افسانوں کا اولین مجموعہ "آتش پارے" کے عنوان سے شایع ہوا۔ اس میں منٹو کے کئی طبع زاد افسانے شامل ہیں۔ ان میں سے ایک افسانہ "ماہی گیر" بھی ہے۔ یہ افسانہ وکٹر ہیوگو کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ منٹو نے افسانے کو اپنے انداز سے پیش کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ روسی ادبیات کے ساتھ ساتھ منٹو کے ذہن پر فرانسیسی ادبیات کے اثرات بھی مرتسم تھے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے مشہور ادبی ماہنامے

"ہمایوں" لاہور کا ایک خوب صورت فرانسیسی ادب نمبر (برائے ستمبر ۱۹۳۵) مرتب کیا۔ اس سے پہلے وہ اسی رسالے کا روسی ادب نمبر مرتب کر چکے تھے۔

فرانسیسی ادب نمبر میں کئی نامور ادیبوں اور قلم کاروں کے مضامین اور ترجمے شامل ہیں۔ اس میں منٹو کے قلم سے جو مضامین اور ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ ان کی تفصیل یوں ہے:۔

۱۔ انیسویں صدی کے مشہور فرانسیسی انشا پرداز۔ (مضمون)

۲۔ والٹیر ——— (مضمون)

۳۔ موپساں اور ٹالسٹائی کا نظریہ فنون لطیفہ۔ (مضمون)

۴۔ وکٹر ہیوگو اور مسئلہ سزائے موت۔ (مضمون)

۵۔ وکٹر ہیوگو کی چند نظمیں ——— (ترجمہ)

- اگر میرے اشعار کے پر ہوتے
- لوری
- محبت
- نقاب کشائی
- عوام کا تحمل

۶۔ ایک گیت ——— از گوئٹے (ترجمہ)

۷۔ آنسو ——— از پال ورلین (،)

متذکرہ بالا ترجموں کے علاوہ "انیسویں صدی کے مشہور فرانسیسی انشا پرداز" کے عنوان سے منٹو نے ایک اور تعارفی مضمون قلم بند کیا ہے۔ اس میں انہوں نے گزشتہ صدی کے عظیم فرانسیسی نثر نگاروں کا ذکر کیا ہے اور ان کے کارناموں کا تعارف کرایا ہے۔ ان میں خصوصی طور پر چارلس آگسطن، سین بوو، ہانری دی بالزک، گسطاو فلابرٹ، ایمل زولا، تھیوفل گوتئے، چارلس بادلیئر، پال ورلین، کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اس طبع زاد مضمون میں فرانس کے بڑے پائے کے انشا پردازوں کے بارے میں بنیادی خصوصیات کا اندازہ

ہوتا ہے اور ساتھ ہی بعض دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ چند توضیحات ملاحظہ ہوں :-

- ۱۸۴۲ء میں بالزک نے (HUMAN COMADY) لکھنے کی ایک اسکیم تیار کی۔ اس کا ارادہ یہ تھا۔ جیسا کہ وہ خود بیان کرتا ہے "میں انسانی دلوں کی ایک تاریخ مرتب کرنا چاہتا ہوں۔" چنانچہ بالزک نے ہیومن کامیڈی سپرد قلم کی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب لکھنے کا خیال اُسے ڈینٹے کی ڈیوائن کامیڈی کا مطالعہ کرنے کے بعد پیدا ہوا۔

ہانری دی بالزک

- فلابرٹ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے الفاظ کی نشست اور ان کی خوب صورتی پر بہت توجہ دیا کرتا تھا۔ وہ خوبصورت طرزِ نگارش کا اتنا مشتاق اور دلدادہ تھا کہ آخر میں اس نے نفسِ مضمون کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

گسٹاو فلابرٹ

- زولا کا مقصد اپنے وقت کی صحیح تصویر کشی کرنا تھا۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی تصانیف میں صرف انسانی کمزوریوں اور برائیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ زولا کی طرز نگارش بہت بلند نہیں ہے مگر اس کے مختصر افسانوں میں ہمیں اس کے تخیل کے نادر نمونے ملتے ہیں۔ جنہیں ادب میں بہت ممتاز جگہ حاصل ہے۔

ایمل زولا

- میوسط کے افکار سحر انگیز، مترنم اور رومان آفریں ہیں۔ یہی وہ سحر خیز قدرت تھی۔ جس نے اسے اپنے زمانے کا بہترین شاعر بنا دیا۔ اس کے گیت خالص حسن کی وجہ سے فرانسیسی شاعری کے گوہر تصور کئے جاتے ہیں۔

الفرد دی میوسط

تھیوفل گوتئے

• گوتئے کا آرٹ خواہ وہ نظم کی صورت میں ہو یا نثر کی صورت میں بالکل یونانی ہے۔ دراصل وہ یونانی آرٹ کا بہت دلدادہ تھا۔

آرٹ اور صرف آرٹ کی تخلیق گوتئے کا منتہائے نظر تھا۔

چارلس باؤلیئر

• باولیئر کی شاہراہ دوسرے شاعروں سے بالکل مختلف تھی۔ وہ خوشبوؤں کا شاعر تھا اور تصویروں سے اسے کوئی نسبت نہ تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا —— "میری روح خوشبوؤں پر تیرتی ہے۔ جیسا کہ دوسرے لوگوں کی موسیقی پر" اس کے اکثر اشعار پیچیدہ ہونے کے سبب سے ناقابل فہم ہیں۔

پال ورلین

• ورلین کے پیش نظر صرف اپنی پراسرار روح کے غم اور خوشیاں بیان کرنا تھیں۔ لیکن وہ جس چیز کا بھی اظہار کرتا ہے خواہ محبت کے گیت ہوں یا شراب کی مدح، خواہ ہسپتال یا جیل کے افکار ہوں یا اپنے گناہوں، خوابوں یا اپنی جہالتوں کا ذکر—— یہ سب ایسے سُریلے اور شریں اشعار میں بیان کئے گئے ہیں کہ روح بے اختیار وجد کرنے لگ جاتی ہے۔

ان اور ایسی ہی دوسری توجیہات کے مطالعے سے منٹو کے وقتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ منٹو نے ترجموں کے ہی توسط سے سہی فرانسیسی ادب کا مطالعہ کیا تھا اور جبھی انہیں ان میں سے بعض نمایندہ نمونوں کو اردو میں منتقل کرنے کا خیال آیا ہوگا۔ اس مختصر سے تعارفی مضمون کے مطالعے سے یہ بات مترشح ہو جاتی ہے۔ کہ منٹو شروع سے ہی ادب کا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ اور کسی بھی ادب پارے کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کو اپنے مذاق کے مطابق پرکھنے اور اس پر رائے دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ان کی جوانی کا آغاز تھا اور اس سے قبل ان کی نوجوانی کے شب و روز بالکل بے کار

مشاغل میں گزر چکے تھے۔ کبھی کبھی منٹو کے پورے تخلیقی سفر کے مختلف پڑاؤ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ان کا جستہ جستہ مطالعہ کرنے سے عجیب وغریب اور حیرت زا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ یہ نوجوان اردو ادب سے قطع نظر ترجموں کے توسط سے عالمی ادب کے وسیع سرمائے کو کھنگھالتا ہے۔ اور اس میں بالخصوص روسی اور فرانسیسی ادب کے شعر و نثر سے متاثر ہوتا ہے اور صرف جذباتی حد تک ہی متاثر نہیں ہوتا۔ ان کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی سعیٔ جمیل کرتا ہے۔ ان سے اثرات قبول کرتا ہے اور اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بنالیتا ہے۔

جنیوین ادیبوں پر لکھتے ہوئے منٹو کا قلم کبھی نہیں تھکتا۔ وہ اس زمانے میں بھی کہ وہ منٹو کی تخلیقی اور تعینفی زندگی کا سرآغاز تھا اپنے قلم کے کھرے پن کا احساس دلاتا ہے جو ہمیشہ ان کی تحریروں کا اصل جوہر رہا۔ والٹیر جیسے عظیم فن کار کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے منٹو اسے اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر، مفکر، تمثیل نگار حتیٰ کہ المیہ تمثیل نگاری کا بادشاہ قرار دیتا ہے۔ ایک اقتباس :-

"والٹیر کے آہنی قلم نے آسمانی صحیفوں پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ اس کے ذہن نے مذہب، فلسفے اور تاریخ کے میدانوں کو اپنی جولاں گاہ بنایا۔ نثر، نظم، تاریخ، افسانہ، رومان اور تمثیل میں ہر جگہ والٹیر مذہب کی مخالفت کرتا ہے۔ کلیسا، حکومت کی گاڑی کا سب سے مضبوط گھوڑا تھا۔ والٹیر کی بید زنی سے وہ ادھ موا ہوگیا۔ حکومت کی گاڑی رک گئی مگر والٹیر اسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکا۔"

منٹو کا ایک اہم مضمون "موپساں اور ٹالسٹائے کا نظریۂ فنون لطیفہ" ہے۔ موپساں فرانس کا بے مثال اور غالباً اپنے عہد کا بہترین افسانہ نگار ہوا ہے۔ وہ ایک شاعر بھی تھا۔ اور اس نے کوئی نصف درجن بلند مرتبہ ناول بھی لکھے۔ لیکن اس کا حاصلِ حیات اس کے افسانے ہیں۔ جن کے باعث وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

موپساں کی نظر حیرت ناک حد تک انسانی سیرت کی اندرونی تہوں تک پہنچ جاتی تھی۔ اس کا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کو پیش کرتے ہوئے بالکل معروضیت اور علیحدگی اختیار کرتا ہے۔ جیسے اسے اس زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ لاتعلقی اسے بڑا فن کار بناتی ہے۔ اردو کے کہانی کاروں میں غالباً منٹو موپساں کے سب سے زیادہ نزدیک رہے۔ بعد میں ان کے افسانوں میں موپساں ہی کی طرح انسان کی وحشت اور اس کی حیوانیت مختلف صورتوں میں سامنے آتی ہے۔ یہ موضوعات ان کے شروع کے موضوعات سے مختلف ہیں۔ ممتاز شیریں کے مطابق یہ مساوی رویہ ہے۔ لکھتی ہیں:۔

"زندگی اور انسان کو اور انسان کے وحشیانہ ہیجانی جذبات کو
عریاں کرنے میں اور اپنی تحریروں سے دھچکا پہنچانے میں
منٹو کا رویہ موپساں کی طرح مساوی ہے۔"

ہمیں یہاں رویئے کی اس مماثلت کے حوالے سے منٹو اور موپساں کا موازنہ کرنا مطلوب نہیں۔ غرض صرف یہ کرنا ہے کہ فرانسیسی ادب میں منٹو بالخصوص موپساں سے بہت زیادہ متاثر تھے۔

منٹو موپساں کو ایک صاحب طرز سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق موپساں اپنے دوست فلابرٹ کی طرح ایک بڑا فن کار تھا۔ جسے ہمیشہ اپنی بات کے اظہار کے لئے موزوں الفاظ کی تلاش رہتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ وہ ہر جگہ غیر ضروری الفاظ کے استعمال سے احتراز کرتا ہے۔ ممتاز شیریں کے مطابق موپساں کے پاس جسم ہے اور چیخوف کے پاس روح ہے یعنی موپساں جہاں فطری اور ہیجانی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے جن کا تعلق جسم ہے وہاں چیخوف انسانی روح کی ٹیسوں کا نباض ہے اس خیال کا اظہار بہت پہلے منٹو نے زیر بحث مضمون میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"موپساں کی نظر انسان میں حیوانی جذبات دیکھتی ہے اور چیخوف
انسانیت کے عمیق ترین گڑھوں میں محبت اور امید تلاش کرتا
ہے۔"

لیکن اس سے قطع نظر موپساں کے بارے میں منٹو نے جس طرح کے خیالات کا اظہار اس مضمون میں کیا ہے۔

ناقدین نے اسی طرح کے خیالات کا اظہار خود منٹو کے بارے میں کئے ہیں ایک اقتباس:۔

"موپساں کے آرٹ کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ نیکی کو بدی پر ترجیح نہیں دیتا نہ وہ ایک کردار کو دوسرے کردار پر برتری بخشتا ہے۔ اور نہ وہ اپنی حکایت بیان کرتے ہوئے درمیاں میں ٹھہر کر زندگی کے معنی پر بحث کرنا شروع کرتا ہے۔ دراصل اس کا مقصد، مقصد وحید اپنے مشاہدات بیان کرنا ہے۔ اس کی طرز نگارش بہت سادہ مگر پر معنی ہے۔ وہ پھیکے سے پھیکے لفظ بھی استعمال میں لے آئے گا۔ اگر وہ اس کی تصویر میں صحیح نقش کا کام دے سکتا ہے۔"

منٹو کے ساتھ بھی معاملہ اس سے مختلف نہیں۔

اس بات سے قطع نظر منٹو وضاحت سے اس کے بعد دونوں فن کاروں یعنی ٹالسٹائی اور موپساں کے نظریات فن کے مباحث چھیڑتے ہیں۔ منٹو کے نزدیک ٹالسٹائی کی نظر میں صرف وہی دماغ تخلیق آرٹ کا درجہ پا سکتی ہے جو متعدی (INFECTIOUS) ہو یعنی وہ اپنے خالق کے احساسات دوسرے دماغ پر منتقل کر سکے۔ اس طرح وہ ہر اس پارۂ صنعت کو آرٹ تسلیم کرنے سے یکسر منکر ہے جو ناقابل فہم ہو۔ ٹالسٹائی آرٹ کو حسن کاری، خوب صورت اشیاء کا پیدا کرنا، ایک کھیل یا ذریعۂ مسرت قرار نہیں دیتا۔ اس کے مطابق آرٹ ایک ذریعۂ اتحاد ہے۔ اس کا نظریہ اخلاقی ہے۔ وہ موپساں کے موضوعات کو اس لئے پسند نہیں کرتا کہ وہ اس کے نزدیک اخلاقی طور پر غیر درست ہیں۔ مگر اس کے باوصف وہ اس کی تحریروں کو اس لئے پسند کرتا ہے۔ کہ اس کے افکار میں بھی وہ تعدیہ (INFECTION) بدرجۂ اتم موجود ہے جس کے بغیر وہ آرٹ کو آرٹ نہیں سمجھتا۔ ٹالسٹائی موپساں پر وہی اعتراضات کرتا ہے جو شروع کے دور میں خود منٹو پر کئے گئے تھے۔ اس کے باوصف یہ بات اپنی جگہ تسلیم ہے کہ زیر بحث مضمون میں منٹو

نے ٹالسٹائی اور موپساں کا ایک اچھا موازنہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ منٹو اگر زندہ رہتے اور اسی انداز کو برقرار رکھتے تو ادب شناسی کا ان کا اپنا ایک منفرد انداز ہوتا جسے یقیناً قابل اعتنا سمجھا جاتا۔

ذکر ہو چکا ہے کہ فرانس کے جن فن کاروں سے منٹو متاثر ہوئے تھے۔ ان میں وکٹر ہیوگو سرفہرست ہے۔ وکٹر ہیوگو کو منٹو سے ان کے مرشد غلام باری نے متعارف کیا تھا۔ اور ان ہی کی ترغیب پر منٹو نے ہیوگو کی کتاب کو اردو میں منتقل کیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ترجمہ ہوئی کتاب — "ایک اسیر کی سرگزشت" وکٹر ہیوگو نے اپنی جلاوطنی سے قبل پیرس کے مقام پر ہی قلم بند کی تھی۔ اس کا موضوع "سزائے موت" سے متعلق ہیوگو کے خیالات ہیں۔ ہیوگو ایک زبردست ماہر نفسیات تھا۔ وہ معاشرے میں موجود اخلاقی پستیوں سے واقف تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنے قلم سے اس ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کی جو سرمایہ دار طبقے نے پیدا کیا تھا۔ ہیوگو کے لئے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اس معاشرے میں جب سرمایہ دار طبقہ سزائے موت کا فتویٰ دیتا ہے تو مجرم کے جذبات کیا ہوتے ہیں، یہی باتیں ایک مجرم کی زبان سے کہلوائی ہیں۔ منٹو، ہیوگو کے تصورات کو اپنے مضمون میں یوں بیان کرتے ہیں :-

> یہ کتاب لکھتے وقت اس کے پیش نظر کتابِ قانون کا سیاہ ترین ورق تھا۔ جس میں متفقہ طور پر موت کی سزا کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ ہیوگو سزائے موت کو عدل و انصاف کی رو سے غداری سمجھتا ہے اور تنسیخ سزائے موت کے جواز میں بہت سے قاطع دلائل و براہین پیش کرتا ہے جس کے علاوہ وہ تنسیخ سزائے موت کے معاشرتی و مجلسی اسباب پر بحث کرتے ہوئے ثابت کرتا ہے کہ معاشرہ کو کسی شخص کو اس چیز سے محروم کر دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ جو وہ عطا نہیں کر سکتی۔"

منٹو نے اپنے اس مضمون میں اس کتاب کے موضوع کے بارے میں کھل کر بحث کی ہے منٹو کا خیال ہے کہ وکٹر ہیوگو نے یہ کتاب اس لئے لکھی تا کہ انسانی حقوق کا یہ مقدمہ سوسائیٹی کے

سامنے پیش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں کسی خاص فرد کا ذکر ہے نہ کسی خاص مقام کا۔ خاص جرم کا نہ خاص قاتل کا اور نہ ہی کسی خاص عدالت کا۔ اس کتاب کے مطالعے سے سزائے موت کے تصور سے ہی نفرت ہو جاتی ہے اور اس کا پیغام ایک یونیورسل اپیل اختیار کرتا ہے۔ منٹو کے مطابق وکٹر ہیوگو کا مقصد اس ناول کے ذریعے سزائے موت کے وجود کو دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا ہے۔ اور اس شجر کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔ جسے انقلاب کی تند موجیں تباہ نہیں کر سکیں۔ غرض منٹو وکٹر ہیوگو کی تعریف میں رطب اللسان ہے اور اس کے نظریے کی حمایت کرتے ہیں۔

منٹو نے وکٹر ہیوگو کی نظموں کو بھی اردو کا لباس پہنایا ہے۔ منٹو کے مطابق ہیوگو کے الفاظ میں ایسا لوچ اور ایسا ترنم ہے کہ روح وجد کرنے لگتی ہے۔ اتنا ہی نہیں اس کی شاعری میں افکار کی پاکیزگی اور گہرائی ہے۔ وہ حسن کی طرف ایک بوالہوس کی طرح نہیں دیکھتا۔ بلکہ اس کی نظروں میں طہارت ہے۔ منٹو ہیوگو کی شاعری میں محبت کے ایسے رس کا احساس کرتا ہے جس میں خدا کا قرب ہے اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے وکٹر ہیوگو کی ایک نظم اردو ترجمے کے نمایندہ اشعار پر اکتفا کرتا ہوں جو منٹو کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں اور ان کی ادب شناسی کے ساتھ ساتھ ان کی ترجمہ کاری کے فن کا ایک گوشہ کھول دیتی ہیں ؂

شام کی تاریکی کاجل کی طرح برسنے لگی ـــ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں چلے گئے۔
دریا کا پانی ساکن ہو گیا ـــ لوگوں کی آمد و رفت بند ہو گئی
لیکن میں بدستور وہیں بیٹھا اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا ـــ
" محبت کیا چیز ہے ؟ محبت کیا چیز ہے ؟
یکایک میری نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں
بادلوں میں سے کوئی جھانک کر کہہ رہا تھا۔
محبت خدا ہے ـــ خدا محبت ہے "

میرے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا ہوش میں آنے پر میں

نے لوگوں کو اپنے گرد گھیرا ڈالے ہوئے پایا ـــــ میں اُن سے کہہ رہا تھا۔

"محبت کرو اور خدا ہو جاؤ"

(محبت)

منٹو ایک بے حد چلبلے اور سیمابی طبیعت کے فن کار تھے۔ وہ بے حد خلاق ذہن کے مالک تھے انہوں نے جس مٹی کو ہاتھ لگایا اسے پارس بنا دیا۔ فرانسیسی ادبیات سے دلچسپی بھی دراصل ان کے عالمی ادب کے نمایندہ نمونوں کے مطالعے کا نتیجہ تھا۔ لیکن جس دل جمعی سے انہوں نے روسی ادبیات کے بعد فرانسیسی ادب کا مطالعہ کیا۔ اور اس کے نمایندہ نمونوں کو اردو کے قارین کے لئے سمیٹ لیا۔ وہ ان کے جودت ذہن، فکر رسا اور ایک جینوین ادیب ہونے کا سب سے بڑا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ قطع نظر اس حقیقت کے کہ اردو فکشن کو انہوں نے کون سے لعل و گوہر دے کر مالا مال کیا۔

منٹو اور رُوسی ادب

یہ سعادت حسن منٹو کی خوش نصیبی تھی کہ نوجوانی کے ان ایام میں جب وہ چرس اور شراب کی محفلوں میں قمار بازی سے اپنے بے کل دِل کو بہلایا کرتے تھے کہ ان کی ملاقات غلام باری سے ہوئی۔ جو اشتراکی ادیب تھے اور باری (علیگ) کے نام سے ادبی حلقوں میں معروف تھے۔ باری ہندوستان میں اُسی طرح کے انقلاب کے خواب دیکھا کرتے تھے جس نے روس کے زارشاہی نظام کو ہلا کر ایک نئے سماج کی بنیاد ڈالی تھی۔ باری نے اس بھٹکے ہوئے نوجوان کے ذہنی اضطرار کو پہچان لیا اور ساتھ ہی ان صلاحیتوں کو بھی پہچانا جو منٹو کی ناآسودگی کے پس پشت مضمر تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اس نوجوان کے آوارہ جنوں کی تہذیب کی اور انہیں قمار بازی اور آوارہ گردی سے ہٹا کر اچھے راستے پر ڈالنے کی کوشش کی۔ یہ باری (علیگ) کا ہی کرشمہ تھا کہ جو منٹو پہلے کالم نگاری اور صحافت کی طرف متوجہ ہوئے اور بعد میں ترجمہ کاری کے فن کی طرف مایل ہوئے۔ باری کی تحریک سے ہی منٹو نے وکٹر ہیوگو اور اسکر وائلڈ کے ایسے ڈراموں کا ترجمہ اردو میں کیا جو اشتراکی تصورات پر استوار تھے۔ یہ کتابیں "پھانسی — ایک اسیر کی سرگزشت" اور "دیرا" کے نام سے ۱۹۳۳-۳۴ء کے آس پاس شایع ہوئیں۔ منٹو کے یہ ترجمے

خود منٹو کے تخلیقی سفر کے لئے مفید ثابت ہوئے۔ اس لئے کہ ان ترجموں کی اشاعت نے انہیں نہ صرف آگے بڑھنے کا اعتماد دیا بلکہ وہ ترجمہ کاری کی طرف بھی مایل ہوئے۔ لیکن اب وہ باری (علیگ) کی اس معمولی اصلاح سے مطمئین نہیں تھے۔ کیونکہ اب زیادہ اعتماد کے ساتھ وہ تصنیف وتالیف کی طرف لگ گئے تھے۔ باری صاحب کی زبان دانی پر اب انہیں زیادہ بھروسہ نہیں رہا تھا۔ اسی سبب سے انہوں نے اپنا دوسرا ترجمہ مشہور شاعر اختر شیرانی کے سامنے اصلاح کے لئے رکھا۔ اختر شیرانی نے مسودے کی زبان کی صحت کے ساتھ اس کی نوک پلک سنواردی اور ترجمے کی مجموعی طور سے تعریف کی۔ یہ کتاب جب چھپ کر آگئی تو امرتسر کی چھوٹی سی ادبی دنیا میں ایک بھونچال سا آگیا۔ خاص طور سے جب اس کتاب کے اشتہار جعلی حروف میں امرتسر کی دیواروں پر چسپاں ہوگئے اور پولیس حرکت میں آئی۔ جدت پسند منٹو کا یہ تجربہ بڑا دلچسپ تھا۔ ان کے دل میں پہلی بار خواہش پیدا ہوئی کہ انہیں اس ترجمے کی پاداش میں جیل بھیج دیا جائے۔ مگر منٹو کے دل میں کلبلاتی ہوئی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ ان کے ایک نزدیکی رشتہ دار پولیس افسر کی مداخلت سے نہ منٹو گرفتار ہوئے اور نہ کتاب ضبط ہوئی۔

منٹو کے پورے ذہنی عمل اور ردعمل کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ محرکات تھے جنہوں نے منٹو کو روسی ادبیات کی طرف متوجہ کیا اور وہ روسی ادب کو اردو میں منتقل کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ۱۹۳۴ء میں پہل کی اور "ویرا" کے ساتھ ساتھ "روسی افسانے" شائع ہوئی۔ اس کتاب میں روس کے مندرجہ ذیل مشہور مصنفین کے افسانے شامل ہیں جن کو اردو روپ دینے کا سہرا سعادت حسن منٹو کے سر ہے:۔

۱۔	افناسیف	سیاہی اور موت
۲۔	لیوطالسطائی	شراب اور شیطان / تین سوال
۳۔	چیخوف	خادمہ / ایثار
۴۔	میکسم گورکی	مزدور کی شکست
۵۔	سلوگب	پتھر کی سرگذشت / مساوات

۶۔ چیریکوف — جادوگر

اس طرح سے اس مجموعے میں نو روسی افسانے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ وکٹر ہیوگو کا افسانہ "ماہی گیر" اور منٹو کا اولین طبع زاد افسانہ "تماشا" بھی اس میں شامل ہیں۔ ان افسانوں میں بعض افسانے پہلے ہی ماہنامہ "ہمایوں" لاہور میں شایع ہو چکے تھے۔ روسی افسانے کا مقدمہ باری علیگ نے لکھا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۴ء میں شایع ہوئی لیکن چونکہ اس کے بعض افسانے پہلے ہی "ہمایوں" میں شایع ہو چکے تھے جس سے منٹو کے اس رجحان کا اندازہ ہوتا ہے جو روسی ادب کے تئیں منٹو پر حاوی تھا۔ یہ بات اس لئے بھی اہم ہے کہ ابھی ہندوستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ لہذا اس بات کو ماننے میں کوئی تامل نہیں کہ منٹو اجتماعی یا انفرادی طور پر ترقی پسندوں کی کسی دماغی صفائی (BRAIN WASH) سے روسی ادب کے پھیلاؤ اور توسیع کا کام نہیں کر رہے تھے۔ اس زمانے میں منٹو نے کامریڈ اور مفکر کے فرضی نام اختیار کر لیئے تھے اور ان کے متعدد مضامین انہی ناموں سے شایع ہوتے تھے۔ اسی زمانے کے آس پاس جب وہ علی گڑھ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے تو اپنے آپ کو انقلابی کہلوانے میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ سردار جعفری جب اسی دوران ایک مشاعرے کے سلسلے میں علی گڑھ گئے تو منٹو کے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی اس ملاقات کی جو روداد سردار نے لکھی ہے اس کے مطالعے سے منٹو کی ذہنی افتاد کا پتہ چلتا ہے۔ سردار لکھتے ہیں:

" جب میں مشاعرے کے بعد باہر نکلا تو ایک انتہائی ذہین آنکھوں اور بیمار چہرے کا طالب علم مجھے اپنے کمرے میں یہ کہہ کر لے گیا کہ — "میں بھی انقلابی ہوں" اس کے کمرے میں وکٹر ہیوگو کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی اور میز پر چند دستوں کے ساتھ اس کی اپنی تصویر تھی۔ جس کی پشت پر گورکی کا ایک اقتباس لکھا ہوا تھا۔ یہ سعادت حسن منٹو تھا۔ اس نے مجھے بھگت سنگھ پر مضامین پڑھنے کے لئے دیئے اور وکٹر ہیوگو اور گورکی سے آشنا کیا"
(لکھنؤ کی پانچ راتیں، ص ۲۹)

یہ منٹو تھا جو سردار کو ہیوگو اور گورکی سے آشنا کراتا ہے۔ اور بعد میں روسی ادب کی توسیع میں سردار سے زیادہ کارنامے انجام دیتا ہے۔

منٹو علی گڑھ میں زیادہ عرصہ نہ رہ سکے۔ انہیں دق کا مریض قرار دیا گیا اور ان کو یونیورسٹی چھوڑنا پڑی۔ بٹوٹ کے سینی ٹوریم اور امرتسر کی گلیوں میں چند مہینے گذار کے وہ لاہور کی سڑکوں پر تلاش معاش کے لئے خاک چھاننے لگے۔ تب وہ شعور کی کئی منزلیں طے کر چکے تھے۔ اب نہ قمار بازی کے اڈے تھے اور نہ شراب نوشی کے حلقے۔ لیکن رشتہ داروں کی بدسلوکی میں اضافہ ہوا تھا۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا منٹو کی والدہ جوان کی دوسری بیوی تھیں مفلس اور قلاش ہو چکی تھیں ۔ چاروں طرف بھائیں بھائیں کرتی ہوئی ناداری تھی۔ سعادت ذہنی خلفشار کے شکار ہوئے اور روزی روٹی کی تلاش انہیں لاہور لے آئی۔ بڑی جدو جہد کے بعد انہوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ اسی دوران انہوں نے ماہنامہ "ہمایوں" اور "عالم گیر" کے روسی ادب نمبر مرتب کیئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "آتش پارے" کے عنوان سے شایع ہوا۔ یہ افسانے منٹو کے بعد کے افسانوں سے بالکل مختلف ہیں اور ان میں انقلاب کی آگ دہکتی ہوئی ملتی ہے۔ دیباچے کے طور پر منٹو کی صرف یہ عبارت درج ہے:۔

"یہ افسانے دبی ہوئی چنگاریاں ہیں۔ ان کو شعلوں میں تبدیل
کرنا پڑھنے والوں کا کام ہے"۔

یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں شایع ہوئی۔ لیکن جن شعلوں کا ذکر منٹو نے "آتش پارے" میں کیا۔ ان کو خود ہی انہوں نے ہوا دی۔

روسی ادب سے منٹو کی دلچسپی کا اولین اظہار ماہنامہ "ہمایوں" لاہور کے شمارہ بابت مئی ۱۹۳۵ء کے صفحات میں ملتا ہے۔ یہ ہمایوں کا روسی ادب نمبر ہے۔ مرتب کی حیثیت سے منٹو کا کہیں ذکر نہیں۔ البتہ اس شمارے کے آخیر میں "خاتمہ" کے عنوان سے جو تحریر درج ہے وہاں یہ اعتراف ملتا ہے:۔

"شکریہ ـــــ چیخوف کی تصویر کے لئے ہم مسٹر سعادت حسن منٹو

کے مضمون ہیں مسٹر سعادت حسن نے روسی نمبر کے لئے مضامین
لکھنے اور فراہم کرنے میں جو کام کیا ہے وہ ان کی غیر معمولی الوالعزمی
اور محنت کشی کا شاہد ہے اور ہم اس کے لئے ان کو خاص طور پر
شکریہ ادا کرتے ہیں"۔

(ہمایوں مئی ۱۹۳۵ء، ص ۳۴۴)

اس نمبر میں علاوہ دوسری چیزوں کے منٹو کے جو ترجمے ملتے ہیں ان کی فہرست یوں ہے:۔

۱۔ روسی ادب پر ایک طائرانہ نظر	(مضمون)	سعادت حسن منٹو	
۲۔ پیاری ہے مجھے	(نظم)	ویلیری برسوف	مترجمہ سعادت حسن منٹو
۳۔ نسبت	(ڈراما)	چیخوف	" "
۴۔ بوسے سے انکار	(نظم)	میکوف	" "
۵۔ مال	(افسانہ)	ایلقم زوزولیا	" "
۶۔ حقیقت	(نظم)	ٹالسٹائی	" "
۷۔ راہبہ	(نظم)	ولیڈیمر ولیڈیمیریلیف	"
۸۔ زار روس اور اس کے وزرا کے نام کھلی چٹھی		ٹالسٹائی	" "
۹۔ خدا کی مرضی ۱۰۔ مسحور شہزادہ	(ماخوذ کہانیاں)	روسی لوک ادب سے	"
۱۱۔ پشکن	(مضمون)	سعادت حسن منٹو	
۱۲۔ ایثار	(افسانہ)	ترگنیف مترجمہ سعادت حسن منٹو	

یہ ترجمے منٹو کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔

منٹو کا ایک اہم مضمون روسی ادب پر ایک طائرانہ نظر اس خصوصی شمارے کی زینت ہے۔ اس

مضمون میں روسی ادبیات سے متعلق ایک تعارفی نوٹ پیش کیا گیا ہے اور طالسطائی، دستوو سکی، ٹی ہنن، کو پرن، ولیری برہوف، ای چیریکوف، اینڈی بیلی، نیکوف، سلوگب، گورکی، لیونڈ اینڈرلیف، میکوف، نیڈسن، این لیکوف، ولیڈ میر کورولنکو، چیخوف، گارشن وغیرہ کے بارے میں اجمالی ذکر کیا گیا ہے۔ اسی مضمون کی بنیاد پر لبعد میں منٹو نے ایک طویل اور مبسوط مضمون لکھا اور دوبارہ شایع کیا۔ اس کے علاوہ پشکن پر ان کا ایک طبع زاد مضمون بھی اس شمارے میں شامل ہے۔ اردو حلقوں میں پشکن کو متعارف کرتے ہوئے منٹو لکھتے ہیں:۔

"پشکن کا سحر فطری ہے وہ ایک معمولی چیز کو ایسے پُر از شعریت وجد آفرین انداز میں بیان کرتا ہے جو صرف اسی کا حصہ ہے۔ یہ سحر آفرین قوت پشکن کا ایجاد کردہ سنگ پارس تھی جس نے اس کے ہر شعر کو کندن ایسی تابانی بخشی ہے ـــــ پشکن کے کلام میں آورد کو بالکل دخل نہیں۔ اس کے اشعار پڑھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے تمام افکار آمد کا نتیجہ ہیں۔"

(ہمایوں روسی ادب نمبر ص ۴۲۱)

اس اقتباس سے منٹو کے انداز نظر کا بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ اچھے شعر کو کیسے پرکھتے ہیں۔

اس نمبر میں منٹو نے روسی افسانوں اور نظموں کو اردو میں منتقل کر کے روسی ادب کے چھوٹے سے دفینے کا دریچہ پہلی بار کھولا ہے۔ اس زمانے میں ان کے دو اور اہم ترجمے شاہکار لاہور میں شایع ہوئے۔ (۱) سنگتراش کا روزنامچہ از الگزینڈر کپرن دو قسطوں میں (شاہکار لاہور اکتوبر، نومبر ۱۹۳۵) (۲) سوویٹ کا سندباد جہازی از لیطروف (شاہکار اگست ۱۹۳۵)

ہمایوں کے بعد منٹو نے ماہنامہ "عالمگیر" لاہور کا روسی نمبر مرتب کیا۔ یہ نمبر ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اس ضخیم نمبر کے ہر صفحے پر منٹو کی چھاپ ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت منٹو کی عمر صرف ۲۲ سال کی تھی اور لاہور کی صحافتی دنیا میں تاجور نجیب آبادی، مظفر حسین شمیم، صلاح الدین احمد، مولوی حامد علی خان، لالہ کرم چند پارس اور دوسرے کئی سرکردہ لوگ تھے اور ادبی اور نیم ادبی جرائد نکال رہے تھے۔ ان کے

سامنے منٹو کی حیثیت طفلِ مکتب کی سی تھی۔ لیکن منٹو نے اپنے کارنامے سے اکابرینِ صحافت سے لوہا منوایا حتیٰ کہ مظفر حسین شمیم کو اعتراف کرنا پڑا :-

"اس وقت جو اصحاب ترجموں کے ذریعے سے اردو کو مالا مال کرنے میں مصروف ہیں ان میں میرے نوجوان باہمت اور ہونہار دوست مسٹر سعادت حسن منٹو کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ موصوف نے صرف ایک ملک (روس) اور اس ملک کی زبان (روسی) کے لٹریچر کو اپنا خاص موضوع قرار دیا ہے۔ چنانچہ ان کے قلم سے روسی افسانوں کے ترجمے اردو رسایل میں شایع ہو کر بالعموم اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

ماہنامہ ہمایوں کے روسی ادب نمبر کی ترتیب و تدوین میں رسالہ مذکور کے لایق ایڈیٹر اور میرے عزیز دوست مولوی حامد علی خان صاحب کا سب سے زیادہ مسٹر سعادت حسن منٹو نے ہی ہاتھ بٹایا تھا اور اب انہوں نے عالمگیر کا روسی نمبر مرتب کیا ہے۔"

(عالمگیر روسی نمبر ص ۲)

یہ بات مدِ نظر رہے کہ زیرِ بحث زمانہ اردو افسانے کا عبوری دور تھا۔ پریم چند، یلدرم، سدرشن، مجنوں، نیاز، جوش اور کئی اور لوگوں کی کوششوں سے نثر کی ایک نئی صنف افسانہ نگاری کا آغاز ہوا تھا۔ لیکن ابھی یہ صنف بحیثیت مجموعی گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔ اس کی کونپلیں نہیں پھوٹی تھیں۔ اس کے مقابلے میں یورپ میں افسانہ نگاری کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اور افسانہ نگاری کا فن کئی مرحلے طے کر کے ارتقا کی بلندیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ افسانہ نگاری کے میدان میں جو تجربے ہوئے تھے یا ہو رہے تھے ان سے اردو کے قارئین واقف تھے نہ افسانہ نگار۔ اس زمانے میں کئی انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان سامنے آئے جن کی مساعی سے کئی یورپی زبانوں کے افسانوں کو اردو میں منتقل کیا گیا۔ پروفیسر مجیب، عبد القادر سروری،

منصور احمد، جلیل قدوائی، حامد اللہ افسر اور کئی دوسرے لوگوں نے اس سلسلے میں قابل قدر کام کیا۔ منٹو کا نام انہی اہل قلم حضرات کی فہرست میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہماری ادبی تواریخ کی کوتاہی ہے کہ منٹو کا نام ایسے لوگوں کے ساتھ نہیں لیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ منٹو اردو کے پہلے مترجم تھے۔ جنہوں نے روسی ادب کو اپنا موضوعِ خاص بنا کر شدومد کے ساتھ نہ صرف روسی افسانوں کو اردو میں منتقل کیا بلکہ روسی شاعری اور روسی ادب پر بھی اظہار خیال کیا اور طویل اور مبسوط مضامین قلم بند کیئے۔ جو اس زمانے کے رسایل میں شایع ہو کر مقبول ہوئے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ یہ کافی حد تک منٹو کی مساعی کے طفیل تھا کہ اردو کے قارئین گورکی، ٹالسٹائی، پشکن، چخوف، ترگنیف، سلوگب، دوستووسکی وغیرہ کے کارناموں سے متعارف ہوئے۔ اس زمانے کے مشہور سیاسی کارکن کامریڈ فیروز الدین منصور نے اس بات کا اعتراف یوں کیا ہے:۔

> "طالسطائی، پوشکن، دوستویسکی، چخوف اور میکسم گورکی سے ہندوستانی قارئین ایک حد تک آشنا ہیں۔ مسٹر سعادت حسن منٹو اور ان کے دیگر رفقاء کار روسی افکار کو اردو میں منتقل کرنے کا ایک قابل قدر کام کر رہے ہیں"
>
> (عالمگیر روسی نمبر ص ۵)

عالمگیر کے اس نمبر میں سب سے اہم مضمون اس کا تعارف ہے۔ بائیس صفحات پر مشتمل اس مضمون میں سعادت حسن منٹو نے روسی ادب پر بالعموم اور روسی ادیبوں پر بالخصوص بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔ یہ مضمون مصنف کی محنت اور ریاضت کا واضح ثبوت ہے۔ اس تعارفی مضمون کو تیار کرتے ہوئے منٹو نے روسی ادبیات سے متعلق گہرا مطالعہ کیا ہے اور کئی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ مضمون میں روسی ادب کے آغاز و ارتقاء سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور خاص طور پر پشکن، گوگول، ٹالسٹائی۔ دوستووسکی، ترگنیف، گارشن، چخوف، گورکی، چیریکوف، کپرن، سلوگب، لیونائیڈ اینڈریف وغیرہ کے فنی کارناموں کا احاطہ کیا ہے۔ منٹو نے روسی ادب میں افسانے کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے اور روسی فکشن کے موضوعات پر بحث کی

ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے روسی ادب پر منٹو کی نظر کا اندازہ ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک اچھا ناقد بننے کی صلاحیت بھی ان میں تھی اگر وہ اس شعبے کی طرف متوجہ ہوتے۔ روسی ادب کا ذکر کرتے ہوئے منٹو لکھتے ہیں کہ روسیوں کا بنیادی موضوع انسان ہے اور انسان کے خیالات، احساسات اور جذبات کی ترجمانی روسی ادب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"روس کو مغربی تہذیب کا آخری بچہ کہتے ہیں۔ روس کی نشاۃ الثانیہ مغربی ممالک سے دو سو سال بعد شروع ہوئی۔ تاہم روس نے ایسے ادیب و مفکر پیدا کیے ہیں۔ جن پر فکر انسان، بجا طور پر نازاں ہے۔ مختصر افسانہ نگاری روسی ادب کا بہت بڑا جزو ہے۔ دراصل افسانہ نگاری کی صنف میں قابل تحسین طریق پر طبع آزمائی کی ہے۔

...... روسی ادب ناول (ROMAN) مختصر ناول (POVTEST) اور کہانی (RAZSKA) میں منقسم ہے ـــ روسی افسانوں اور ڈراموں میں حیاتِ انسانی اور نظام عالم کے متعلق غور و فکر کے شواہد پائے جاتے ہیں۔ قصے کا موضوعِ بحث عموماً انسان ہوتا ہے۔ انسان کے باہمی تعلقات، اس کے خیالات و جذبات، میلانات و رجحانات، عزائم و مقاصد، رنج و غم، کشمکشِ حیات اس کی جدوجہد اور اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے بحث ہوتی ہے۔"

(عالمگیر روسی نمبر ص ۳۰)

اس مضمون کے لئے منٹو نے بہت سی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس فہرست کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مضمون کے آخر میں "اعتذار" کے ذیلی عنوان سے جو عبارت درج ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ منٹو علالت کے باعث مضمون مکمل نہیں کر پائے ہیں اور سوویٹ ادب پر مجموعی طور پر انہوں نے نہ ہونے کے برابر اظہارِ خیال کیا ہے۔ جس کی تلافی وہ آیندہ مضمون میں کرنا چاہتے ہیں۔ اس کلیدی

مضمون کے علاوہ اس شمارے میں سعادت حسن منٹو کے مندرجہ ذیل ترجمے شامل ہیں :۔

۱۔	قیدی	(نظم)	از لیرمنطوف
۲۔	میکسم گورکی کی تصانیف پر ایک نظر	(مضمون)	از سعادت حسن منٹو
۳۔	کُتا	(افسانہ)	ترگنیف
۴۔	تمنا	(نظم)	پشکن
۵۔	خنجر	(نظم)	لیرمنطوف
۶۔	تین سوال	(افسانہ)	طالسطائی
۷۔	تسکین دہ خواب	(افسانہ)	سلوگب
۸۔	تمنا	(نظم)	اناطول کریمیلیف
۹۔	چکر	(افسانہ)	سلوگب

"میکسم گورکی کی تصانیف پر ایک نظر" منٹو کی کتاب "منٹو کے مضامین" میں بھی شامل ہے۔ یہ مضمون جیسا اس کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے گورکی اور اس کے کارناموں کو متعارف کراتا ہے۔ یہ مضمون اس خاص نمبر کا غالباً سب سے اہم مضمون ہے اور اس میں ناقد منٹو واضح طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی منٹو کے خیالات اس قدر منجھے ہوئے نہیں ہیں جس قدر ایک منجھے ہوئے ناقد سے توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ تنقید کی "لفظیات" سے بھی بہتر طور پر واقف نہیں کہ جس سے وہ اپنے خیالات کو آراستہ کر سکیں لیکن مضمون کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں۔ ان کے یہاں بعض خیالات راسخ ہو چکے ہیں اور ان خیالات کو اپنے مطالعے کی روشنی میں بساط بھر انہوں نے پیش کیا ہے۔ گورکی کا یہ مطالعہ، اہم بھی ہے اور مبسوط بھی۔ منٹو کافی تفصیل میں گئے ہیں اور گورکی کو اپنے صحیح سیاق میں سمجھانے کی سعی کی ہے۔ منٹو خالی خولی جذباتی ادیب نہیں۔ ان کی ایسی تحریریں جو انہوں نے زندگی کے آخری ایام میں لکھیں اور جو افسانہ نہیں ہیں ٹھوس اور وزن دار ہیں۔ وہ دلایل پیش کرتے ہیں اور اپنی بات کے لئے جواز تلاش کرتے ہیں۔ وہ صرف بیان نہیں دیتے کہ ان سے کھوکھلے پن کا اظہار ہو۔ افسانہ نگار

منٹو اگر اس میدان میں قدم رکھتے تو ان کی بات سے اغماض برتنا ناممکن بن جاتا۔ اس مضمون سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) "گورکی کی صدا چخوف کی شائستہ، نرم و نازک اور منجھی ہوئی آواز نہیں نہ وہ معلم اخلاق طالسطائی کی کمزور زاہدانہ صدا ہے۔ وہ چنگھاڑتے ہوئے شیر کی ایک گرج ہے، چمکتی ہوئی بجلی کی کڑک ہے"

(ص ۸۲)

(۲) "وہ دنیا جو گورکی اپنے افسانے میں پیش کرتا ہے۔ ہماری دیکھی بھالی نہیں ہے اور وہ کردار جو اس کے افسانوں کے محرک ہیں ہم ان سے ناآشنا ہیں مگر اس کے باوجود کہ ہم اس سرزمین کے جغرافیائی حالات کے سوا کچھ نہیں جانتے گورکی ہمیں ان گہرائیوں تک لے جاتا ہے اور روسی زندگی کی ایک ایسی قلمی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے جس سے عکسی تصاویر عاجز ہیں"۔

(ص ۸۲)

(۳) "پریوں، فرشتوں، ناقابل فہم نوجوانوں اور لڑکیوں کی کہانیاں ان کی نظروں میں بالکل مہمل نظر آتی ہیں۔ وہ اسے بخوبی سمجھتے ہیں کہ ایسے واقعات پردۂ ظہور پر ہرگز نہیں آتے ہیں۔ مغربی کرداروں کی صفات پر تھکا دینے والی بھاگ دوڑ کو وہ بچوں کے لئے ایک کھیل سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ گورکی کے قوت بیان کو سمجھنے کی خاطر اس فرق کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا ازبس ضروری ہے"۔

(ص ۸۹)

منٹو نے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے گورکی کی مختلف تصانیف سے حوالے دیئے ہیں اور یہ بات

ثابت کی ہے کہ گورکی اپنے عہد کا سب سے بڑا حقیقت نگار تھا۔

اس نمبر میں شامل مضامین، افسانے یا نظمیں بالاستثنائے چند چیزوں کے منٹو کے کسی مجموعے میں نظر نہیں آتے۔

"منٹو کے مضامین" منٹو کی ایک علیحدہ تصنیف ہے۔ اس میں روسی ادب سے متعلق ان کے دو مضامین شامل ہیں:-

(۱) میکسم گورکی کی تصانیف پر ایک نظر

(۲) سرخ انقلاب

گورکی کی تصانیف پر ایک نظر ان معدودے چند مضامین میں سے ہے جس کی مکرر اشاعت اس کتاب میں ہوئی ہے۔ لیکن "سرخ انقلاب" کے عنوان سے تحریر کیا ہوا مضمون ایک مختلف مضمون ہے۔ یہ مضمون روس اور روسی انقلاب کے بارے میں ایک مختصر مگر جامع جائزہ ہے۔ جس میں روسی انقلاب کے چند پہلو سامنے لائے گئے ہیں۔ اس مضمون میں موقعے کی مناسبت کے اعتبار سے کئی اعلیٰ پائے کی روسی تصانیف کا ذکر آیا ہے اور روسی انقلاب کے تعلق سے چند ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

روسی ادبیات کے تعلق سے منٹو کا ایک مضمون "اشتراکی شاعری" ہے۔ یہ مضمون بھی ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ "شاعر" آگرہ کے سالنامہ بابت ۱۹۳۷ء میں شایع ہوا ہے۔ مضمون طبع زاد ہے اور منٹو کے ذہن کی اس کارفرمائی کا واضح ثبوت ہے جب وہ اشتراکیت کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں وہ اشتراکیوں کو طنزاً "سرخا" نہیں کہتے تھے۔ بلکہ وہ سوویٹ روس اس کے نظامِ فکر اور نظامِ زندگی کے مداح خواں تھے۔ اس مضمون کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:-

"سوویٹ لٹریچر جو اشتراکیت کی تعمیر اور تاسیس کا رفیع الشان تخیل پیش کرتا ہے اس بنا پر لاکھوں اور کروڑوں مزدوری پیشہ افراد کو اپنے دامِ الفت میں گرفتار کر چکا ہے اور آپ پوچھیں تو وہ کون سی چیز

کا استحقاق بھی رکھتا ہے۔ اس لئے کہ سوویٹ ادب ناکارہ اور کاہل الوجود لوگوں کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا لٹریچر ہے جو ملک وقوم کے اشتراکی نظام کی ترفیع چاہتا ہے .... سوویٹ روس کے ادب کا مطالعہ کرنے کے بعد قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ سرمایہ داروں کا یہ خیال بالکل باطل ہے کہ جب گولے برستے ہیں تو تخیل خاموش ہو جاتا ہے ...... ارض احمر کے سرخ قلموں کی ہر جنبش اس تیقن پر خط تنسیخ کھینچتی ہے ....."

(شاعر آگرہ سالنامہ ۱۹۲۷۔ ص ۲۰)

اس میں شک نہیں کہ یہ ایک نہایت ہی مختصر مضمون ہے اور اس میں روس کی اشتراکی شاعری کا مبسوط اور سیر حاصل تجزیہ پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ معدودے چند شاعروں کی تخلیقات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ ان میں خاص طور پر، وی لگووسکی، نیکولائی تخونوف، یاروسلاو سملیاکوف، الیگزانڈر بلوک وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ یہ روس کی اس زمانے کی اشتراکی شاعری کا تعارف ہے۔ جو ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے شروع ہوئی تھی لہذا اس میں منٹو کی کوتاہیاں قابل فہم ہیں۔ لیکن یہ مضمون منٹو کے ذہن کا ایک واضح اشاریہ ہے کہ وہ روس کی پرانی شاعری کے مقابلے میں نئی اور خون میں ابال پیدا کرنے والی شاعری کا کس درجہ استقبال کرتے ہیں۔ منٹو کے احساسات ملاحظہ ہوں:۔

"سرمایہ پرست سوسائیٹی اس امر کی مدعی رہی ہے کہ مزدوری پیشہ جماعت میں تخلیقی قوت نہیں ہوتی۔ اس لئے آرٹ، کلچر لٹریچر اور تکنیک کے میدان میں وہ ہمیشہ ناکام رہے گی۔ لیکن روس کی موجودہ حیرت خیز ترقیوں کو دیکھنے کے بعد یہ دعوی بالکل ثابت ہو جاتا ہے کہ مزدوری پیشہ جماعت نقش کہن مٹانے کے ساتھ ساتھ نئے نقش بھی پیدا کر سکتی ہے جب نکولائی تخونوف کی زبان میں ؎

آگ، دارورسن، گولیوں اور کلہاڑیوں نے
غلاموں کی طرح ہمارے آگے سر جھکا دیئے
اور ہمارے پیچھے پیچھے چلی آئیں
ہر بوند میں ایک طوفان سو رہا تھا
کنکریوں کی بڑی بڑی چٹانیں بن گئیں
اور ہر وہ شاخ جو پاؤں کے نیچے روندی گئی تھی
ایک شور افگن جنگل بن گئی
سکوں کی قدر و قیمت اور ان کی کھنکھناہٹ غائب ہو گئی
لاشیں بچوں کے دلوں میں ڈر پیدا نہ کر سکیں"

(شاعر آگرہ سالنامہ ۱۹۴۷ ص ۱۹)

وقت گزرنے کے ساتھ منٹو نے اپنے تخلیقی سفر کا دھارا موڑ دیا اور اپنے لئے ایک نئی سمت اختیار کی۔ انہوں نے اپنی ساری توجہ افسانہ نگاری اور ڈراما نگاری کی طرح مبذول کی اور کسی زمانے میں جو موضوع انہیں عزیز تھا اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ وہ باضابطہ طور پر ترقی پسند تحریک کے ساتھ وابستہ نہیں رہے۔ اگرچہ وہ ان حلقوں میں عزت اور توقیر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے اور ان کے رسالوں میں ان کے افسانے شائع ہوتے تھے۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں برابر شریک ہوتے رہے۔ لیکن آخر میں قیام پاکستان کے دوران انجمن کے دروازے ان کے لئے بند کر دیئے گئے۔ ترقی پسندوں کی انتہا پسندی نے انہیں اذیت پہنچائی اور سرکار نے یکے بعد دیگرے کئی مقدمے ان پر چلائے انہیں گندہ ذہن، عریاں نویس، لطیفہ باز اور رجعت پسند کہا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "آتش پارے" (افسانوں کا مجموعہ) نیا قانون اور نعرہ جیسی کہانیاں لکھنے والا اپنے لئے ایک نیا راستہ ڈھونڈھ نکالتا ہے۔ یہ راستہ انوکھا، منفرد اور سب سے علیحدہ تھا۔ منٹو نے جنس، طوائف، سادیت اور ماسکیت کے مارے ہوئے مرد اور عورتیں اپنے مطالعے کا موضوع بنائیں۔ اور

ہندوستانی سماج کے مسخ شدہ کرداروں کو پورے خلوص، ایمان داری اور تہہ داری کے ساتھ پیش کرنے لگے۔ اردو ادب کا کوئی بھی کہانی کار آج تک اس میدان میں ان کی ہمسری نہ کر سکا۔ زندگی کے ایسے دنوں میں جب وہ ترقی پسندوں سے بدظن تھے اور انہیں رجعت پسند قرار دے کر انجمن سے خارج کر دیا گیا تھا۔ سعادت حسن منٹو روس اور روسی ادب کی جاندار اور صحت مند روایات کو نہیں بھولتے۔ پاکستان چلے جانے کے بعد وہ پھر مضامین لکھنے لگتے ہیں۔ اس دوران بھی اشتراکیت کے جنم داتا کارل مارکس پر وہ ایک فیچر نما مضمون تحریر کرتا ہے اور اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتا ہے:۔

"وہی اشتراکیت جس کے ساتھ یورپ کی متعدد طہارت پسند قوموں نے ایک فاحشہ کا سا سلوک کیا۔ وہی اشتراکیت جو ننگِ حسن اور ننگِ انسانیت یقین کی جاتی تھی۔ آج روس کے وسیع و عریض میدانوں میں بیمار انسانیت کے لئے امید کی ایک کرن بن کر چمک رہی ہے۔ یہ وہی اشتراکیت ہے جس کا نقشہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے کارل مارکس نے تیار کیا قابلِ احترام ہے۔ یہ انسان جس نے اپنی ذات کے لئے نہیں اپنی قوم کے لئے نہیں، اپنی نسل کیلئے نہیں، اپنے ملک کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے، ساری انسانیت کے لئے، مساوات اور اخوت کا ایک ایک ذریعہ تلاش کیا۔

{ کارل مارکس
تلخ، ترش، شریں
ص ۱۱۶ }

آج منٹو کو پھر سے ایک بڑا افسانہ نگار تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ اس کا اعتراف کسی زمانے

کے ان ترقی پسندوں کو بھی ہے جنہوں نے منٹو کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ وہ رجعت پسند ہیں اور جنس نے ان کے یہاں مذہب کی جگہ حاصل کی ہے۔ منٹو کی جدت پسندی، فن کاری اور زرخیزی ذہن کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ادب کے جس شعبے میں ہاتھ ڈالا وہاں بنجر زمینوں میں گلاب کھلائے روسی ادب کو اردو کے قارئین تک پہنچانے میں ان کی سعیٔ جمیل کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی ان کا بذات خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ○

منٹو کی ایک نایاب تحریر

اس بات کا سب کو علم ہے کہ مشہور ہندوستانی ڈاکٹر رستم خان نے مجھے اپنا متبنّٰی قرار دیا اور میں اُن کی وفات کے صرف ایک گھنٹے بعد غریب اور محنتی دوا فروش سے ایک متمول انسان بن گیا۔ بعض حضرات صاحبِ موصوف کے اس فعل کو دیوانگی تصور کرتے ہیں کیونکہ مجھ ایسے دور کے رشتہ دار کے علاوہ کئی ایسے افراد موجود تھے جو اس دولت کے مالک بن سکتے تھے۔ مگر میں یقین دلا سکتا ہوں کہ یہ فعل کسی دیوانگی کا نتیجہ نہ تھا اور یہ بھی یقین دلا سکتا ہوں کہ مجھے ڈاکٹر صاحب سے اُن کی زندگی کے آخری ایام میں ملاقات کرنے کا موقع ملا اور بعض ایسی وجوہ تھیں جن کی بنا پر انہوں نے مجھے اپنی دولت کا واحد مالک قرار دیا۔ اگر میں خود اپنے مُنہ سے ان وجوہ کو بیان کروں تو شاید آپ اُسے اپنے منہ میاں مٹھو بننے کے مترادف خیال کریں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے لئے جو خدمات انجام دیں وہ ہر شخص سے ممکن نہ تھیں اور ان سے آپ کو آگاہ کرانا میرا فرض ہے کیونکہ شاید اس طرح ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے۔ میری باتوں پر یقین کرنا آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔

سر رستم خان۔ سی' بی' کے' سی' ایس' آئی اور خدا معلوم کیا کیا کچھ 'ہندوستان میں اپنے زمانے کے بہترین جراح اور ڈاکٹر مانے گئے تھے۔ وہ کلکتہ میں دیر تک سرکاری ملازم کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔ اورینٹل ہاسپٹل کی بنیاد بھی انہی کے مساعیٔ جمیلہ کی مرہونِ منت ہے۔

شب و روز کی متواتر محنت و مشقت کے بعد ایک ایسا دن آیا جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ اب اپنے کام اور طبی تحقیق کو جاری نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ زندگی کے باقی ماندہ ایام کو آرام سے گزارنے کی خاطر انہوں نے کلکتے کو خیر باد کہی اور اپنے وطن مالوف بمبئی کو روانہ ہو گئے۔

بمبئی پہنچ کر انہوں نے اپنی سکونت کے لئے باندرے کے قریب ایک کشادہ کوٹھی خرید لی۔ جہاں وہ اپنا بیشتر وقت مطالعہ میں صرف کرنے لگے۔

اپنے متمول اور بے اولاد رشتے دار کی آمد کی خبر ہمارے کنبہ بھر کے لئے ایک دلچسپ خبر تھی۔ اُن دعوت ناموں سے جو ڈاکٹر صاحب نے اپنے مختلف رشتے داروں کے نام بھیجے ہم پر یہ بات روشن ہو گئی کہ اُن کے دل میں ہماری یاد ابھی تک باقی ہے۔

گو سب سے آخر مجھ کو طلب کیا گیا جس کا مجھے قدرتی طور پر رنج تھا مگر چونکہ ڈاکٹر صاحب کو رنجیدہ کرنا مقصود نہ تھا اور مجھے بھی اُن سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ میں اپنی بیوی سے اجازت لے کر اُن کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔

گاڑی میں ایک گھنٹے کے سفر کے بعد میں اپنے چچا کے مکان پر پہنچ گیا۔ اُن کا خادم مجھے مطالعہ کے کمرے میں لے گیا۔ جہاں وہ انگیٹھی کے قریب ایک صوفے پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔

کمرے میں کسی کی آہٹ پا کر وہ یکلخت چونک پڑے اور میرا گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا ——— اُن دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے جو مجھے دیکھ رہی تھیں' یہی معلوم ہوتا تھا گویا وہ میرے سینے کے اندر داخل ہو کر میرا جائزہ لے رہی ہیں۔

اُن کے جسم سے جو اب محض ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی زمانہ میں قوی الجثہ ہوں گے۔ اُن کی غیر معمولی مضطرب نگاہوں سے یہ پتہ چلتا تھا کہ اُن کی زندگی سے کوئی ایسا

اہم واقعہ ضرور متعلق ہے۔ جس نے اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے اور اُن کے جسم کو آہستہ آہستہ دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔

پچا کے استقبال کی گرمجوشی نے مجھے ایک گھنٹے کے عرصے کے اندر اندر ہی اُن سے بے تکلف کر دیا۔ کھانے میں اُن کی بیوی بھی ہمارے ساتھ شریک ہوئیں۔

اُن کی بیوی کی نگاہوں میں بھی اضطراب کی وہی لہر جھلکیاں لے رہی تھیں۔ میں سخت متعجب تھا۔ کہ وہ کونسا ایسا اہم واقعہ ہو سکتا ہے جس نے ان دونوں کو یکساں مضطرب کر رکھا ہے!

باتوں باتوں میں مافوق الفطرت قصوں کا ذکر آگیا۔ چونکہ مجھے ایسی باتوں سے نفسیات کا ایک طالب علم ہونے کی وجہ سے گہری دلچسپی تھی۔ میں نے اُن سے وہ واقعات بیان کئے۔ جن میں مجھے اکثر اوقات مافوق الفطرت اشیاء سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ جب میں نے ان سے یہ بیان کیا کہ ایسے محیر العقول واقعات مجھے خوفزدہ کرنے کے بجائے ایک دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں تو وہ میری گفتگو کو بڑی توجہ سے سننے لگے۔

گفتگو کے دوران میں ڈاکٹر صاحب نے کئی بار اپنی بیوی کی طرف پُر معنی نگاہوں سے دیکھا مگر میں اس کا صحیح مطلب سمجھنے سے قاصر رہا۔

جب ڈاکٹر صاحب کی بیوی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں تو انہوں نے مجھے ایک سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔ "مسٹر نیاز! گو مجھے آپ سے بہت کم گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے۔ مگر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی وہ شخص ہیں جس کی مجھے ایک عرصے سے تلاش تھی۔

میں نے اپنے چچا کے یہ تعریفی الفاظ سن کر کہا "یہ آپ کا حُسن ظن ہے۔"

"اگر میں یہ کہوں کہ آپ ایک قوی دل کے مالک ہیں تو اس کو خوشامد سے تعبیر نہ کیجئے گا کیونکہ اس قسم کے تکلفات ایسے نازک موقع پر استعمال نہیں کئے جا سکتے ۔۔۔ ہاں! تو چونکہ آپ کو ایسی چیزوں سے لگاؤ ہے اور آپ اُن کا فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے مطالعہ کیا کرتے ہیں۔ کیا میں یہ خیال کر سکتا ہوں کہ کوئی بھوت یا آوارہ روح آپ کو خوفزدہ نہیں کر سکتی؟"

"میرا خیال تو یہی ہے جناب!"

"بلکہ وہ نظارہ آپ کے لئے دلچسپ ہوگا"

"بڑی حد تک"

اس پر انہوں نے ایک لمبی آہ بھری۔

مسٹر نیاز! یقین کیجیے گا' ایک وقت تھا جب میں بھی آپ کی طرح کسی چیز سے خائف نہ ہوتا تھا۔ قوی دل ہونے کے باعث میں کلکتہ بھر میں مشہور تھا ___ مگر اب میں وہ نہیں رہا۔ خدا کے لئے اس معاملے میں جرأت سے کام نہ لیجئے۔ ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو وہی کڑا امتحان دینا پڑے گا جس نے آج کل مجھے عاجز کر رکھا ہے ___ ایسا امتحان جس کا انجام پاگل خانہ یا قبر کی چار دیواری ہے!"

تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد وہ اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "چند سال سے ایک مہیب اور ناقابل تسلیم واقعے نے میری اور میری بیوی کی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔ گو وہ واقعہ ہر روز پیش آتا ہے لیکن اُس کا اعادہ ہماری تاب برداشت میں اضافہ نہیں کر سکا۔ اگر آپ کو کوئی چیز خوفزدہ نہیں کر سکتی تو میں اس معاملے میں آپ کی رائے کو بہت قیمتی خیال کروں گا۔"

"میری ناچیز رائے ہر وقت آپ کے لئے حاضر ہے مگر مجھے معاملے کی نوعیت تو معلوم ہونی چاہیئے۔" میرا اشتیاق حد سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔

"اس واقعہ کی تفصیلات سننے سے پیشتر کیا آپ میرے ساتھ دوسرے کمرے تک چلنے کی تکلیف گوارا فرما سکتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ مجھے دار التجربہ میں لے گئے جو لاتعداد آلاتِ جراحی اور بے شمار بوتلوں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک میز پر شیشے کے مرتبان جن میں مختلف قسم کے حیوانی اعضا محفوظ تھے۔ ایک قطار میں سجے ہوئے تھے۔

"مرتبانوں کی قطار دیکھی آپ نے! ___ یہ اُس قیمتی مجموعے میں سے صرف چند ہیں۔ جو خوش قسمتی سے میرے کلکتے کے مکان کی آتشزدگی کے بعد باقی بچ گئے تھے۔ یہ نقصان ہر طرح میرے لئے ناقابلِ تلافی ثابت ہوا ہے۔"

میں نے اُن مرتبانوں کی طرف دوبارہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے جمع کردہ اعضاء کیڑے مکوڑے اور مختلف اقسام کی ہڈیوں جو مرتبانوں میں بڑی نفاست سے محفوظ رکھی تھیں، واقعی بیش قیمت ہیں۔

تھوڑی دیر کمرے میں ٹہلنے کے بعد ڈاکٹر صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔" میں بہت ممنون ہونگا اگر آپ آج کی رات اسی کمرے میں قیام فرمائیں ـــــ اور اگر آپ کسی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے تو بلا تامل مجھ سے کہہ دیجیے۔"

مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً ہی کہا۔" اس کے بالکل برعکس! میں بالکل تیار ہوں"

"میرا کمرہ آپ کے دائیں طرف ہے۔ اگر آپ کو کسی وقت میری ضرورت محسوس ہو تو میں صرف ایک آواز پر حاضر ہو جاؤں گا۔"

میں نے اپنے چچا کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔" مجھے یقین ہے میں آپ کو ہرگز ایسی تکلیف نہ دوں گا۔"

"مگر یہ ناممکن ہے کہ مجھے نیند آجائے ـــ میں بہت کم سوتا ہوں۔ اس لئے ضرورت کے وقت مجھے بلانے میں تامل نہ کیجیے گا" یہ تاکید کر کے ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔ یہ کمرہ یعنی ڈاکٹر صاحب کا دارالتجربہ، کسی طرح بھی سونے کے لئے موزوں نہ تھا۔ قسم قسم کی بوتلیں مرتبانوں کی قطار جن میں خدا معلوم کن کن حیوانوں کے اعضاء رکھے تھے۔ سپرٹ اور دیگر ادویہ کی تیز بو فضا کو بہت مکدر بنا رہی تھی کھڑکی پر کوئی پردہ نہ تھا۔ اس لئے چاند کی سیمیں کرنیں آزادانہ کمرے کی دیوار پر پڑ رہی تھیں۔

میں نے لیمپ کو گل کر دیا، کیونکہ چاند کی روشنی کمرے کے لئے کافی تھی۔ اب کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا۔ میں نے شب خوابی کا لباس پہنا اور کسی حادثے کی توقع سے خالی الذہن ہو کر صوفے پر لیٹتے ہی سو گیا۔

کمرے میں کسی کی آہٹ سن کر میں بیدار ہوا۔ مجھے سوتے ہوئے غالباً تین چار گھنٹے ہو گئے تھے کیونکہ چاند کی روشنی کا وہ دھبہ جو دیوار پر تھا۔ اب وہاں سے ہٹ کر میرے صوفے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس آہٹ کی جستجو میں کمرے کے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں مگر تاریکی کی وجہ سے مجھے کچھ نظر نہ

آیا۔ آہستہ آہستہ جب میری نظریں تاریکی کی عادی ہو گئیں تو میرے بدن میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ جب میں نے کسی چیز کو کمرے میں حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ اس چیز کے چلنے سے ایک مدھم شور پیدا ہو رہا تھا جو فضا کو اور بھی بھیانک بنا رہا تھا ——— ! وہ چیز ایک انسانی جسم تھا جو دروازے کی جانب سے کمرے میں دبے پاؤں چلا آ رہا تھا۔

جب وہ سایہ نما انسان چاند کی روشنی کے درمیان آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک متوسط قد کا آدمی ہے جو سر سے پیر تک ایک سپید لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔

چاند کی روشنی میں اُس کا چہرہ ایک مہیب منظر پیش کر رہا تھا۔

وہ ان مرتبانوں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھا جن میں مختلف قسم کے انسانی اعضاء پڑے ہوئے تھے وہاں پہنچ کر اُس نے میری طرف نگاہیں اٹھائیں، تھوڑی دیر ٹھہرا اور نا امیدی سے اپنے ہاتھ اوپر کی طرف اٹھائے نظروں سے غائب ہو گیا ——— ہاتھ نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بازو اوپر کی طرف اٹھائے کیونکہ اس حالت میں میں نے اس کے بائیں ہاتھ کو اپنی جگہ سے غائب پایا۔ چونکہ میں نے اس نظارہ کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا اور اس شخص میں کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی جو خلافِ فطرت ہو اس لئے پہلے پہل میں نے یہی خیال کیا کہ شاید وہ ڈاکٹر صاحب کا خادم ہو گا۔ جو غلطی سے اس کمرے میں چلا آیا ہے۔

مگر جب وہ یکایک میری نظروں سے غائب ہو گیا تو میں فوراً اپنی جگہ سے اچھلا اور لیمپ جلا کر تمام کمرے کو چھان مارا۔ جب اس شخص کا کوئی پتہ نہ چلا تو قدرتی طور پر مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اس شخص کی پُر اسرار گمشدگی واقعی غیر فطری اور عقلِ انسانی کی حدود سے باہر ہے۔

میں نے شب کا باقی حصہ جاگتے ہوئے کاٹا لیکن اس قسم کا کوئی واقعہ پھر پیش نہ آیا۔

میں صبح جلد بیدار ہونے کا عادی ہوں لیکن مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب مجھ سے کہیں زیادہ سحر خیز تھے کیونکہ وہ علی الصباح ہی صحن میں پورا لباس پہنے ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بھاگے ہوئے آئے اور کہنے لگے۔ "ہاں! ہاں! بتایئے کیا آپ نے اُسے دیکھا؟"

"ایک ہاتھ والے انسان کو؟"

ڈاکٹر صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں اُسی کو"

"جی ہاں میں نے اُس شخص کو اچھی طرح دیکھا ہے" اور یہ کہنے کے بعد میں نے رات والا واقعہ من وعن بیان کر دیا۔ جب میں اپنی کہانی سُنا چکا تو وہ مجھے اپنے مطالعے کے کمرے میں لے گئے اور مجھے کرسی پیش کرتے ہوئے بولے؟۔

"قبل اس کے کہ اس محیر العقول واقعے کی تفصیلات بیان کی جائیں مجھے امید ہے کہ آپ پر وہ وجوہ روشن ہو گئی ہونگی۔ جو میرے ذہنی تلاطم اور جسمانی کمزوری کا باعث ہیں۔ ہر روز اس شخص کا یہی مشغلہ ہے ــــــ دروازے کے قریب سے ظاہر ہوتا ہے۔ میرے کاندھوں کو پکڑ کر زور سے ہلاتا ہے اور پھر مرتبانوں کی قطار کے پاس جا کر نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔"

میں نے حیران ہو کر کہا۔ "لیکن آخر یہ چاہتا کیا ہے؟"

"اپنا کٹا ہوا ہاتھ"

"ہاتھ"

"ہاں! ہاں! اپنا ہاتھ ــــــ واقعہ یوں ہے کہ کلکتہ میں میرے پاس ایک مریض آیا جس کا ہاتھ بُری طرح زخمی ہو رہا تھا۔ چونکہ اس کا علاج ناممکنات میں سے تھا اور یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ زخم بڑھ کر دوسرے اعضا کو بھی نقصان نہ پہنچائے۔ میں نے اُس سے کہا۔ دیکھو بھئی! بہتر یہی ہے کہ تم برضا ورغبت اپنا ہاتھ کٹوا ڈالو ــــــ بہت سمجھانے بجھانے کے بعد وہ راضی ہو گیا۔

عمل جراحی کے بعد اُس نے مجھ سے میری فیس کے متعلق سوال کیا۔ بیچارہ بالکل فقیر سا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُس سے مذاق کرتے ہوئے کہا کہ میری فیس تمہارا ہاتھ ہے۔ جسے میں اپنے دار التجربہ کی ایک بوتل میں بند کر رکھوں گا۔ یہ سُن کر وہ بہت سٹپٹایا اور کہنے لگا۔ مذہب ہمیں بتاتا ہے کہ قیامت کو جسم دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اس لئے میرا کٹا ہوا ہاتھ میرے پاس رہنا ضروری ہے۔ اس پر میں نے اُسے کٹا ہوا ہاتھ دکھایا اور پوچھا کہ تم اُسے کس طرح حفاظت سے رکھ سکو گے۔ تمہارے پاس تو ایسی دوائیں ہی نہیں۔ چنانچہ بہت بحث کے بعد وہ اپنا ہاتھ اس شرط پر میرے پاس چھوڑ گیا کہ میں

اسے انتہائی حفاظت سے رکھونگا ——— وہ شخص چلا گیا اور تھوڑے عرصے کے بعد ہی یہ معاملہ میرے ذہن سے اتر گیا۔ اس شخص پر عمل جراحی کرنے کے چند ماہ بعد میرے مکان کو آگ لگ گئی جس میں اور بیش بہا چیزوں کے علاوہ وہ مرتبان بھی ضائع ہو گیا جس میں اُس کا ہاتھ محفوظ رکھا گیا تھا ——— پہلے پہل تو مجھے اس ہاتھ کے ضائع ہونے کا خیال بھی نہ آیا مگر ایک برس بعد میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ کسی نے مجھے زور سے جھنجھوڑا۔ میں بستر پر سے اٹھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ وہی مریض ایک بڑا سا لبادہ پہنے میرے سرہانے کھڑا ہے اور میری طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا ہے تھوڑی دیر کے بعد وہ مرتبانوں کے پاس آیا اور ان کو بغور دیکھ کر وہاں سے غائب ہو گیا ———

مسٹر نیاز! یہ ہے سارا قصہ۔ یہ وہی مریض ہے جو ہر شب اس مکان میں آتا ہے اور یہ وہی انسان نما بھوت ہے جس نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔

یہ تھی ڈاکٹر رستم خان کی کہانی ——— بعض حضرات کے نزدیک یہ واقعہ ناقابل یقین اور غیر ممکن ہوگا مگر مجھے ڈاکٹر صاحب کے بیان کی صحت کے متعلق کوئی شک وشبہ نہ تھا ——— اب میں نے دن کا بیشتر حصہ صرف اسی غور و فکر میں صرف کر دیا کہ ایسی تدبیر سوچوں جس سے یہ بلا ٹل جائے۔ چنانچہ شام کے وقت ایک نتیجے پر پہنچ کر میں نے اپنے میزبانوں کو یہ کہہ کر حیرت میں ڈال دیا کہ میں دوسری گاڑی سے پونا جا رہا ہوں۔

مسٹر نیاز! معلوم ہوتا ہے میں نے اس واقعے کو آپ سے بیان کرنے میں ایک سخت غلطی اور غیر میزبانانہ فعل کا ارتکاب کیا ہے ——— مجھے چاہیئے تھا کہ یہ سب بوجھ اپنے ہی کاندھوں پر رہنے دیتا۔"

ڈاکٹر صاحب آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے ——— میرا گھر واپس جانا اسی واقعے سے تعلق رکھتا ہے۔ میں تو ابھی آپ سے اجازت طلب کرنے والا تھا کہ آج کی رات بھی مجھے اسی کمرے میں سونے دیا جائے ——— میں اس غیر معمولی ملاقاتی کو ایک بار اور دیکھنے کی خواہش رکھتا ہوں۔"

چنانچہ میں وہاں سے رخصت ہو کر سیدھا پونا کے بڑے اسپتال میں گیا۔ جہاں میرا ایک دوست ہوس سرجن کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی اُس سے کسی مردے کا ہاتھ

طلب کیا چونکہ اُسے علم تھا کہ میں ہر وقت مختلف اقسام کے تجربوں میں مشغول رہتا ہوں۔ اس نے بغیر کچھ دریافت کئے مجھے ایک لاوارث مردے کا ہاتھ کاٹ کر لا دیا جو میڈیکل سکول کے لڑکوں کو عمل جراحی کی تعلیم دینے کی غرض سے اسپتال میں پڑا تھا۔

جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق تھا مجھے اس بات پر یقین تھا کہ وہ شخص اپنا ہاتھ واپس لینے کے لئے بیقرار ہے اور یہی بیقراری اُس کی روح کو آوارہ پھرا رہی ہے۔ اس لئے میں نے خیال کیا کہ شاید کسی دوسرے شخص کا ہاتھ اُس کو مطمئن کر سکے ـــــ یہ محض ایک خیال تھا اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے خود اپنے اس خیال پر ہنسی آتی تھی کہ میں ایسی مہمل سعی کر رہا ہوں۔

القصہ میں وہ ہاتھ لے کر ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچا اور انہیں اپنے مقصد سے بالکل آگاہ نہ کیا۔

جب میں سونے کے لئے اُس کمرے میں گیا تو میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اُس ہاتھ کو ایک مرتبان میں ڈال دیا ـــــ اب وہ ہاتھ قطار والے مرتبانوں میں سے ایک میں پڑا تھا۔ میں اپنی کوشش کا نتیجہ دیکھنے کے لئے اس قدر بے تاب تھا کہ بالکل نہ سو سکا۔ چنانچہ ایک سوفے پر بیٹھ کر میں نہایت بے چینی سے اس شخص کی آمد کا انتظار کرنے لگا ـــــ وہ آیا۔ وہی بڑا سا لبادہ پہنے ہوئے پہلی شب کی طرح وہ میرے قریب پہنچ کر ٹھٹکا مگر پھر وہ مرتبانوں کی قطار کی طرف بڑھا۔ اس کی نگاہیں اُس ہاتھ والے مرتبان کی طرف پڑیں۔ اُس نے مرتبان کو لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اٹھایا اور اٹھاتے ہی غصہ کی حالت میں اُسے زمین پر دے مارا ـــــ مرتبان کے گرتے ہی وہ غائب تھا۔

ابھی ایک منٹ بھی گزرنے نہ پایا ہو گا کہ ڈاکٹر صاحب بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور پوچھا "خیر تو گزری ـــــ کہیں چوٹ تو نہیں آئی ؟"

"نہیں صاحب! ـــــ نا امیدی کا سامنا ضرور کرنا پڑا ہے"

اب میں نے اُن کو اپنی کوشش اور اُس کے نتیجے کے متعلق سب کچھ سنا دیا۔ انہوں نے

میری گفتگو کو نہایت غور سے سنا مگر سر ہلاتے ہوئے بولے "آپ کی کوشش پر معنی ضرور تھی مگر میرا خیال ہے ہمیں اس معاملے کو سر دست یہیں چھوڑ دینا چاہیئے مبادا، کسی مہلک حادثے سے دوچار ہونا پڑے"۔

ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد صبح تک میں یہی سوچتا رہا کہ میری کوشش ناکام کیوں ثابت ہوئی؟ ـــــ بہت غور و فکر کے بعد میں نے زمین پر سے وہ ہاتھ اٹھایا۔ جو مرتبان کے شکستہ ٹکڑوں کے قریب پڑا ہوا تھا۔ ہاتھ اٹھاتے ہی میرے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی ـــــ وہ ہاتھ دایاں تھا اور اُس شخص کا بایاں ہاتھ کٹا ہوا تھا۔

صبح کی پہلی گاڑی میں میں پھر اُسی اسپتال کو گیا اور اپنے دوست سے اُسی لاش کا بایاں ہاتھ کٹوا کر اپنے ساتھ لیتا آیا مگر اب یہ دشواری بھی پیش آئی کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اُس کمرے میں سونے کی اجازت دینے سے قطعی انکار کر دیا۔

میں نے بہت منت سماجت کی مگر بے سود۔ چنانچہ میں نے اس ہاتھ کو پہلی طرح ایک مرتبان میں بند کر کے میز پر رکھ دیا اور آپ ایک دوسرے کمرے میں چلا آیا جو ڈاکٹر صاحب نے میرے سونے کے لئے تیار کر رکھا تھا۔

بھلا مجھے نیند کس طرح آتی۔ میرا دل تو اس تجربے کی طرف لگا ہوا تھا۔ رات کے کوئی دو بجے ہونگے جب ڈاکٹر صاحب شب خوابی کا لباس پہنے بھاگتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھے اُن کی غیر معمولی آمد پر اس قدر تعجب نہ تھا۔ جس قدر اُن کا چہرہ دیکھنے پر ہوا۔ وہ واقعی ایک جوان معلوم ہو رہے تھے۔ آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ اپنا ہاتھ ایک فاتحانہ انداز میں ہلا رہے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے چلا کر کہا۔

"ہم کامیاب ہو گئے ہیں ـــــ مسٹر نیاز میں کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں"

"کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ وہ معاملہ ختم ہو گیا! ـــــ یعنی وہ شخص راضی ہو گیا!"

"ہاں! ہاں! اب وہ کبھی نہ آئے گا ـــــ مسٹر نیاز! میں آپ کے اس احسانِ عظیم کا

معاوضہ کسی طرح ادا نہیں کر سکتا۔ بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ —— آپ نے نہ صرف مجھے اُس بلا سے نجات دلائی ہے۔ بلکہ میری بیوی کی جان کو بھی بچالیا ہے جو اس روز کے حادثے کی وجہ سے اندر ہی اندر گھلی جا رہی تھی —— میں آج سے پہلے ہرگز یقین نہ کر سکتا تھا کہ کوئی انسان مجھے اس مصیبت سے نجات دلا سکے گا۔"

ڈاکٹر صاحب سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ شخص حسب معمول رات کو اپنے وقت پر اُن کے پاس آیا، ان کو جھنجھوڑا اور اُس کے بعد اُس کمرے میں چلا گیا جہاں مرتبان پڑے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا۔ واپسی پر وہ غیر متوقع طور پر بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ وہ ان کے بستر کے قریب آیا اور تین بار جھک کر سلام کرنے کے بعد غائب ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ جب وہ سلام کرنے کے لئے تیسری بار جھکا تو اُس کا بایاں ہاتھ اپنی جگہ پر موجود تھا۔

چنانچہ یہ ہے وہ خدمت جس سے خوش ہو کر ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنی جائداد کا واحد وارث قرار دیا۔

—————— (ماخوذ از کانن ڈائل)

منٹو کا ادب

(منٹو کے کئی افسانے اور دوسری تخلیقات ان کے ایک سے زیادہ مجموعوں میں شامل ہیں۔ اس تکرار کے پیش نظر منٹو کی تخلیقات کی صحیح تعداد کا تعین کرنا ناممکن ہے۔ یہ دشواری اس لئے بھی پیدا ہوتی ہے کہ منٹو نے اپنی تخلیقات کئی فرضی ناموں سے بھی شایع کروائیں۔ وہ برسوں تک مفکر، کامریڈ سعادت حسن منٹو، خواجہ ظہیر الدین، برناڈ شاہ، آسکر وائلڈ، آدم وغیرہ کے فرضی ناموں سے لکھتے رہے۔ ان کا ایک فرضی نام ٹمنم بھی تھا جس کے حروف الٹ کر منٹو ہوتے ہیں۔
ذیل کی فہرست میں منٹو کے افسانوں اور دوسری تخلیقات کی ایسی تکرار کو حذف کر کے دستیاب تخلیقات کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔
تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم السطور کی کتاب سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے)

(ب۔ پ)

آتش پارے (۱۹۳۶ء)

۱۔ خونی تھوک

۲۔ انقلاب پسند

۳۔ جی آیا صاحب

۴۔ ماہی گیر (وکٹر ہیوگو سے ماخوذ)

۵۔ تماشا

۶۔ طاقت کا امتحان

۷۔ دیوانہ شاعر

۸۔ چوری

منٹو کے افسانے (۱۹۴۰ء)

۹۔ نیا قانون

۱۰۔ شغل

۱۱۔ ٹیڑھی لکیر

۱۲۔ پہچان

۱۳۔ شو شو

۱۴۔ خوشیا

۱۵۔ بانجھ

۱۶۔ نعرہ

۱۷۔ بلاوز

۱۸۔ ستہ نشین پر

۱۹۔ اس کا پتی
۲۰۔ موسم کی شرارت
۲۱۔ بیگو
۲۲۔ منتر
۲۳۔ میرا اور اس کا انتقام
۲۴۔ موم بتی کے آنسو
۲۵۔ دیوالی کے دیئے
۲۶۔ ہتک
۲۷۔ ڈرپوک
۲۸۔ دس روپے
۲۹۔ مسز ڈی کوسٹا

دھواں (۱۹۴۱ء)

۳۰۔ سجدہ
۳۱۔ کالی شلوار
۳۲۔ دھواں
۳۳۔ کبوتر والا سائیں
۳۴۔ الو کا پٹھا
۳۵۔ وہ خط جو پوسٹ نہ کئے گئے
۳۶۔ مصری کی ڈلی
۳۷۔ ماتمی جلسہ
۳۸۔ قبض
۳۹۔ ایکٹریس کی آنکھ
۴۰۔ نامکمل تحریر
۴۱۔ لالٹین
۴۲۔ پھولوں کی بارش
۴۳۔ گرم سوٹ
۴۴۔ میرا اہم سفر
۴۵۔ ترقی پسند
۴۶۔ نیا سال
۴۷۔ چوہیدان
۴۸۔ چوری
۴۹۔ قاسم
۵۰۔ پریشانی سبب

افسانے اور ڈرامے (۱۹۴۳ء)

۵۱۔ شیرو
۵۲۔ مس فریا
۵۳۔ آم
۵۴۔ مسز ڈی سلوا
۵۵۔ غسل خانہ

سیاہ حاشیے (۱۹۴۸ء)
(منی افسانے)

۵۶۔ ساعت شیریں
۵۷۔ مزدوری
۵۸۔ تعاون
۵۹۔ تقسیم
۶۰۔ جائز استعمال
۶۱۔ بے خبری کا فائدہ
۶۲۔ مناسب کاروائی
۶۳۔ کرامات
۶۴۔ اصلاح
۶۵۔ جیلی
۶۶۔ دعوت عمل
۶۷۔ پٹھانستان
۶۸۔ خبردار
۶۹۔ ہمیشہ کی چھٹی
۷۰۔ حلال اور جھٹکا
۷۱۔ گھاٹے کا سودا
۷۲۔ حیوانیت
۷۳۔ کسر نفسی
۷۴۔ کھاد
۷۵۔ استقلال
۷۶۔ نگرانی میں
۷۷۔ جوتا

چغد (۱۹۴۸ء)

خالی بوتلیں خالی ڈبے ۱۹۵۰ء

ٹھنڈا گوشت (۱۹۵۰ء)

بادشاہت کا خاتمہ (۱۹۵۱ء)

یزید (۱۹۵۱ء)

۱۹۱۔ عشقیہ کہانی

۱۹۲۔ منظور

۱۹۳۔ مس اڈنا جیکسن

بغیر اجازت (۱۹۵۵ء)

۱۹۴۔ سونے کی انگوٹھی

۱۹۵۔ ٹانگے والے کا بھائی

۱۹۶۔ مسٹر حمید

۱۹۷۔ بغیر اجازت

۱۹۸۔ قدرت کا اصول

۱۹۹۔ خوشبودار تیل

۲۰۰۔ سنتر پنچ

۲۰۱۔ جسم اور روح

۲۰۲۔ اب اور کہنے کی ضرورت نہیں

۲۰۳۔ تپش کاشمیری

۲۰۴۔ رشوت

۲۰۵۔ قیمے کی بجائے بوٹیاں

مُرقعے (۱۹۵۵ء)

۲۰۶۔ پسینہ

۲۰۷۔ گھوگا

۲۰۸۔ تیقن

۲۰۹۔ خط اور اس کا جواب

۲۱۰۔ موتادین

۲۱۱۔ ایک بھائی ایک وعظ

۲۱۲۔ چودھویں کا چاند

۲۱۳۔ باردہ شمالی

۲۱۴۔ قرض کی پیتے تھے

۲۱۵۔ برقع

رتی ماشہ تولہ (۱۹۵۶ء)

۲۱۶۔ جھمکے

۲۱۷۔ شلجم

۲۱۸۔ برف کا پانی

۲۱۹۔ چند مکالمے

۲۲۰۔ رتی، ماشہ اور تولہ

۲۲۱۔ نفسیات شناس

۲۲۲۔ انجام بخیر

۲۲۳۔ ملاقاتی

۲۲۴۔ سگریٹ اور فونٹین پین

۲۲۵۔ تین میں نہ تیرہ میں

شکاری عورتیں (انتقال کے بعد) (۱۹۵۶ء)

۲۵۶۔ شکاری عورتیں

۲۲۷۔ جنٹل مینوں کا برش

۲۲۸۔ حجامت

۲۲۹۔ مرزا غالب کی حشمت خان کے گھر دعوت

۲۳۰۔ لعنت ہے ایسی دوا پر

۲۳۱۔ صبح اکبر

۲۳۲۔ اولاد

۲۳۳۔ موچنا

• **نقوش لاہور کے منٹو نمبر میں شامل غیر مطبوعہ افسانے جو کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں**

۲۳۴۔ بائی بائی

۲۳۵۔ مائی جنتے

۲۳۶۔ جان محمد

۲۳۷۔ بارش

۲۳۸۔ افشائے راز

۲۳۹۔ آمنہ

۲۴۰۔ تصویر

۲۴۱۔ ملاوٹ

۲۴۲۔ بس اسٹینڈ

۲۴۳۔ نعیمہ

۲۴۴۔ بدتمیزی

۲۴۵۔ قادر اقصائی

۲۴۶۔ خودکشی

۲۴۷۔ پشاور سے لاہور تک

۲۴۸۔ ایک زاہدہ ایک فاحشہ

۲۴۹۔ شیدا

۲۵۰۔ بڈھا کھوسٹ

۲۵۱۔ انارکلی

۲۵۲۔ کمیشن

دوسرے افسانے جو کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔

۲۵۳۔ شاہ دولے کا چوہا

۲۵۴۔ کبوتر اور کبوتری

۲۵۵۔ کالی کلی

۲۵۶۔ سبز سینڈل

۲۵۷۔ عقل داڑھ

۲۵۸۔ سونورل

۲۵۹۔ پھاتو

۲۶۰۔ بیمار

۲۶۱۔ گنگت خان

۲۶۲۔ اصلی جن

۲۶۳۔ مسز گل

۲۶۴۔ سُرمہ

۲۶۵۔ مہتاب خان

ڈرامے اور فیچر

آؤ ۱۹۴۰ء

۱۔ آؤ کہانی لکھیں

۲۔ آؤ تاش کھیلیں

۳۔ آؤ خط سنو

۴۔ آؤ کھوج لگائیں

۵۔ آؤ ریڈیو سنیں

۶۔ آؤ بات تو سنو

۷۔ آؤ بحث کریں

۸۔ آؤ اخبار پڑھیں

۹۔ آؤ چوری کریں

۱۰۔ آؤ جھوٹ بولیں

تین عورتیں ۱۹۴۲ء

۱۱۔ تین خوبصورت عورتیں

۱۲۔ تین موٹی عورتیں

۱۳۔ تین صلح پسند عورتیں

۱۴۔ تین خاموش عورتیں

۱۵۔ تین بیمار پرس عورتیں

جنازے ۱۹۴۲ء

۱۶۔ چنگیز خان کی موت

۱۷۔ تیمور کی موت

۱۸۔ قلوپطرہ کی موت

۱۹۔ نپولین کی موت

۲۰۔ بابر کی موت

۲۱۔ شاہجہان کی موت

۲۲۔ سلطان ٹیپو شہید کی شہادت

۲۳۔ راسپوٹین کی موت

افسانے اور ڈرامے ۱۹۴۳ء

۲۴۔ قانون کی حفاظت

۲۵۔ ایک فرد

۲۶۔ تین انگلیاں

۲۷۔ دو ہزار سال بعد
۲۸۔ تین تحفے

• **شیطان** ۱۹۵۴ء

۲۹۔ شیطان

• **رتی ماشہ تولہ** ۱۹۵۶ء

۳۰۔ گاف گم

• **کروٹ** ۱۹۶۸ء

۳۱۔ کروٹ
۳۲۔ خودکشی
۳۳۔ رندھیر پہلوان
۳۴۔ ماچس کی ڈبیا
۳۵۔ محبت کی پیدائش
۳۶۔ چوڑیاں
۳۷۔ روح کا ناٹک
۳۸۔ اس کا رامو
۳۹۔ ماستا کی چوری

• **پھندنے** ۱۹۶۸ء

۴۰۔ اس منجدھار میں

• **منٹو کے ڈرامے**

۴۱۔ نیلی رگیں
۴۲۔ کبوتری
۴۳۔ انتظار
۴۴۔ انتظار کا دوسرا رخ
۴۵۔ کمرہ نمبر ۹
۴۶۔ ٹیڑھی لکیر
۴۷۔ جیب کترا
۴۸۔ عید کارڈ
۴۹۔ اکیلی
۵۰۔ جرنلسٹ
۵۱۔ ساڑھی
۵۲۔ نقش فریادی
۵۳۔ بیمار
۵۴۔ جرم اور سزا
۵۵۔ کیا میں اندر آسکتا ہوں
۵۶۔ تحفہ
۵۷۔ سلیمہ
۵۸۔ ہتک

مضامین

• **منٹو کے مضامین** ۱۹۴۲ء

۱۔ چھیڑ خوباں کی چلی جائے اسد
۲۔ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
۳۔ دیہاتی بولیاں
۴۔ دیہاتی بولیاں
۵۔ تجدید اسلحہ
۶۔ ہندی اور اردو
۷۔ اگر
۸۔ ہندوستان کو لیڈروں سے بچاؤ
۹۔ ایک اشک آلود اپیل
۱۰۔ مجھے شکایت ہے
۱۱۔ شریف عورتیں اور فلمی دنیا
۱۲۔ ہندوستانی صنعت فلمسازی پر ایک نظر
۱۳۔ زندگی۔ ایک ریویو

۶۷۔ سویرے جو کل آنکھ میری کھلی
۶۸۔ یوم اقبال پر
۶۹۔ مبوس عورتیں
۷۰۔ ایمان و ایقان
۷۱۔ پردے کی باتیں
۷۲۔ مفت نوشوں کی تیرہ قسمیں
۷۳۔ پٹاخے
۷۴۔ کارل مارکس
۷۵۔ جون آف آرک کا مقدمہ
۷۶۔ انصاف
۷۷۔ غالب اور سرکاری ملازمت
۷۸۔ آگرہ میں مرزا نوشہ کی زندگی
۷۹۔ مرزا نوشہ اور چودھویں

(یہ مضامین منٹو کے کسی مجموعے میں شامل نہیں)
۸۰۔ پشکن (ہمایوں مئی ۱۹۳۵ء روسی ادب نمبر)
۸۱۔ اشتراکی شاعری (شاعر آگرہ سالنامہ ۱۹۳۷)

خاکے

• **گنجے فرشتے**

۱۔ میرا صاحب
۲۔ آغا حشر سے دو ملاقاتیں
۳۔ اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں
۴۔ تین گولے
۵۔ باری صاحب
۶۔ عصمت چغتائی
۷۔ مرلی کی دھن
۸۔ پری چہرہ نسیم
۹۔ اشوک کمار
۱۰۔ نرگس
۱۱۔ کشتِ زعفران
۱۲۔ بابو راؤ پٹیل
۱۳۔ گنجے فرشتے

• **لاؤڈ سپیکر**

۱۴۔ دیوان سنگھ مفتون
۱۵۔ نورِ جہاں
۱۶۔ نواب کاشمیری
۱۷۔ ستارہ
۱۸۔ چراغ حسن حسرت
۱۹۔ پراسرار نینا
۲۰۔ رفیق غزنوی
۲۱۔ پارو دیوی
۲۲۔ انور کمال پاشا
۲۳۔ کے کے

ترجمے

نمبر شمار	عنوان	مصنف	سنہ اشاعت
۱۔	پھانسی (ایک اسیر کی سرگزشت)	وکٹر ہیوگو (فرانسیسی)	۱۹۳۴ء
۲۔	ویرا	آسکر وائلڈ (انگریزی)	۱۹۳۴ء
۳۔	روسی افسانے	روسی مصنفین	۱۹۳۴ء
۴۔	گورکی کے افسانے	مکیم گورکی (روسی)	۱۹۴۶ء
۵۔	دو ڈرامے	انطون چیخوف (روسی)	—
۶۔	سنگتراش کا روزنامچہ (افسانہ)	الگزینڈر کپرن (روسی)	۱۹۳۵ء
۷۔	قیدی (نظم)	لیر منطوف (روسی)	۱۹۳۵ء
۸۔	کُتا (افسانہ)	تورگنیف (روسی)	۱۹۳۵ء
۹۔	تمنا (نظم)	پشکن (روسی)	۱۹۳۵ء
۱۰۔	خنجر (نظم)	لیر منطوف (روسی)	۱۹۳۵ء
۱۱۔	تین سوال (افسانہ)	طالسطائے (روسی)	۱۹۳۵ء
۱۲۔	تسکین دہ خواب (افسانہ)	سلوگب (روسی)	۱۹۳۵ء
۱۳۔	تمنا (نظم)	اناطول کریملیف (روسی)	۱۹۳۵ء
۱۴۔	چکر (افسانہ)	سلوگب (روسی)	۱۹۳۵ء
۱۵۔	پیاری ہے مجھے (نظم)	ویلیری برسوف (روسی)	—
۱۶۔	نسبت (ڈرامہ)	چیخوف (روسی)	—
۱۷۔	بوسے سے انکار (نظم)	میکوف (روسی)	—



معروف کہانی کار اور ادیب

ڈاکٹر برج پریمی

کی

شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں پر ایک قابلِ قدر تصنیف

برج پریمی — ایک مطالعہ

لکھنے والے

عبدالقادر سروری — جگن ناتھ آزاد
محمد حسن — کشمیری لال ذاکر — عنوان چشتی
محمد یوسف ٹینگ — شکیل الرحمٰن
حامدی کاشمیری — سلیمان اطہر جاوید
منظر اعظمی — مظہر امام — عرش صہبائی
موتی لال ساقی — پشکر ناتھ — ظہور الدین

اور دوسرے نامور عالموں کے مقالے

مرتبہ:- پریمی رومانی

قیمت:- Rs. 150/- ایک سو پچاس روپے

تقسیم کار:-

سیمانت پرکاشن

922- کوچہ روہیلا خان، II فلور
دریا گنج، نئی دہلی



برج پریمی نے سعادت حسن منٹو "حیات اور کارنامے" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا ہے، جو ابھی تک منٹو پر شائع ہونیوالی سبھی مضامین اور کتابوں پر بھاری ہے۔ منٹو کے خاندان، اسلاف اور ان کی اپنی شخصیت کے بارے میں بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے برج پریمی نے بڑی دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں جو عام طور پر لوگوں کے علم میں نہیں ہیں یہ باب واقعی اتنا جاندار ہے کہ "عصری ادب" کے صفحات پر دوبارہ شائع ہونے کا مستحق ہے۔ برج پریمی نے بڑے سلیقے سے منٹو کے افسانوں ڈراموں، خاکوں اور خطوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور منٹو کے فکر و فن کو مناسب سیاق و سباق میں گہرائی اور جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ .... بایں ہمہ برج پریمی کی یہ کتاب ابھی تک منٹو پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے اور اردو کے افسانوی ادب کے ہر طالب علم کے لئے لائق مطالعہ ہے۔

پروفیسر محمد حسن